دل گداز تحریریں ○ زندگی کی تصویریں
ماہنامہ
کراچی
سچی کہانیاں
FEBRUARY
2018
پُراسرار نمبر
☆.....کمزور دل افراد اپنے رسک پہ کہانیاں پڑھیں
☆.....انتہائی دہشت ناک کہانیوں سے مزین شمارہ
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

07 اے کاش کہ... — منزہ سہام
08 احوال — مدیرہ
23 زبیدہ طارق — منزہ سہام
27 دختر کاہن — م۔ن۔خ
61 موت کی چنگھاڑ — محمد سلیم اختر
72 پُراسرار فقیر — اُم منابل
77 شش! کوئی ہے — فرح انیس
87 قبر کے مکین — رضوانہ آفتاب
97 پھوپو کی روح — نازیہ بتول
105 میں انتقام لوں گی — مریم شاہ
113 دوسری دنیا — عبدالغفار عابد
120 مردے کی فریاد — الماس فاطمہ
124 خون آشام انتقام — تبسم زہرہ رضوی
136 بلی کے سیاہ بچے — صدف حبیب

فون: 35893122-35893121-021 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی سٹی پریس OB-7 تالپور

149 ذو بدروحیں — منور شاہد حسین
153 نعیم بابا — ذیشان حسین عشاقی
163 بیٹھے بیٹھے حاضری ہوگئی — نفیسہ فضل محمود
167 عورت پن کی بلی — عمران مظہر
172 آج کا شاعر — شگفتہ شفیق
175 دہشت ناک رات — منصورہ احمد بلوچ
178 خوفناک منظر — مدیحہ گل
183 آپ زندہ ہیں — عمران مظہر
185 اسما کہاں گئی — زین شمسی
190 ریشم کے دھاگے — ڈاکٹر سعید عبدالرزاق
205 آپ کی ڈائری — قارئین
215 مسئلہ یہ ہے — ادارہ
225 خزانہ — نجیب عمر
239 ترکی میں عباسی — نمرہ علی عباس مرزا
255 سردخانہ — محمد شاہد

بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھوا ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

دُنیا میں کس جگہ
سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے' دیکھتے' محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں' جگ بیتیاں' اعترافات' جرم و سزا کی کہانیاں' ناقابلِ یقین کہانیاں' دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com

اے کاش کہ میری راہوں میں...

آنکھوں میں گہری گھمبیر اُداسی چھپانے والے' ہر وقت زیرِ لب مسکرانے والے ناصر رضا بھی چلتے بنے۔

موت اٹل حقیقت ہے اس بات کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ کا اپنا کوئی بچھڑ جاتا ہے۔ کتنا عجیب احساس ہے روز ساتھ کام کرنے والا اچانک چلا جائے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ناصر رضا صاحب صبح 10:30 بجے سے شام 6 بجے تک آفس میں ساتھ ہوتے تھے دن میں کئی بار اٹھ کر اُن کے کمرے میں جاتی اور وہ کئی بار میرے پاس آتے۔ شمارے کے بارے میں بات چیت' پرانے لوگوں کا تذکرہ گھر بچے ہم سب ڈسکس کرتے' آج کتنے دن گزر گئے اُن کو گئے مگر میں اکثر بھول جاتی ہوں اور ذہن میں آتا ہے چلو ناصر بھائی سے بات کرتی ہوں۔ پھر اچانک تلخ اور نہایت کڑوی حقیقت سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے کہ وہ اب نہیں' میں نے بچپن سے ناصر بھائی کو آفس میں دیکھا جب میں اُن کی ٹیبل پر بیٹھ جاتی تھی اور وہ مجھے ٹافیاں دیتے تھے۔

میرے والد کے پسندیدہ ترین ایڈیٹر جن سے وہ ہر بات کر لیا کرتے تھے اور یہی بھروسہ ناصر بھائی نے مجھے بھی دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کی بیماری کے دنوں میں بھی مجھے یقین تھا کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے وہ چلے جائیں گے ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا اور اسی لیے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ اُن کی آخری کالز' آخری میسج سب میرے پاس محفوظ ہیں' میں جانتی ہوں زندگی رُکتی نہیں یہ بھی اللہ کا بہت بڑا کرم ہے مگر جو خلا جانے والے چھوڑ جاتے ہیں وہ کبھی پُر نہیں ہوتا' ناصر بھائی کی بھی کمی میں اور میرا ادارہ ہمیشہ محسوس کریں گے۔

اے کاش کہ میری راہوں میں بیتے وہ زمانے آ جائیں
میں سامنے اُن کے بیٹھا ہوں میرے سے دست پرانے آ جائیں

منزہ سہام

Pakistanipoint
Waqar Azeem

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

حسبِ وعدہ پُراسرار نمبر کے ساتھ حاضر ہوں زندگی سے بڑھ کر تو کچھ بھی پُراسرار نہیں کہ جو لوگ ابھی ساتھ ہوتے ہیں وہ قصہ پارینہ بن جاتے ہیں اور ہم بس بے بسی سے دیکھتے رہ جاتے ہیں ہ جنوری ت میں یہ نہیں جانتی تھی کہ سچی کہانیاں میری ذمہ داری بننے جارہا ہے۔ لہٰذا اس بار احوال کے تمام خطوط بغیر Edit کیے جانے دیے ہیں کیونکہ یہ آپ لوگوں کی آخری نصف ملاقات ہے مرحوم ناصر رضا صاحب سے شکوے شکر بے سب اُن کی امانت تھے لہٰذا شائع کردیے گئے جواب بھی اُن کو ہی دینے تھے مگر ایسا آپ ممکن نہیں لہٰذا میں جواب نہیں دے رہی۔ اگلے ماہ سے احوال کی کرسی میں بٹھالوں گی تب سوال جواب بھی ہوں گے اور شکوے شکایت بھی فی الحال آپ کے تعاون کی طلب گار ہوں۔ آج سے 17 سال پہلے ابو کے جانے کے بعد میں بالکل اسی طرح تنہا رہ گئی تھی جیسے آج سچی کہانیاں اپنے ایڈیٹر کے اچانک چلے جانے سے مگر سچی کہانیاں خوش قسمت ہے کہ اس کو سنبھالنے والے ہاتھ سلامت ہیں میں اور آپ مل کر اپنے رسالے کو بہت اچھی طرح سنبھالیں گے مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ میرا مان رکھیں گے۔ جانے والے کی کمی تو کبھی پوری نہ ہوگی مگر ہم سچی کہانیاں کو کامیاب کرنے کا اُن کا مشن جاری رکھیں گے۔

بڑھتے ہیں پہلے خط کی جانب محمد فیضان حسین عثمانی حیدرآباد سے لکھتے ہیں نہایت ہی قابل احترام محترم ناصر رضا بھائی ... السلام علیکم! سلام کے بعد خداوند قدوس سے آپ کی خیریت نیک چاہتا ہوں۔ آج دسمبر کی 15 تاریخ ہے جمعہ کا دن ہے اور میں آپ کو احوال کے لیے خط لکھ رہا ہوں تبصرہ بمعہ خط دیر سے بھیجنے کی وجہ پرچے کا لیٹ ہونا تھا میں نے بک اسٹال پر پرچہ دیکھ لیا تھا مگر آپ کے بھیجے ہوئے پرچے کا انتظار تھا جو شاید محکمہ ڈاک کی نااہلی کی وجہ سے انتظار ہی رہا اور مجھے حسب معمول پرچہ اپنے ہاکر سے لے کر پڑھنا پڑا کل آپ کا فون آیا خیریت کے حوالے سے اور احوال میں خط نہ بھیجنے کی یاد کرانے پر اور مجھے اپنی نیکیوں اور دعاؤں میں یاد رکھنے پر میں آپ کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں اللہ پاک آپ کو صحت و تندرستی عطا کرے آمین۔ اور آپ کا سایہ ہم سب پر تادیر قائم و دائم رکھے اور آپ اسی طرح شب و روز اپنی محبت اور صلاحیت سے سچی کہانیاں کو ترقی کی منازل پر لے جاتے رہیں آمین ثم آمین۔ سب سے

التماس

ناصر رضا صاحب کے اچانک دنیا سے چلے جانے سے ادارے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ایسے میں سچی کہانیاں میں جانے والی کمی بیشیوں کو نظر انداز کیجیے گا انشاء اللہ اگلے ماہ سے کوشش ہوتی کہ شمارہ اپنے پہلے سے اناؤنس نمبرز کے مطابق شائع ہو۔ **(مدیر اعلیٰ)**

پہلے احوال کے خطوط کے حوالے سے میں یہ عرض کردوں کہ سچی کہانیاں ہم سب لکھاریوں اور قارئین کا دوسرا گھر ہے اور احوال کی بزم اُس گھر کا آنگن ہے۔ جہاں ہم سب گھر کے افراد جن کا تعلق کسی بھی قومیت یا مکتبہ فکر سے ہو مگر ہم سب گھر کے افراد کی طرح اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اس پر رونق محفل کو اپنی بھانت بھانت کی بولیوں سے چار چاند لگاتے ہیں کوئی کسی کے خط پر تنقید کرتا ہے تو کوئی دوسرا اُسی خط کو بہترین قرار دیتا ہے کسی کی کہانی عتاب کا شکار ہوتی ہے تو کبھی کسی کی کہانی کے چرچے ہر کسی کی زبان پر ہوتے ہیں اور اسی طرح ہنستے بولتے روٹھتے مناتے یہ محفل برخاست ہوجاتی ہے۔ اس دعا اور امید اور اپنے پن کے ساتھ کہ اگلی ملاقات میں پھر بات ہوگی۔ اس گھر کے آنگن میں ہر ماہ جس خوبصورتی اور محنت کے ساتھ اس محفل کا انعقاد محترم ناصر رضا بھائی کرتے ہیں۔ وہ قابل ستائش ہی نہیں بلکہ لائق تحسین بھی ہے اس آنگن میں عرصہ 27 یا 28 سال سے میں ان محفلوں کو ہوتے دیکھ رہا ہوں کبھی وہ مرحوم انکل شمیم نوید کی کوششوں سے سجی ہو یا کبھی اُس کو سجانے کا سہرا مرحوم سلیم فاروقی بھائی کے سر جاتا ہو یا کبھی اُس کو سجانے اور سنوارنے میں انکل دانش دیروی مرحوم کا ہاتھ رہا ہو یا کبھی ہم سب کو ایک لڑی میں دانوں کی طرح پرونے میں محترم پرویز بھائی نے اپنی کوششیں کی ہوں یا کاشی چوہان نے اس کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری اٹھائی اور نبھائی ہو یا پھر دوبارہ سے ناصر بھائی ہم سب کو ہمارے دوسرے گھر سچی کہانیاں کے آنگن میں محبت اور شفقت کے ساتھ لے کر یہ بزم جو کہ بزم احوال ہے اُس کو سجاتے ہیں اللہ پاک سے دعا ہے کہ اس بزم کو سجانے والے جو اب ہم میں نہیں ہیں اس دنیا سے جاچکے ہیں اُن کی مغفرت فرمائے آمین۔ اور جو لوگ اس گھر سے جاچکے ہیں کہیں اور اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں اللہ پاک اُن کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ اور ہمارے اس دوسرے گھر سچی کہانیاں کو شروع کرنے اور ہم سب کو اس میں شامل ہو کر اپنے اپنے خیالات و نظریات اور احساسات کا اظہار کرنے کے مواقع دینے والے اس گھر کے بانی اور سرپرست اعلیٰ قابل قدر مرحوم انکل سہام مرزا کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور اُن کے درجات کو بلند فرمائے آمین۔ اُن کے بعد جس محنت اور جانفشانی اور انتھک جدوجہد سے اس گھر کو مضبوطی سے کھڑا رکھا ہے اور آگے ترقی کی منازل طے کروا رہی ہیں آپی منزہ سہام اُن کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا گو ہیں کہ اللہ پاک اُن

کو صحت و تندرستی ہمت و طاعت عزم و حوصلہ عطا فرمائے کہ وہ اسی طرح اس ہمارے دوسرے گھر بھی کہانیاں کو خوبصورت سے خوبصورت بناتی رہیں سجاتی رہیں سنوارتی رہیں آمین۔ کسی کو بھی کسی سے سرٹیفکیٹ لینے یا سند لینے کی ضرورت نہیں ہے یہاں پر کہ وہ کتنا سینئر ہے یا دوسرا کتنا جونیئر ہے اس کا فیصلہ تو اس گھر کو چلانے والے اور اس آنگن میں پھولوں کی طرح ہم سب کو سجانے والے بہتر کر سکتے ہیں۔ ہر انسان کا اپنا اپنا نظریہ اور خیال ہوتا ہے لازم ہیں جو آپ کو اچھا لگے وہ کسی دوسرے کو بھی اچھا ہی لگے یا جو میرا بہترین دوست ہو وہ آپ کا بھی مخلص اور سچا ساتھی ہو بد دنیا ہے اور یہاں ہر کوئی دوسرے کو تو مولوی اور عالم کی بآمل بننے اور اچھا ہونے کی نصیحت اور تلقین کرتا ہے مگر خود اپنے عمل اور کردار سے لوگوں کے لیے باعث تکلیف ہوتا ہے۔ میرا مقصد کسی کبھی بھی کسی کی ذات پر تنقید کرنا نہیں ہوتا بلکہ اُس کے کام اُس کی سوچ اور اس کی پالیسیوں پر ہوتا ہے بس اللہ پاک سے ہم تو یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ پاک ہر کسی کو حق اور سچ بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی حق اور سچ پر چلنے والا بنائے آمین۔ اللہ پاک اُن لوگوں کو ہدایت نصیب فرمائے جو اپنی چھوٹی شان اور ناجائز حکمرانی کے تاج سر پر سجانے کی کوششوں میں اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ ہمارے پیارے آقا ﷺ کی ناموس پر حملہ کرنے سے بھی باز نہیں رہتے اور اللہ پاک کی طرف سے ذلیل و خوار اور رسوا ہونے کے بعد بھی اپنی اس ناپاک جسارت سے باز نہیں آتے مگر شاید وہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ پاک نے اپنے حبیب ﷺ عزت و ناموس کی حفاظت ذمہ خود لیا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ جس جس نے بھی ایسی حماقت کی ہے اللہ پاک نے اُس کو ذلیل و رسوا اور خوار کیا ہے دنیا میں اور آخرت میں اُن کا انجام جو ہوگا وہ اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کو معلوم ہے ہم تو اپنے پروردگار سے ہر وقت یہ ہی دعا کرتے ہیں کہ اللہ پاک ہمیں اپنے حبیب ﷺ کی محبت سے سرشار رکھ اور ایسی محبت اور ایمان پر ہمارا خاتمہ ہو آمین۔ محترم بھائی غلط کو غلط کہنا میری عادت میں شامل ہے معاف کر دینے والے کو اللہ پاک پسند فرماتا ہے اور اللہ کے حبیب ﷺ خوش ہوتے ہیں اسی لیے اپنے ساتھ ہونے والے نارواسلوک یا غلط باتوں کو پس پشت ڈال کر ہم سامنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں معاف کر دینے کی عادت اور کسی کے ساتھ اچھا کرنے اور کر کے بھول جانے کی عادت ہمیں ہمارے والدین سے ورثے میں ملی ہے اور پھر معاف کر دینا ہمارے آقا ﷺ کی سنت مبارکہ بھی ہے مگر کوئی ایسی غلطی یا بات جس سے آپ کے گھر کو نقصان پہنچے یا آپ کے گھر پر یا اُس کی عزت پر آنچ آنے کا خدشہ ہو تو برملا اُس غلطی کو اجاگر کرنا چاہیے تاکہ آپ کا گھر نقصان سے بچ سکے اور میں نے اوپر پہلے ہی بتا دیا ہے کہ یہ ادارہ سچی کہانیاں ہمارا دوسرا گھر ہے اور ہم سب اس مکان کے مکین ہیں لہٰذا اس گھر کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے اور اس گھر پر کسی غلط بات یا کسی کی غلطی کی وجہ سے کوئی انگلی اٹھائے اس کو روکنا ہمارا حق ہے اور دوسروں کو آگے نصیحت ہو اس لیے

دعائے صحت

ہماری دیرینہ لکھاری روشانے سبحین مہاروی اور شازلی مغل ان دنوں علیل ہیں قارئین سے التماس ہے کہ اُن کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ **(ادارہ)**

اِس کو بیان کرنا بتانا ضروری بھی ہوجاتا ہے۔ وقتی طور پر ہم لکھنے سے دور ضرور ہو گئے تھے مگر اِس کو پڑھنے سے اس کے مطالعے سے کبھی دور نہیں ہوئے ہاں وہ الگ بات ہے کہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اور دوسروں کے تبصرے سنتے ہوئے بھی نظر انداز کرتے رہے نشاندہی اس لیے نہیں کرانے کی کبھی کوشش کی کہ جو لوگ اُس وقت اس گھر کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ یا کرتا دھرتا ہوئے تھے اُن سے کہنا بے کار تھا۔ کیونکہ جن لوگوں کو یہ ہی نہیں پتا ہو کہ اصل اور نقل کا فرق کیا ہوتا ہے یا ہم جو آنکھیں بند کر کے گھر کو چلانے اور ذمہ داری اٹھانے کی کر رہے ہیں اس سے ہمارا گھر ہمارا ادارہ بجائے ترقی کے تنزلی کی طرف جا رہا ہے لوگوں کو معیاری چیز ملے گی تو وہ مطمئن ہوں گے اگر اُن کو باسی اور پرانی چیز فراہم کی جائے گی تو وہ اُن لوگوں کو تو اچھی لگے گی جو اُن چیزوں کو نیا نیا دیکھ رہے ہوں گے مگر جو لوگ چیزوں کو پہچانتے اور جانتے ہیں اُن کے لیے قابل قبول نہیں ہوں گی مگر وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں اس لیے نہیں تھے اُس وقت کیوں کہ ذمہ دار لوگ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے اس لیے آپس میں ڈسکس کر کے خاموش ہو جاتے تھے اُن کرتا دھرتاؤں نے ایسے ایسے نوآموز لکھاریوں کو شمارے کے اُن ابتدائی صفحات میں جگہ دی جن کو کہانی اور افسانے کا فرق ہی معلوم نہیں تھا اور اُن صفحات پر کبھی بہن رابیل محفوظ عطاری، ماریہ عرفان اور قرۃ العین زینب جیسی کینہ مشق لکھاریوں کی کہانیاں زینت بنتی تھیں۔ بس اُن کو تو بغیر سوچے سمجھے القابات دینے اور خطابات سے نوازنے کا ہنر آتا تھا کسی کو بادشاہ بنا دیا تو کوئی ملکہ بن گئی کوئی وزیر تو کوئی شہزادی مگر وہ اپنی نگاہوں سے یہ نہ دیکھ سکے شمارے میں جو تحریریں لگ رہی ہیں اور چھپ رہی ہیں اُن کا معیار کیا ہے اور وہ پہلے بھی اسی پرچے کے پچھلے شماروں میں لگ چکی ہیں بس اُن کو تو لگانے سے مطلب تھا ہم سے بارہا اس مسئلے کو اپنے دوست اشہر جواد سے ڈسکس کیا مگر ہم کچھ اُس وقت کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھے مگر اب جب ناصر بھائی جیسے ذمہ دار اور معاملات کو سمجھنے اور مسئلے کو سلجھانے والے شخص نے یہ ذمہ داری اٹھائی ہے کہ اس پرچے کا معیار بہتر سے بہتر بنائیں گے اور اُس کو تنزلی سے ترقی کے سفر پر دوبارہ گامزن کریں گے تو ہم نے اپنی نظروں سے گزری ہوئی نقل شدہ تحریر کو ہائی لائٹ کیا ہے اور آگے بھی کرتے رہیں گے تاکہ لوگوں کو نصیحت ہو اور وہ آئندہ احتیاط کریں اور ہمارے گھر سچی کہانیاں پر پڑوس والوں کو تنقید کرنے کا موقع نہ ملے کہ تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مئی 2016ء میں رائٹر کرن شبیر کی کہانی 'منظر پس منظر' کو اگست 2017ء میں راحت دفا راجپوت

نے مجرم کون کے نام سے لفظ بہ لفظ نقل کر کے بھیجا ہے میں نے اس کی نشاندہی آپ کو پہلے ہی کر دی تھی اور اپنے شمارے تلاش کرنے میں ٹائم لگ گیا اس لیے اب آپ کو اس خط کے ساتھ اُن دونوں تحریروں کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ارسال کر رہا ہوں اِس سے پہلے آپ کو میسج بھی کر چکا تھا دونوں کہانیوں کے نام اور رائٹرز کے نام امید ہے میرے اس اقدام سے کسی کو تکلیف نہیں ہوگی ہاں اگر میرے ایسا کرنے سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ مگر سچی کہانیاں ہم سب کے لیے ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک گھر ہے اور ہم سب کو اس گھر کی فلاح و بہبود کے لیے ہی کام کرنا ہے آپ کو سنوارنا ہے اس کے ساتھ ہونے والے غلط اقدام کی بروقت نشاندہی کرتی ہے اس گھر سے محبت کا یہ ثبوت ہے کہ لکھنے سے دور ہو گئے تھے مختصر عرصے کے لیے اور میں ہی نہیں بہت سے پرانے لکھاری دور تھے مگر ہم پڑھنے سے دور نہیں تھے اور ناں دوسروں کے کہنے کے باوجود کسی دوسرے کے گھر میں گئے۔ ناصر بھائی جیسی شخصیت نے جب دوبارہ ذمہ داری اٹھائی تو ہم سب کو آواز دی کہ آؤ اور آ کر اس اپنے گھر کی تعمیر اور ترقی میں میرا ساتھ دو میرا ہاتھ بٹاؤ تو ہم اُن کی آواز پر حاضر ہو گئے میں نے اپنے خط میں بہت کچھ لکھا ہے مگر صاف صاف نہیں مگر سمجھدار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ تبصرہ اس لیے نہیں کر سکتا ہوں ابھی تک آپی کا اداریہ بھائی کا احوال بہن رئیسہ خالہ کھڑکی میں رکھی آنکھ اور انکل سلیم اختر کی بجنت گزیدہ ہی پڑھ سکا ہوں یہ سب بہت اچھی اور دل کو چھو لینے والی تحریریں ہیں۔ میرے اس طویل خط کو میرے الفاظ کو سمجھتے ہوئے نہ جانے ایڈیٹر صاحب من و عن جگہ دے سکیں گے یا پھر اس پر مصلحت پسندی کی قینچی چلا کر اُس کو کاٹ دیں گے۔ یہ اُن کی مرضی پر منحصر ہے۔

☆

نعمان احمد آرائیں' جامشورو سے لکھتے ہیں' السلام کے بعد آتے ہیں احوال کی طرف۔ ارشد اقبال چوہان پہلے سچی کہانیاں میں کہانی' شعر' احوال میں کوئی تحریر بھیجنے کے لیے ٹوکن ضروری تھا تو وہ آپ کو معلوم ہوگا کیونکہ یہ رائے آپ کی ہے میری نہیں اور پہلے بھی آپ نے ہی کہا تھا کہ ٹوکن غائب ہو گیا اور اب بھی آپ نے اس بات کو نیا انداز دے دیا ہے اور اگر یہ بات ہے تو آپ اس بات کو ظاہر کرو مگر یہاں وہاں کی باتیں کرنا چھوڑ دیں اسماء غفور اور عبدالغفار عابد مجھے آپ چاچا' بھتیجی لگ رہے ہیں۔ پہلے میں اسماء غفور کی بات کا جواب دیتا مگر اس کی وضاحت میں جواب دوں گا اس لیے عبدالغفار عابد آپ نے کہا بھائی نعمان احمد یہ حقیقت ہے یہ کون سی مجھے مخاطب کر کے پھر آپ نے اتنا لمبا تبصرہ کر گئے یہ آپ مجھے کیا کہنا چاہتے ہیں مجھے سمجھ نہیں آئی اگر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کھل کر کہیں' حسین خواجہ وہ میری مرضی ہے کہ میں شمارے' کہانی' ناول احوال میں سے کس چیز پر تبصرہ کروں یا نہ کروں آپ اپنی بات مجھ پر نہیں تھوپ سکتے اچھا ہوگا کہ آپ سمجھ جائیں میں نے کبھی کہا کہ آپ کا قصور ہے اگر آپ کو

کوئی کمی محسوس ہوتی تو آپ ظاہر کر دو اس کمی کو میں بس اتنا کہنا چاہوں گا اور آخر میں اب آتے ہیں اسماء غفور صاحبہ کے تبصرے کی طرف آپ اسکول میں جاب کرتی ہیں۔ کیا اور یہ بات اچھی ہے کہ میرے سوال کے جواب میں آپ نے یہ سطریں لکھ دیں میں یہ نہیں کہتا کہ آپ حق پر نہیں جی بندہ خود چاروں طرف سے راستے بند کر لے تو تاریک گلیوں میں راستہ تلاش کرنا مجبوری بن جاتا ہے تو حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ یقین آنے یا نہ آنے کی بات نہیں' مسکراہٹ' میں جو کہانی پڑھی اس کا بھی حل موجود ہے کہ بندہ ایسے شخص سے ناطہ توڑ لیتا اچھا ہوتا ہے کہ جو آپ کی بات نہ سمجھے اور نہ آپ کو کچھ کہنے کا موقع نہ دے تو ایسی جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر نہیں رکھنی چاہیے میں اس چیز کا قائل نہیں مجھے کسی کی کوئی بات غلط لگے تو میں تو منہ پر کہہ دیتا ہوں چاہے وہ اس کو اچھا یا برا سمجھے تو میں اس امر کی پروا نہیں کرتا اور نہ ہی جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر رکھتا ہوں جس طرح میں اپنی مرضی کی زندگی گزار رہا ہوں اور میری بہن کو بھی وہی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ یہ اس لفظ 'حق' میں پوری ایک کہانی ہے۔ اس حق کے چکر میں کافی مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے اس حق کی وجہ سے مجھے تین دن لاک اپ میں اور چھ دن جیل میں اور میرے سب سے چھوٹے بھائی کے پڑھائی کے تین سال خراب ہو گئے اور حق تو پورا ہو گیا یہ کوئی میرے 9 دن جو میں نے بے گناہ جیل میں گزارے اور میرے بھائی کے تین سال کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ میرے ساتھ ہونے والے تین واقعات میں سے ایک میرے اور میری فیملی کے ساتھ ہوا ہے۔ اور چوتھا واقعہ میرے ماموں کا ہے پانچواں میرے کزن کا ہے چھٹا میرے ایک دوست کا ہے۔ جسے اُس کی اپنی بہنوں نے مل کر دھوکہ دیا ہے۔ ان واقعات کو میں ایک ایک کر کے 6 احوالوں میں بیان کروں گا اور ان واقعات کو یہ نام دیا ہے۔ 1 عزت' 2 فرض' 3 حق' 4 رشتہ ازدواج' 5 امید' 6 یقین' ان میں سے حق دوسرے ماہ کے احوال میں بیان کروں گا اگر ناصر رضا آپ اجازت دیں۔ مجھے ان واقعات کے لیے ایک صفحہ فرنٹ بیک اور دوسرا صرف فرنٹ اور کسی واقعے کے لیے آدھا کسی میں ایک صفحہ استعمال ہوگا جو آپ کے چھ شماروں میں لگے گا۔

☆

ایم عاصم مجاہد' جہانیاں سے لکھتے ہیں۔ محترم ناصر رضا کیسے ہو امید ہے آپ پر اللہ کی رحمت ہوگی محترم میں بندہ ناچیز ایک گزارش ایک عرض اور ایک کاوش' شریک حیات کے ساتھ جناب کی نگری میں حاضر خدمت ہوں امید وسعت ہے خوش دلی سے ویلکم کریں گے۔ جناب عالی میری تحریر مختصر سی ہوتی ہے۔ میرا مقصد چند الفاظوں میں اگلے بندے کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بات بتانا ہوتا ہے۔ میرے محترم ناصر صاحب میرا نام ایم عاصم مجاہد ہے۔ 2006ء میں ادب کی دنیا سے منسلک ہوا شروع میں بوٹا دیکھی' بہاولپور کے نام سے لکھتا رہا پھر چند دوستوں کی فرمائش پر ایک ادبی تقریب میں ایم عاصم بوٹا کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ پھر اللہ

تعالیٰ کی رحمت ہوئی اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ عطا کی پھر پاکستان کی ایک فلاحی جماعت FIF یعنی فلاح انسانیت فاؤنڈیشن کے ساتھ اللہ کے راستے میں نکلا تو ایم عاصم مجاہد کے نام سے لکھنا شروع کردیا۔ جناب عالی میں ایک روزنامہ قومی اخبار کا نمائندہ بھی ہوں ایک دین اسلام کا مجاہد بھی ہوں اور ایک ادنیٰ سا رائٹر بھی ہوں اس بار آپ کی محفل میں حاضر خدمت ہیں دیکھتے ہیں آپ ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو۔ باقی سچی کہانیاں کے مکمل اسٹاف رائٹر و قارئین کو میرا خلوص بھرا سلام۔

☆..

ناز یہ بتول' کراچی سے لکھتی ہیں۔ محترم ناصر رضا السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے نیا سال بہت بہت مبارک ہو دعا ہے کہ پروردگار ہم سب کو نئے سال میں آفت و بلیات سے محفوظ رکھے اور ہمارے ملک کو ترقی کی راہوں پر گامزن فرمائے آمین۔ امید ہے کہ حسب وعدہ آپ نے ماہ جنوری کے طویل نمبر میں میری کہانی شامل کی ہوگی کیونکہ مجھے اب تک اعزازی کاپی نہیں مل سکی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری پرانی بھیجی ہوئی کہانیوں پر بھی نظر کرم کردیں یقیناً وہ آپ کی نظروں سے نہیں گزری ہوں گی میری ایک پُراسرار کہانی آپ کے پاس موجود ہے اس کے علاوہ بھی ایک پُراسرار کہانی بھیج رہی ہوں امید ہے کہ پسند آئے گی۔ دسمبر کا طویل نمبر کامیاب رہا اس کے لیے مبارکباد' کہانیوں میں بخت گزیدہ' اچھی لگی اور مقدر یوں راکھ ہوا پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے حنا بشریٰ نے کہانی کا حق ادا کردیا۔ باقی سلسلے وار کہانی ابھی نہیں پڑھ سکی پڑھ کر رائے دوں گی۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆..

روشانے سبعین' لاہور سے لکھتی ہیں۔ اچھے ناصر بھائی' صحت و سلامتی کی دعائیں' امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے آپ کی صحت کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتی ہوں' ایک کہانی بعنوان بے جی ارسال کررہی ہوں امید ہے قبولیت کی سند فرما کر آپ قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔ ان دنوں اپنی نظموں کی کتاب بھی ترتیب دے رہی ہوں۔ ایک تازہ نظم (حوا زادی) سچی کہانیاں کے قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر...... تمام اسٹاف اور قارئین کرام کو محبت بھرا سلام اور دعائیں۔

☆..

مدیحہ گل لکھتی ہیں جناب ایڈیٹر صاحب' میں نے آپ کے پُراسرار نمبر کے لیے اس کہانی کا انتخاب کیا ہے جو کہ کافی حد تک سچی ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ املا کی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ اس کو اپنے ڈائجسٹ کا حصہ بنا کر میری دیرینہ خواہش خواب کو حقیقت کا روپ ضرور دے گے۔

☆..

منشی عزیز مئے' دہاڑی سے لکھتے ہیں۔ محترم جناب مدیر صاحب' السلام علیکم! کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں مگر پہلے آپ یہ بتائیں کہ میں نے کون سی آپ کی 'مجھ' چرائی ہے جو آپ میرے فون' میسج کسی بھی بات کا جواب نہیں دیتے۔ سچی بات بتاؤں کہ مجھے آپ کی اس بے اعتنائی اور بے رخی کی وجہ سے شدید رنج تھا مگر آپ کے چند 'پرانے' دوستوں نے آپ کی پرزور سفارش کی اور یوں میں نے آپ کی 'گستاخیوں' کو فراخدلی سے معاف کردیا۔ سمجھ گئے ناں آپ؟ چلیے اگر نہیں بھی سمجھے تو بقول غالب ہے کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی' یہاں میں عزیز جیا' عبدالغفار عابد اور مور شاہد حسین کا خصوصی طور پر ذکر کروں گا۔ جن کے بصد اصرار نے مجھے سب کچھ بھلا کر سچی کہانیاں کا سالانہ تجزیہ مرتب کرنے کے لیے مہمیز کیا تو بلا تاخیر ملاحظہ کیجیے۔ سچی کہانیاں کا سال 2017 کا سالانہ تجزیہ' 2017 کو اگر نمبرز کا سال کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جنوری سالگرہ نمبر' فروری عشق نمبر' مارچ پُراسرار کہانیاں نمبر' اپریل ایوارڈ نمبر' مئی مختصر کہانی نمبر' جون پلیٹ فارم نمبر' اکتوبر پُراسرار نمبر 2' اور دسمبر طویل کہانی نمبر سال کے بارہ شمارے کل تین ہزار دو سو باون صفحات پر مبنی تھے جن میں سے کم و بیش دو سو ستاسی صفحات اشتہارات پر مشتمل تھے گویا تقریباً نو فیصد صفحات اشتہارات کے نام تھے۔ احوال کے لیے بارہ شماروں میں کل ایک سو پینتالیس صفحات مخصوص ہوئے جن پر کل دو سو انسٹھ خطوط شائع ہوئے جن کو لکھنے والے حضرات کی کل تعداد ایک سو اکیاون تھی جبکہ خواتین تبصرہ نگاروں کی تعداد ایک سو آٹھ تھی۔ بارہ عدد شماروں میں قسط وار کے علاوہ کل دو سو اسی کہانیاں شائع ہوئیں جن کو لکھنے والے حضرات کی تعداد ایک سو انیس جبکہ خواتین لکھاریوں کی تعداد 161 تھی۔ قسط وار کہانیاں یا ناول لکھنے والوں کے نام پر ہیں۔ کاوش صدیقی' رانا حبیب الرحمٰن' کاشی چوہان' ایم اے راحت' حمیرا خان' شازلی سعید مغل' روشانے سبعین مہاروی' سفر نامہ یا سفر کہانی لکھنے والوں میں قمر علی عباسی کے سفر نامے کے علاوہ شیراز خان' ابوبکر شیخ' اختر حفیظ اور زین شمسی کے نام شامل ہیں۔ اسماء اعوان جنوری سے مئی تک مسلسل پانچ ماہ لائف بوائے کے عنوان سے ہر ماہ حاضر رہیں۔ زندگی نامہ لکھنے والوں میں احمد سجاد بابر نے جنید جمشید' ناہید اختر' بانو قدسیہ اور بابرہ شریف کے حالات زندگی پر بھرپور مضامین لکھے دیگر میں ذیشان فراز نے سرمد سلطان کھوسٹ پر لکھا' شفاعت علی نے آرڈی ہیپ برن سے متعارف کروایا شبانہ اعظمی اور وحید مراد پہ عمر خطاب خان نے لکھا جبکہ کرسٹوفر لی پر راجہ کا مضمون لگا دسمبر میں محمد ایوب فضل الٰہی سے متعارف کروایا جناب شمیم احمد صاحب نے' شعر کہانی میں ڈاکٹر ایس ایم معین نے ڈاکٹر نزہت عباسی کی شاعری پر تبصرہ کیا۔ دیگر شعر کہانی میں علی حیدر ملک اور شبیر ناقد کا نام شامل ہے۔ منورہ نوری خلیق کی تاریخی کہانیاں اور ترجمہ کہانیاں' زین شمسی کی دیس کہانیاں' طنز کہانی اور ترجمہ کہانیاں ان کے علاوہ تھیں۔ اور محمد سلیم اختر کی حیرت انگیز

روح کہانی اپنی جگہ ایک بھرپور مضمون تھی۔ سلیم اختر کی تحریر آواز کی دنیا الگ سے تھی۔ تیرنیم کش کے تحت کل ایک ایک سو اٹھانوے اشعار شائع ہوئے' جنہیں بھیجنے والے حضرات کی تعداد ایک سو چونتیس جبکہ خواتین کی تعداد چونسٹھ تھی آپ کی ڈائری کے لیے یا ہائیڈ پارک کے عنوان کے تحت بارہ شماروں میں دو سو پچاس سے زیادہ اقتباسات' کترنیں اور شاعری شائع ہوئی جس میں سے ایک سو پچیس میل چوائس' جبکہ ایک سو دس فیمیل چوائس تھی۔ مسئلہ یہ ہے کے لیے بارہ شماروں میں 96 صفحات مختص رہے جن پر باباجی نے تریسٹھ حضرات اور 209 خواتین کو ان کے مسائل کا حل بتایا۔ سال بھر کے بارہ شماروں میں بارہ صفحات پر مشتمل بارہ عدد اداریے شائع ہوئے ویسے تو سبھی اداریے ایک سے بڑھ کر ایک تھے لیکن جنوری' فروری اور دسمبر کا اور یہ خاص طور پر بہترین تھے اور دسمبر کے اداریہ نے تو رُلا ہی ڈالا شہید میجر اسحاق کی شہادت اور اُس کی فیملی کے متعلق پڑھ کر یقیناً ہر صاحب دل رو پڑا ہوگا۔ ایوارڈ تقریب یہ تاثرات لکھنے والوں میں ممتاز احمد سرگودھا' افتخار چوہدری' منشی محمد عزیز مٹے' نعمان اسحاق' یاسر وکی' شاہد محمود مغل' وقاص حسین' بلال فیاض' قاسم خان بلوچ' ایم حنیف عاصم بلوچ' مجید احمد جائی' اشفاق شاہین' طاہر ساقی' ملک علی رضا اور عبدالغفار عابد کے نام شامل ہیں۔ جن خواتین نے اس تقریب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار سچی کہانیاں میں کیا۔ اُس کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حمیرا خان' ریحانہ آفتاب' رضوانہ کوثر' فصیحہ آصف خان' نسیم سکینہ صدف' ارم ناز' شائستہ انور' بشریٰ سعید' راحت وفا راجپوت' زمر نعیم' حنا بشریٰ اور شیما عبدالقیوم اب احوال میں شامل ہونے والے خواتین و حضرات کی کارکردگی ملاحظہ کیجیے' سب سے پہلے اُن حضرات کے نام جنہوں نے پورے سال 2017ء میں صرف ایک ہی بار احوال کا چکر لگانے پر اکتفا کیا۔ اُن کے نام یہ ہیں سنی خان' وارث بیگ' مراد خان' ڈرائیور اسد علی خان' احسن ابرار رضوی' مجاہد احمد جائی' ایم حنیف عاصم بلوچ' بشیر احمد بھٹی' ایڈووکیٹ احمد بلال' رانا محمد شاہد' احمد حسن عرضی' محمد اعجاز احمد' فلک شیر تابش' ذیشان ایاز' احمد امتیاز' محمد یعقوب احمدانی' احمد بٹ' محمد طویل طوفی' ذیشان ریاض' حضرت حیات' نعیم اللہ جوئیہ' محمد وقاص کھوکھر' عاطر شاہین' صوفی غلام مصطفیٰ' انفصال احمد' اسد اللہ' اسد عزیز' جمیل رضا' نعیم اللہ' عمر العطاس' وسیم اللہ فریدی' طاہر نوید' جاوید جتوئی' احمد جاوید' معاویہ عنبر وٹو' وقار مشتاق' ریحان گل' عابد حسین' محمد اسماعیل بروہی' راشد لطیف' محمد عثمان علی' ساحل ابڑو' محمد حسن نظامی' امیر حمزہ خان' محمد سلیم اختر' طاہر بٹ اور فوجی یٰسین بھٹی' اب اُن حضرات کے نام جنہوں نے دوبارہ احوال میں شرکت کی' قاسم خان بلوچ' ملک علی رضا' مجید احمد جائی' حافظ عابد علی' مہر پرویز احمد دولو' سلیمان شبیر اکوال' منشی محمد عزیز مٹے' نعمان احمد آرائیں' یاسر وکی' علی اصغر انصاری' طاہر علی ابڑو' محمد عمران مظہر' شہزاد اقبال' وقاص حسین' عبدالعزیز یافت' بلال فیاض' شیخ معظم الٰہی' میجر ریٹائرڈ عبدالقدوس اور ڈاکٹر فرمان علی۔ اب باری ہے اُن حضرات کی جن کے

احوال میں تین خطوط شائع ہوئے' اُن کے نام ملاحظہ فرمایئے ارشد اقبال چوہان' سید ندیم سرور' اشعر جواد اور بارش علی ثمیر' قاضی فیضان حسین عثمانی وہ واحد فرد ہیں جن کے احوال میں چار خطوط شائع ہوئے۔ اب باری ہے تیسری پوزیشن حاصل کرنے والوں کی وہ حضرات جنہوں نے پانچ بار احوال میں شرکت کر کے تیسری پوزیشن حاصل کی اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ممتاز احمد' غلام مرتضیٰ علوی' عبدالغفار عابد اور ایم افضل خان اور نظر علی برمانی' برمانی صاحب بڑے پرانے لکھاری ہیں۔ اُن سے شکوہ بھی ہے کہ مجھے یعنی اپنے ہم عصر کو بھی بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔ خیر تیسری پوزیشن حاصل کرنے پر سبھی دوست مبارکباد قبول فرمائیں۔ فی کس چھے خطوط کے ساتھ دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ فیصل ندیم بھٹی' خواجہ حسین جاوید اور مور شاہد حسین صاحبان نے آپ تینوں حضرات مبارکباد قبول فرمائیں۔ اور اب دلوں کی دھڑکنیں یقیناً تیز ہوگئی ہوں گی۔ جی ہاں اس سال احوال میں سب سے زیادہ یعنی سات بار شرکت کر کے اول پوزیشن حاصل کرنے والے صاحب کا نام ہے۔ ٹھہریے ذرا' مجھے دم تو لے لینے دیں۔ تو تالیوں کی بھرپور گونج میں تشریف لاتے ہیں جناب سید ملازم حسین شیرازی صاحب ان کو ملتے ہیں ڈھیروں ڈھیر محبتوں کے ساتھ مبارکباد بلکہ اسپیشل مبارکباد کے تحفے' خصوصی مبارکباد قبول فرمایئے اور اگلے سال کے لیے ابھی سے ڈٹ جایئے کہ یہ دور ہے مقابلے کا' ارے ٹھہریے تو کہاں چلے اب باری ہے خواتین کی' سب سے پہلے اُن خواتین کے اسمائے گرامی جنہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے چونچ بھر وقت نکال کر احوال میں صرف ایک ہی بار حاضری لگوائی وہ یہ ہیں۔ ماریہ جاوید' رضوانہ کوثر' فرح انیس' کرن ناز' نینا خان' سپاس گل' اقبال بانو' فرزانہ گل' تسنیم منیر' نفیسہ مغل' ثمینہ نیاض' رئیسہ خالد' سنبل' موہینہ بتول' نفیسہ سعید' کرن شبیر' تسنیم منیر علوی' فردوس بانو' فرزانہ نگہت' شازمر خان' راحت وفا راجپوت' فصیحہ آصف خان' سعدیہ سیٹھی' عظمیٰ شکور' نسیم سکینہ صدف' جن خواتین کی تین تحریر سال 2017ء میں سچی کہانیاں میں شائع ہوئیں۔ اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں اُم منائل' سیدہ تبسم زہرہ نقوی' شیما عبدالقیوم' فرح انیس اور شاہدہ ذاکر' جن خواتین کی چار کہانیاں لکھیں اُن کے نام پر ہیں ریحانہ آفتاب' الماس فاطمہ ارمان' اقبال بانو' نسیم سحر' نینا خان اور سیدہ تبسم زہرہ رضوی' اب باری ہے اُن خواتین کی جنہوں نے پانچ کہانیوں کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی اُن کے نام یہ ہیں طیبیس غزالہ نہال' حمیرا خان' ناریہ بتول رضا' کوئی بھی خاتون ایسی نہیں ہیں جن کی چھے کہانیاں سچی کہانیاں میں شائع ہوئی ہوں۔ فی کس سات کہانیوں کے ساتھ دوسری پوزیشن پر مشترکہ طور پر ثمینہ طاہر بٹ اور حنا بشریٰ صاحبہ اور اب آخر میں باری ہے خواتین لکھاریوں میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والی محترمہ کی' جنہوں نے آٹھ کہانیوں کے ساتھ پہلی پوزیشن حاصل کی اُن کا نام ہے' ارم ناز۔ لیجیے دوستو! میں نے پوری دیانت داری کے ساتھ 2017ء کا سچی کہانیاں کا مکمل تجزیہ آپ کے سامنے پیش کر دیا۔

اب آگے آپی منزہ سہام مرزا اور محترم بھائی ناصر رضا کے ہاتھ میں ہے بقول شاعر

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

سب دوست مبارکباد کے مستحق ہیں اور خاص طور پر پہلی دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے احوالی و لکھاری خواتین و حضرات اور آخر میں ایک شعر منزہ سہام مرزا اور ناصر رضا کے نام مشترکہ طور پر

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز کچھ تو اِدھر بھی

☆

ارشد اقبال چوہان' جڑانوالہ سے لکھتے ہیں۔ محترم جناب ناصر رضا' السلام علیکم! جنوری 2018ء کا شمارہ مل گیا ہے۔ دوسرے شماروں کی طرف قیمت نہ بڑھانے کا شکریہ' خط احوال میں شامل کرنے کا بہت شکریہ' لیکن اس خط کے بعد ایک اور خط بھی ارسال کیا تھا جس میں' میں نے کرن شبیر صاحبہ کی چربہ سازی کی شکایت تھی۔ مگر شاید وہ آپ کو دیر سے ملا ہے۔ بہر حال اُن کو میرا پیغام دیں کہ وہ اس اخلاقی جرم سے باز رہیں تو اچھا ہے۔ میجر صاحب کی کتاب مل گئی ہے۔ بہت مہربانی' میجر صاحب نے تحریری شکل میں ہمیں کاغذی تاج محل دے کر محبت کی نشانی دی ہے۔ بقول خلیل بدایونی ایک شہنشاہ نے بنوا کے حسین تاج محل' ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے۔ اگر وہ اس میں گڈی آپا کے ساتھ ملاپ..... اُن کے بچوں کے ساتھ برتاؤ' میجر صاحب کے ساتھ معمولات زندگی کی بھی تھوڑی سی جھلک دکھا دیتے تو بہت اچھا ہوتا۔ لیکن انہوں نے دل کے پھپھولے خوب پھوڑے ہیں۔ ہم تو اب یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ اگلے جہاں میں بھی میجر صاحب کو گڈی آپا کا ساتھ دیا آمین جنرل صاحب کی بازار نے بہت متاثر کیا۔ باقی ابھی زیر مطالعہ ہے خواجہ خورشید انور صاحب جیسے فن کار کی زندگی کا مکمل احاطہ نہیں کیا گیا۔ پھر بھی ایسے لوگوں کو یاد رکھنا بھی آپ کی عظمت ہے' تمام احوالیوں کو سلام اور آپ کی صحت مند زندگی کی دعا کے ساتھ اللہ حافظ'

☆

عمران مظہر' ڈوب سے لکھتے ہیں۔ اچھی منزہ سہام آپی' السلام علیکم! آپ کے حکم کے مطابق پُر اسرار نمبر کے لیے تحریر بھیجوا رہا ہوں پتہ نہیں کیسی ہے؟ وقت کم تھا اور کام زیادہ' ساتھ ہی ناصر رضا صاحب کے لیے کچھ لکھ کر بھیج رہا ہوں ممکن ہو تو شائع کر دیجیے گا' تفصیلی بات بعد میں ہو گی انشاء اللہ' بس ناصر انکل کے جانے سے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ دکھ ہو رہا ہے وہ واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ سلیم فاروقی' پرویز بلگرامی' ناصر رضا..... کیا لکھوں؟ دعاؤں میں یاد رکھیے

گا..... سب کے لیے دعائیں۔

☆

محمد دانیال' روڈ تھل سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! جناب محترم ایڈیٹر ناصر رضا صاحب آپ کیسے ہیں امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پورے اسٹاف کو سدا خوش سلامت رکھے اور لمبی عمر دے' سچی کہانیاں کے سب قارئین رائٹرز سچی کہانیاں کو پڑھنے اور چاہنے والوں کو میرا پیار بھرا سلام قبول ہو۔ محترم ایڈیٹر ناصر رضا صاحب آپ کو سب سے پہلے سچی کہانیاں کا گروپ ایڈیٹر بننے کی بہت بہت مبارک ہو۔ یہ میری کافی ماہ بعد سچی کہانیاں میں حاضری ہے۔ اس وقت کاشی چوہان ہوا کرتے ہیں۔ دعا ہے اور امید کرتا ہوں کہ آپ سچی کہانیاں عظیم مقام دلوائیں اور اسے خوب ترقی دیں گے۔ میں نے پچھلے دو ماہ بھی ڈاک بھیجی تھیں لیکن بدقسمتی سے آپ تک نہیں پہنچیں۔ جنوری کا شمارہ ایک خوبصورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ آٹھ جنوری کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت ہی خوبصورت تھا۔ شمارہ ایک طرف اور ٹائٹل ایک طرف' جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ بہت بہت عمدہ اور سپر ہٹ تھا۔ سب کی سب کہانیاں بہت عمدہ زبردست اور اچھی تھیں۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ کس کس کی تعریف کروں فلاں بری تھی فلاں اچھی تھیں تو یہ بالکل زیادتی ہو گی۔ باقی جتنی غزلیں تھی وہ بھی بہت عمدہ اور اچھی تھیں باقی رنگ برنگی تحریروں کا سلسلہ بھی خوب سے خوب اچھا تھا۔ انکل جی میری درخواست ہے شاعری کے بھی دو صفحے لگا دیا کریں یعنی شاعری کا بھی سلسلہ شروع کریں۔ پہلے تو قطعاً کیوں نہیں ہے۔ میں کچھ تحریریں بھیج رہا ہوں پلیز آئندہ شمارے میں ضرور لگائیے گا امید کرتا ہوں کہ آپ دل نہیں توڑیں گے۔ پلیز یہ خط سارے کا سارا لگائیے گا میری دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے آمین۔

☆

خضر حیات' روڈ تھل سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! جناب محترم ناصر رضا صاحب آپ کیسے ہیں امید کرتا ہوں کہ آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پورے اسٹاف کو سدا خوش سلامت رکھے اور لمبی عمر دے' سچی کہانیاں کے سب قارئین' رائٹرز اور اس کو پڑھنے اور چاہنے والوں کو میرا پیار بھرا سلام ہو۔ میرا یہ کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے امید کرتا ہوں جگہ دے کر خوش آمدید کہیں گے حوصلہ افزائی کریں گے۔ میرا ایک بہت ہی اچھا سا دوست ہے اسی نے سچی کہانیاں متعارف کرایا۔ میں نے لے کر پڑھا بہت ہی اچھا لگا۔ پہلی بار لیا پہلی بار پڑھا اور پہلی بار ہی اچھا لگا پہلی باری میں ہی خط لکھنے پر ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ بہت زبردست اور اچھا ڈائجسٹ ہے' اس میں ہر

چیز موجود ہے۔ یہ ہر عمر افراد کے لیے بہت اچھا ہے۔ میرے دوست نے اس کی تعریف پر پل باندھ دیے لیکن یہ تو اس سے بھی بڑھ کر نکلا۔ یہ میرے دل میں چھا گیا۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی کیا لکھوں کیا نہ لکھوں میری آپ سے ایک درخواست ہے اس میں شاعری نہیں ہے شاعری کے بغیر تو یہ نامکمل ہے اس میں دو صفحات پر شاعری کا سلسلہ شروع کریں۔ اب تک کے لیے اتنا ہی زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ میں کچھ چیزیں بھیج رہا ہوں پلیز پلیز فروری کے شمارے میں ضرور لگایئے گا امید کرتا ہوں کہ حوصلہ افزائی کریں گے۔ میری دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے آمین۔

☆..

عبدالغفار عابدؔ چیچہ وطنی سے لکھتے ہیں۔ باجی منزہ اور اس محفل سے وابستہ سبھی لوگ میرا اسلام قبول فرمائیں۔ ساتھیو! سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کیا لکھوں کہاں سے شروع کروں' انسانی زندگی غموں اور دکھوں سے بھری پڑی ہے ان میں کچھ دکھ ناقابل برداشت ہوتے ہیں جو آدمی کو زندگی بھر رُلاتے ہیں ناصر بھائی کے اچانک بچھڑنے کا دکھ ہمیں ساری زندگی رُلائے گا۔ سلسلہ روزگار کے لیے دوبارہ کراچی آنا پڑا۔ 19 دسمبر کو اپنے آنے کی اطلاع ناصر بھائی کو دی تو وہ بہت خوش ہوئے پوچھا کب تک آ رہے ہو سچی کہانیاں آفس میں نے کہا دو تین دن بعد آؤں گا۔ انہوں نے کہا عابد بھائی پھر آپ 26 دسمبر کے بعد آنا میں ایک دو دن میں حیدرآباد چلا جاؤں گا۔ واپسی 26 دسمبر کے بعد ہوگی۔ 27 دسمبر کو ناصر بھائی کا میسج ملا کہ عابد بھائی میں واپس آ گیا ہوں۔ جلدی آفس آ کر ملو میں نے یکم جنوری کو آنے کا وعدہ کیا یکم جنوری کو میں نے ناصر بھائی کو میسج کیا کہ میں آج آ رہا ہوں فوراً باجی کی کال آ گئی کہا ناصر صاحب تو بہت بیمار ہیں ہم آغا خان اسپتال میں ہیں۔ اس کے بعد کال اور میسج کا جواب نہ ملا 6 جنوری کی رات اُن کی بیٹی کا میسج ملا کہ انکل ابو کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس میسج نے وہ دکھ دیا جو مجھے زندگی بھر رولائے گا صبح 7 بجے دوبارہ میسج آیا کہ نماز جنازہ جوہر موڑ سلطان مسجد میں ظہر کے بعد ادا ہوگی' ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے میں بروقت نہ پہنچ سکا جس کی وجہ سے نماز جنازہ تو نہ پڑھ سکا پر اپنے بھائی کا آخری دیدار نصیب ہوگیا' تعزیت کرنے گھر پہنچا تو مرحوم کی بچیوں کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر اور دکھی ہوگیا۔ وہ احساس دل رکھنے والے انسان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے احساس ہی زندگی ہے احساس نہیں تو سب کچھ ہوگا پر انسان نہیں' ذرا سوچیں موت کیا ہے آخر؟ کیا فنا کا نام موت ہے اگر ایسا ہی ہے کہ موت اسی کا نام ہے یعنی جو مر گیا وہ جو کام کر رہا تھا وہ نہیں کر سکے گا وہ سانس لے رہا تھا یعنی کہ دنیا سے گزر گیا اور بس اس کا زمانہ ختم ہوگیا' سادہ الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ مر گیا تو اس کا کام بھی دم توڑ گیا۔ لیکن کوئی بظاہر مر جائے لیکن اس نے جو

کام شروع کیا ہو وہ اسی آب و تاب سے جاری رہے گا تو کیا ہم اسے بھی مردہ ہی کہیں گے؟ مرحوم ادب کے ایدھی اور ڈاکٹر روتھ تھے انہوں نے ادب کے لیے بہت کام کیا ان کے شروع کیے کام کو جاری رکھنا باجی منزہ سمیت ہر ایڈیٹر کا فرض بنتا ہے مرحوم کا کردار ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کی جلائی ہوئی شمعیں ہمیشہ روشن رہیں گی انشاءاللہ' بھائی حسین خواجہ اور شہزاد شریف' مہر پرویز احمد دولو آپ کی محبت کو سلام پر میرے جیسا اَن پڑھ آدمی سچی کہانیاں کی ایڈیٹری کیسے کر سکتا ہے یہ خط سچی کہانیاں کے آفس میں بیٹھ کر لکھا یہ زین بھائی اور باجی منزہ سے ہونے والی ملاقات کافی حوصلہ افزا رہی تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ وہ ناصر بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کریں اللہ تعالیٰ مرحوم کو آخرت کی آسانیاں نصیب فرمائے اور اہل خانہ سمیت ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

☆..

ایم حسن نظامی' قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہن منزہ سہام صاحبہ' آداب عرض' سلام خلوص' امید ہے آپ اور سچی کہانیاں سے وابستہ سبھی احباب بخیریت ہوں گے۔ سب سے پہلے اپنے بھائی ناصر رضا کی ناگہانی وفات پر دلی دکھ کا اظہار کرتا ہوں۔ ایسے مخلص' محنتی اور پُرمسرت لوگ صدیوں بعد پیدا ہوا کرتے ہیں اور یہ خلا کبھی پُر نہ ہو سکے شاید' خداوند کریم انہیں اپنی جوارِ رحمت میں خاص جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔ سر سلیم اختر کے فرمان کی روشنی میں اپنی پہلی فرصت پر چھوٹی سی مگر سبق آموز تحریر' خونی ہوس' حاضر خدمت ہے امید ہے آپ اور قارئین کو پسند آئے گا۔ قارئین کرام کچھ فیصلے بندہ جب کر رہا ہوتا ہے تو اسے ان کی سنگینی کا ذرا بھر احساس نہیں رہتا۔ جلد بازی میں غرور' گھمنڈ اور تکبرانہ فیصلے بعض اوقات بندے کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتے ہیں۔ اور پھر ایسے گھمبیر مسائل جنم لیتے ہیں جو دلوں کا سکون اور آرام تباہ و برباد کر دیا کرتے ہیں پھر کچھ بھی نہیں بچا کرتا۔ پرچہ بلاشبہ نکھار اور خوبصورتی کی طرف گامزن ہے یہ آپ اور لکھاری دوستوں کی محنتوں' کوششوں کا مرہون منت ہے۔ خداوند کریم اسے مزید ترقی سے نوازے۔ قابل احترام میں نے دو تین تحریریں کاشی چوہان کو ارسال کی تھیں مگر تا حال اُن کی خبر نہ ہو سکی۔ مجھے ایک ہی پرابلم ہے کہ پرچہ نا تو سعید یہ بک اسٹال پر آپ بھیج رہے ہیں اور نہ ہی مجھے اعزازی کاپی ارسال کر رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر اعزازی پرچہ ارسال کر دیا کریں تو ہر ماہ اس پر تجزیہ ضرور ارسال کرتا رہوں گا۔ ساتھیوں لیجیے تحریر پڑھیے اور حرف آخر پہ اپنی قیمتی آراء سے ضرور نوازیے گا۔ تب تک اللہ حافظ۔

☆..

اگلے ماہ آپ سے پھر ملاقات ہوگی انشاءاللہ......

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

زبیدہ طارق

رکھتا تھا زخم زخم پہ مرہم ہر اک کے
وہ شخص ہم سے دوستو' اب روٹھ گیا ہے

ہماری اور آپ کی زبیدہ آپا جن کی بدولت بہت سی
بچیاں آج سکھڑاپے کا ٹیگ سجائے ہوئے ہیں

منزہ سہام

زبیدہ طارق جنہیں سارا پاکستان اور پاکستان سے باہر جہاں جہاں اردو سمجھنے والے بستے ہیں لوگ زبیدہ آپا کے نام سے جانتے ہیں اپنے بے شمار فینز کو تنہا کر گئیں۔ موت ایک اٹل

حقیقت ہے مگر کیا کریں اپنے پیاروں کے بچھڑنے کا سوچ کر ہی دل لرز جاتا ہے۔ آج میں زبیدہ طارق جنہیں مرحومہ لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے کہ بارے میں کچھ باتیں اپنے پڑھنے والوں سے شیئر کروں گی۔ یہ سچی کہانی بھی ہے اور کچھ واقعات پُراسراریت بھی رکھتے ہیں۔ میں جو کچھ لکھوں گی وہ میرا آنکھوں دیکھا بھی ہوگا اور اپنے بڑوں سے ہار سنا ہوا بھی..... زبیدہ خالہ میری والدہ کی سگی تایا زاد بہن تھیں۔ انڈیا سے ہجرت کے بعد پاکستان میں بہت کسمپرسی کے دن گزارے۔ فاطمہ ثریا بجیا سب سے بڑی بہن تھیں اور زبیدہ خالہ سب سے چھوٹی..... نواب شارعلی خان کی یہ نواسیاں جب پاکستان آئیں تب جھونپڑیوں میں رہائش اختیار کی پھر PIB کالونی جو آج بھی موجود ہے وہاں چھوٹے سے کوارٹر میں دس بارہ لوگ رہا کرتے فاقہ کشی عام سی بات تھی۔ میں نے بجیا سے سنا کہ ایک دن ہم لوگ کئی دن کے بھوکے بیٹھے تھے کہ دروازے پر کھٹکا ہوا دروازہ کھولنے پر دیکھا کہ صاف ستھرے لباسوں میں چند عورتیں کھڑی ہیں جن کے ہاتھوں میں دھکے ہوئے تھال ہیں۔ کہنے لگیں ہماری مالکن نے آپ کے لیے بھجوائے ہیں۔ بجیا نے پوچھا آپ اپنا گھر بتا دیجیے تاکہ برتن واپس کرسکیں تو کہنے لگیں آپ فکر مت کریں ہم خود ہی آکر لے جائیں گے۔ بجیا کہتی تھیں کہ اتنا لذیذ کھانا شاید ہی کبھی کھایا ہو۔ حالانکہ نواب گھرانے سے تعلق تھا ہر شے کی فراوانی تھی مگر پھر بھی وہ مزہ نہ پہلے بھی آیا اور نہ بعد میں..... خیر کئی دن گزر گئے کوئی نہیں آیا۔ ایک دن گھر کے مردوں کے سامنے ذکر ہوا اور برتن دکھائے گئے تو پتہ چلا کہ یہ تو خالص چاندی کے تھال ہیں جن پر سونے سے

نقش نگار بنائے گئے ہیں۔ محلے میں معلوم کرنے کی کوشش کی تو کوئی ایسے گھرانے کو نہیں جانتا تھا پھر غریب آبادی تھی جہاں وہ وقت کے کھانے کے لالے ہوں وہاں ایسے قیمتی برتن کہاں سے آتے بہت دن اُن خواتین کا انتظار کیا اس کے بعد ان برتنوں کو بیچ کر بے شمار ضروریات پوری کیں۔ زبیدہ خالہ بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں جو لوگ اُن کو قریب سے نہیں جانتے وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ ایک عام سی پروفیشنل خاتون تھیں۔ حقیقتاً ایسا ہرگز نہیں تھا وہ انتہائی سادہ مزاج اور محنتی خاتون تھیں زندگی بھر اپنے شوہر کا ہاتھ بٹایا۔ مختلف نوکریاں کیں بے انتہا تنگ دستی بھی دیکھی مگر مجال ہے کہ کسی کو پتہ بھی چلا ہو۔ اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ کسی کے بارے میں بھی کچھ بھی کہہ دیتے ہیں وجہ حسد ہو یا احساس کمتری زبیدہ خالہ کے بارے میں بھی کچھ اسی قسم کے لوگ مختلف باتیں کرتے رہے ان کے انداز،

لباس سب کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے حالانکہ کسی کی بھی ذاتی زندگی کے بارے میں بات کرنا انتہائی گری ہوئی حرکت ہے۔ اگر کسی شخص کو اچھا لباس پہننے کا شوق ہے یا اچھا گھر رکھنے کا یا اچھا کھانے کھانے کا تو اس میں کیا برائی ہے اور پھر یہ تمام کام تو جنگل وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے خاندانوں کا کچھ پتہ نہیں' زبیدہ خالہ کا خانوادہ نوابوں کا خانوادہ ہے۔ جہاں زندگی کے اصول بہت الگ ہوتے ہیں۔ جہاں اپنے دکھ اور تکالیف کے بارے میں بتانا گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ ہمدردی کو بھیک تصور کیا جاتا ہے۔ اسی لیے زندگی کے آخری چند گھنٹوں میں بھی وہ ٹی وی پر موجود ہمارے اور آپ کے لیے کھانے کی ترکیبیں ریکارڈ کروا رہی تھیں۔ طبیعت خراب ہوئی تو کہنے لگیں۔ ریکارڈنگ Postpone مت کرو میں ڈاکٹر کو دکھا کر آتی ہوں اتنے سارے لوگ ہیں چینل کا اتنا پیسہ لگا ہوا ہے میری وجہ سے کسی کا نقصان ہو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس چلی گئیں سب انتظار کرتے رہے اور پھر یہ انتظار اُن کی واپسی پر ختم بھی ہوگیا ہمیشہ کے لیے..... اسی طرح خوبصورت ساڑھی زیب تن کیے کلائی بھر چوڑیاں گلے میں موتیوں کی لڑیاں کوئی یہ اندازہ ہی نہیں کرسکتا تھا کہ زبیدہ خالہ کتنے عرصے سے بیمار ہیں ان کا دل رک رک کر چلتا تھا۔ کئی بار جان لیوا دل کے دورے بھی پڑ چکے تھے شاید کوئی عام انسان ہوتا تو صاحب فراش ہو چکا ہوتا مگر وہ عام انسان کہاں تھیں۔ وہ پاشی کی بیٹی اور بجیا کی لاڈلی چھوٹی بہن تھیں۔ وہ قمر چچا کی بیٹی تھیں جو عین ایام جوانی میں اپنے بچوں کو یتیم کرکے دنیا سے چلے گئے تھے۔ شہزادیوں کی طرح پلی پاشی بیوگی میں اپنے بچوں کو سنبھالے بیٹھی رہیں وہ محل جہاں غرباء کے لیے دسترخوان بچھائے جاتے ہیں اس گھر کے بچے کئی کئی دن فاقے کیا کرتے مگر صبر تھا کہ منہ سے ایک لفظ کبھی نہ نکلا بس محنت کی اور محنت کی اس لیے اللہ نے بے حساب نوازہ..... میں نے اپنی نانی سے سنا تھا کہ زبیدہ خالہ کے والد جوان کے بھائی تھے اور شام اپنی بہنوں سے ملنے آتے برابر میں تو گھر تھا صحن میں کرسی پر بیٹھتے اور چائے پیتے روز کی طرح ایک دن آئے بہن کو سلام کیا اور کرسی پر بیٹھنے لگے مگر بیٹھنے کے بجائے گر سے گئے نانی بھیا کہتے ہوئے بھاگ کر پاس آئیں تب تک ختم ہو چکے تھے۔ ہجرت کے بعد ابھی یہ خاندان سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اتنے بڑے سانحے کا سامنا تھا وہیں صحن میں ان کو غسل دیا گیا اور آخری سفر روانہ ہوگئے مگر نانی بتاتی تھیں کہ وہ جگہ جہاں غسل دیا تھا۔ مستقل گیلی رہتی کچا صحن تھا وحشت ہوتی تھی اس جگہ کو دیکھ کر اس پر بجری ڈلوائی گئی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا پھر صحن کے اس حصے کو سمنٹ کروا دیا گیا۔ اس کے باوجود وہ ویسے ہی گیلی رہتی برسوں اس جگہ کو دیکھ کر اذیت ہوتی رہی پھر حالات کچھ بہتر ہوئے تو وہ گھر ہی چھوڑ دیا۔ مگر یہ معمہ کبھی حل نہ ہوا کہ وہ جگہ خشک کیوں نہیں ہوتی تھی۔ آج اس خاندان کا ہر فرد کامیاب ترین ہے۔ یقیناً یہ اللہ کا کام ہے یہ اس صبر اور محنت کا صلہ ہے جو انہیں اپنے اجداد سے وراثت میں ملی۔ زبیدہ خالہ کی والدہ پاشی کو پھولوں پودوں حتیٰ کہ کانٹوں سے بھی پیار تھا۔ وہ پودوں سے باتیں کرتی تھیں میں روز شام امی کے ساتھ ان کے گھر جاتی تھی۔ مجھے وہاں بہت مزہ آتا تھا ایک تو ہر شخص کے لیے اس گھر کے دروازے ہمہ وقت کھلے رہتے کھانا پینا وافر تھا پاشی کہتی تھیں یہ

سب اللہ کرتا ہے تو میں اس کے بندوں کو کیوں نہ کھلاؤں یاد رہے یہ وہ لوگ ہیں جو کئی کئی دن کے فاقے سے رہتے تھے۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ پاشی کا گھر پہاڑ پر تھا سخت پتھریلا پہاڑ اور انہوں نے اس پر ایسے ایسے پودے لگائے ہوئے تھے جو لوگ میرے رشتے دار تھے میں نے ان کے بارے میں لکھا بلکہ اصل مقصد صرف یہ ہے کہ ایک شخص صرف ایک شخص نہیں ہوتا ایک پوری زندگی ہوتی ہے جس میں بڑے اسرار بھی ہوتے ہیں۔ غیر معمولی واقعات بھی ہوتے ہیں اس شخص

سوائے نرم مٹی کے اُگ ہی نہیں سکتے تھے اب لوگ یقین کریں یا نہ کریں میں نے پودوں کو پاشی کو دیکھتے ہی جھومتے دیکھا مجھے لگتا تھا گلاب کا پودا گردن موڑ موڑ کر انہیں دیکھتا ہے۔ رات کی رانی قدموں میں بچھی بچھی جاتی ہے زہرہ بیل ان کے کمرے کی کھڑکی پر جھولتی رہتی تھی اور وہ اُن سے باقاعدہ میرا بچہ کہہ کر باتیں کرتیں...... پاشی کے انتقال کے بعد بجیا کے بھی یہی شب و روز تھے وہ بہت مصروف رہتی تھیں مگر پودوں کے لیے ان کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہ کی خوشیاں' دکھ جو اس نے اکیلے سہے ہوتے ہیں۔ انسان بہت قیمتی ہے بہت اہم ہے اس کی قدر کریں اپنی قدر کریں کیونکہ زندگی کا سفر بہت مختصر ہے ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاوا مقدر ہو......

نوٹ:

آپ لوگ بھی اگر اپنے کسی پیارے یا ایسی ہستی کے بارے میں لکھنا چاہتے ہیں جن کی سوانح حیات پڑھ کر لوگوں کو ایک اچھا پیغام ملے تو فوراً قلم اٹھایئے کیونکہ قلم کا جہاد عظیم ترین ہے۔

☆☆......☆☆

تاریخ کہانی

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتی علم سے آباد ایک زندہ تحریر

دُخترِ کاہن

(دوسرا حصہ)

حسرت موہانی کا خیال

اے زہد عشق تیری ہدایت کے واسطے
سوغات عشق لا رہے ہیں کوئے بتاں سے ہم

م۔ن۔خ

"دیکھو وہ سامنے کوہ سینا جسے کوہ طور بھی کہتے ہیں۔" لاوی بن یعقوب کے خاندان کے معز ز عالم ابراہیم بن کالب نے بلند ترین چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی

ایش بن کالب سے کہا۔ ''یہی وہ بلند ترین پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا نے انہیں شریعت عطا کرنے کے لیے طلب کیا تھا۔ میں جب پہلی بار بابا جان کے ساتھ یہاں آیا تھا' تب بھی اس پہاڑ کے بالائی حصے کو بادلوں نے یونہی ڈھکا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ بابا جان نے اپنے بزرگوں سے اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چلہ کیا تھا۔ یہیں وہ اپنے خدا سے باتیں کرتے تھے اور یہی چوٹی ہے جہاں ان کی ضد پر خدا نے اپنا جلوہ دکھایا مگر وہ بے ہوش ہو کر گر گئے تھے اور وہی حصہ مسلسل بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔'' ابراہیم بن کالب نے یہ سب ایک ہی سانس میں خوشی سے سرشار آواز میں یوں کہا جیسے یہاں آنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہو اور اس وقت وہی نہیں بلکہ خود ایش بن کالب بھی بڑی حیرت' عقیدت اور خوشی سے اس پہاڑ کو دیکھ رہا تھا جس سے ہزاروں داستانیں وابستہ تھیں۔ ابراہیم بن کالب نے دھیرے سے اعتراف کے انداز میں کہا۔

''ایش' میرے بھائی! تمہارے ساتھ اتنا طویل سفر کرنے کے لیے میں رضامندی اس لیے ہوا تھا کہ تم اس طرف سفر کر رہے تھے ورنہ یوں مسلسل سفر کرنا آسان بات نہیں ہے۔''

اس وقت ایش بن کالب نے اسے تائیدی نظروں سے دیکھا۔ ان دونوں نے بہت کم قیام کے بغیر یہ سفر کیا تھا۔ اس پہاڑ کے دامن میں ایک رات گزارنے کی تمنا اسے بھی تھی لیکن ابراہیم کے دل میں مچلنے والی تمنا کو وہ بہت حد تک جانتا تھا اور اسی وقت خود ابراہیم نے بھی دھیرے سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے' یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رب سے جو مانگو' وہ ضرور ملتا ہے۔'' اس کے لہجے میں عجیب اشتیاق تھا' عجیب آس تھی۔ ایش بن کالب محسوس کیے بغیر نہ رہا۔ اس نے کہا۔

''موسیٰ کے رب سے جہاں بھی مانگو' وہ ضرور دیتا ہے۔''

''مگر میرا اعتقاد جگہ پر بھی ہے اور آج کی رات میں وہ سب کچھ مانگنا چاہتا ہوں جس کی مجھے آرزو ہے۔'' ابراہیم بن کالب نے اپنے اندر مچلتی ہوئی تمناؤں کو محسوس کیا۔ شاید وہ فیصلہ کر رہا تھا کہ پہلے کیا مانگے' منصب یا اولاد؟

وہ دونوں بھائی تھے مگر ان کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ ابراہیم بن کالب کی عمر پینتیس سال تھی اور ایش بن کالب کی عمر بیس سال مگر عمروں کے اس فرق کو نظر انداز کر کے ان دونوں میں بھائیوں والی چاہت بھی تھی۔ باپ بیٹے والا احترام بھی اور دوستوں والا پیار بھی۔ بات نفع کی ہوتی یا نقصان کی' خوشی کی ہوتی یا غمی کی' وہ ایک دوسرے سے ہی کرتے تھے اسی لیے ایش بن کالب ان محرومیوں سے بھی واقف تھا جن کا اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ ابراہیم بن کالب' لاوی بن یعقوب کے خاندانی رواج کے مطابق خود کو علم کے لیے وقف کر چکا تھا اور ایش بن کالب ایک تاجر تھا اسی لیے اس بار کو وہ سینا کی طرف سفر کرتے ہوئے ابراہیم نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ یہاں قیام کر کے مرادیں مانگ کر انہیں واپس ہونا تھا اور تجارت بھی واپسی میں ہی کرنا تھی۔

بیت المقدس کی نئی تعمیر کے بعد اس قوم نے اسے اپنی تہذیب کا مرکز بنا لیا تھا اور اس مقدس گھر کی کہانت کے لیے ایک باقاعدہ نظام قائم ہو چکا تھا۔ بنو اسرائیل بارہ قبائل میں منقسم تھے جن میں گیارہ قبیلے زندگی کے لاتعداد شعبوں میں دیگر امور کی انجام دہی کے لیے مخصوص تھے لیکن ''بنی لاوی'' صرف اور صرف بیت المقدس کی کہانت کا ذمے دار تھا۔ یہ لاوی بن یعقوب کا خاندان تھا۔ ابتدا سے اس مقدس گھر کا کاہن صرف اسی خاندان سے چنا جاتا تھا جو تمام مذہبی رسمیں ادا کرتا' قوم کو برائی سے روک کر نیکی کی طرف راغب کرتا' مذہبی معاملات کی نگرانی' وقف بچوں کی پرورش' مقدموں کے فیصلے سناتا' انصاف کرتا' بیت المقدس کے خاص حصے میں جا کر بخور جلاتا اور دعائیں کرتا۔ الغرض اس کی حیثیت ایک قاضی یا جج کی سی ہوتی یا ایک باپ اور نگہبان کی۔

بنو اسرائیل اس کاہن پر اندھا اعتماد کرتے تھے یہاں تک کہ بادشاہ وقت بھی اس کی تعظیم کرتا تھا۔ اس ساری خدمت کے بدلے میں یہ کاہن ان سے کچھ بھی نہ لیتا بلکہ اپنی روزی خود کماتا' ساری قوم سے زیادہ سادہ زندگی گزارتا۔ قوم اس منصب اور عہدے کے لیے بنی لاوی کے جلیل القدر علماء کو منتخب کر کے ان میں سے ایک کو چننے کے لیے باقاعدہ قرعہ اندازی کرتی۔ اس وقت تمام علماء موجود ہوتے' جس کے نام قرعہ نکل آتا' اسے اپنا کاہن مان لیتے۔ ایسے میں بنی لاوی کا ہر جوان زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر کے خود کو اعلیٰ ترین ثابت کرنا چاہتا تھا اور جو خود یہ منصب نہ پا سکتا' اپنے بیٹوں کے لیے کوشاں رہتا۔ اس زمانے میں بنی لاوی کے خاندان کا بڑا بیٹا خود کو حصولِ علم کے لیے وقف کر دیتا تھا تاکہ یہ منصب پا سکے اور ابراہیم بن کالب بھی اس خواہش سے بے نیاز نہیں تھا۔ بیت المقدس کا کاہن بننا معمولی بات نہ تھی مگر وہ بنی لاوی کے علماء میں سب سے کم عمر سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس کے کاہن بننے کی امید لوگوں کو بہت کم تھی پھر بھی اس رسم کی ادائیگی سے پہلے ان دونوں کو واپس بیت المقدس پہنچنے کی آرزو تھی مگر چونکہ ان کے پاس وقت کی فراوانی تھی' وہ بآسانی اس تجارتی سفر سے واپس جا کر اس رسم میں شریک ہو سکتے تھے۔

ان دونوں کا ایک ہی گھر تھا اور لگتا تھا کہ ان دونوں کی بے پناہ چاہت ان کی بیویوں میں بھی منتقل ہو گئی تھی۔ ابراہیم بن کالب کی بیوی حسنہ' اولاد کے سوا ہر نعمت سے مالا مال تھی۔ اپنی تیس سالہ زندگی کا ہر لمحہ اس نے خوش رہنے اور خوش رکھنے میں گزارا تھا۔ گھر میں ہوتی یا بیت المقدس جاتی' دوسروں کے لیے ہی طلب کرتی لیکن ان سب اوصاف کے باوجود تنہائیوں کے لمحوں میں کسی ننھے منے وجود کی تمنا پر قابو نہ پا سکتی۔ یوں برسوں گزر گئے' تب ایش بن کالب کی نوعمر بیوی زلیخا نے جھجکتے ہوئے لاظان بن ایش کو اس کی گود میں ڈالا تو اسے لگا کہ یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔ اب لاظان اس کا تھا اور جب موسیٰ کے رب نے ایش اور زلیخا کو ایک اور بیٹے ہاران سے نوازا تو ان کا تعلق کچھ اور مضبوط ہو گیا۔

عمروں کا فرق ان دونوں میں بھی تھا لیکن ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے اور شفقت و محبت کی فضا نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں بھائی طویل سفر پر جاتے ہوئے مطمئن تھے کہ یہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی اور زمانے بھر کی غم گسار تھیں اور زمانہ ان کا دوست۔ جس وقت ٹھنڈی ریت پر لیٹا ہوا ایش کالب یہ سب سوچ رہا تھا' عین اسی وقت اس بلند و بالا پہاڑ کے دامن میں بیٹھا ہوا ابراہیم بن کالب بادلوں میں چھپے ہوئے پہاڑ پر نظریں جمائے تصور ہی تصور میں حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے رب کو اس کی قوتوں کے واسطے دے رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''موسیٰ کے لامتناہی قوت والے خدا! یہ وہی جگہ ہے جہاں تو نے ایک پُرجلال قوم کو پست کرنے اور ایک کمزور قوم کو عزت دینے کا فیصلہ کیا تھا پھر تیرے اس فیصلے میں کوئی شئے رکاوٹ نہیں بن سکی تھی۔ باری تعالیٰ تیری ذات سب پر محیط ہے۔ تو سب کو دیتا ہے اور سب تیرے محتاج ہیں۔ آج تیرا سب سے کمزور اور محتاج بندہ تجھ سے وہ شئے طلب کر رہا ہے جس کا حصول اس کے لیے ناممکن مگر اس کا عطا کرنا تیرے لیے آسان ہے۔ باری تعالیٰ لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کو بیت المقدس کی کہانت اور اولاد عطا فرما دے۔ موسیٰ کے لامحدود قوت والے خدا! موسیٰ کے لامحدود قوت والے خدا!''

دُعا کے الفاظ ادا ہوتے رہے' آنسو بہتے رہے' وہ گڑگڑاتا رہا' انگارہا اور بادلوں میں چھپی ہوئی چونی پر خدا کے موجود ہونے کا احساس اسے دیوانہ بناتا رہا۔ کتنی دیر گزری' اسے اندازہ ہی نہ ہوا' ہاں' بہت دیر بعد قلب کی طمانیت نے اسے یقین دلا دیا کہ موسیٰ کے رب نے گزارش سن لی' التجا قبول کرلی' تب اس نے زمین پر اپنا سر رکھ دیا۔ دوسرے دن اس نے کہا۔ ''ایلش میرے بھائی! میرا دل گواہی دیتا ہے کہ موسیٰ کے رب نے میری گزارشیں سن لیں۔ قبولیت دُعا کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ قلب پر سکون طاری ہوجاتا ہے جس کا احساس مجھے پہلی بار ہوا ہے۔''

''موسیٰ کا رب آپ کو ہر نعمت عطا فرمائے۔'' ایلش بن کالب نے کہا۔ ''اب ہم واپسی کا سفر شروع کرسکتے ہیں۔''

''بے شک' بے شک' ہمارے پاس وقت کی قلت نہیں ہے لیکن غیر ضروری دیر کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔''

دونوں بھائیوں نے بادلوں میں چھپے ہوئے پہاڑ پر آخری نظر ڈالی اور واپسی کے لیے گھوڑے موڑ لیے۔ اس وقت ان کی گفتگو کا موضوع بیت المقدس اور قرعہ اندازی کی رسم تھی۔

بیت المقدس میں عام قرعہ اندازی کا طریقہ تو یہ تھا کہ جو معاملہ طے نہ پاتا' توریت لکھنے والے عام مصلی اپنے اپنے قلم پانی سے بھرے ہوئے طشت میں ڈال دیتے۔ جس کا قلم بھی پانی پر تیر جاتا' اس معاملے کو وہی طے کرتا اور سب اس فیصلے کو مان لیتے لیکن کہانت کا فیصلہ اور کاہن کا انتخاب کوئی عام بات نہ تھی۔ ایسے میں خاندان بنی لاوی کے عالموں اور توریت مقدس کے حافظوں کو مدعو کیا جاتا جن کی تعداد بارہ ہونی ضروری تھی۔ بنی اسرائیل کے لیے مدتوں بارہ کے عدد کی بڑی اہمیت رہی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے بارہ چشمے پھوٹے جنہیں بارہ قبیلوں نے اپنی اپنی ملکیت بنا لیا اور آگے چل کر وہی اس قوم کی پہچان بن گئے۔ دن کے بارہ گھنٹے تھے' رات کے بارہ گھنٹے اور سال کے بارہ ماہ تھے اور اب بھی بنواسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے جن میں گیارہ بیت المقدس کے دیگر تمام امور کے نگراں اور بارہواں بنی لاوی کہانت کے لیے مخصوص تھا اور ان کے بھی چنیدہ چنیدہ صرف بارہ علماء کو دعوت دی جاتی تھی جس کے لیے یہ خاندان برسوں محنت کرتا تھا۔

اس بار قرعہ اندازی کے لیے دعوت دی گئی تو صرف گیارہ عالم ہی جمع ہوسکے۔ اب ایک اور کی

طلاش تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اسی دن' اسی موقع پر اپنے تجارتی سفر سے لوٹنے والے ابراہیم بن کالب سے سب ہی واقف تھے اور اس کی علمی حیثیت بھی جانتے تھے لہٰذا انہیں دیکھتے ہی ایک شور بپا ہوگیا۔ کوئی بولا۔

''ارے ابراہیم بن کالب بھی تو حافظ توریت اور عالم ہے۔ بس عمر کم ہے۔''

''ہاں' ہاں' گنتی پوری کرنے کے لیے شامل کرنے میں کیا حرج ہے؟'' کسی نے چلا کر کہا۔

ہر طرف شور بپا تھا اور اصل صورت حال سے ناواقف یہ دونوں بھائی حیران تھے۔ اسی وقت کسی نے آواز لگائی۔

''بنی لاوی کے خاندان کا ہے' عالم توریت ہے' تو دیر کس بات کی؟ چلو قرعہ اندازی شروع کرو۔''

یہ کہتے کہتے کچھ لوگ قریب آئے اور گھوڑے سے اترتے ہوئے ابراہیم بن کالب کو بیت المقدس کی طرف لے جانے لگے۔ لوگ ابھی تک چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

''دیکھو آج صبح سے ہم لوگ بارہویں عالم کے لیے پریشان تھے اور وہ اتنے طویل سفر سے آنے والا تھا۔''

اب ابراہیم بن کالب کے قلب پر وہی دُعا والی طمانیت عود کر آئی تھی۔ سب جوتے اتارتا کر بیت المقدس میں داخل ہونے لگے۔ بیت المقدس کے اندر کا نظارہ آج کچھ اور تھا۔ پانی سے بھرا ہوا طشت اس گھر کے مقدس صحن میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے گرد خاندان بنی لاوی کے معززین گھیرا بنائے کھڑے تھے' دوسرا بڑا گھیرا بیت المقدس کے باقی خدمت گار اور مصلیوں کا تھا پھر دوسرے قبائل کے معززین کا نمبر تھا۔ یہ گھیرا قدرے بڑا تھا اور تیسرا باقی قبائل کے معززین کا تھا اور پھر بیت المقدس کے دیگر خدمت گاروں کا جن کی اہمیت عام لوگوں سے تو زیادہ تھی مگر ان معززین سے کم تھی لہٰذا اسی ترتیب سے سب کو مقام ملے تھے۔ ان سب کے علاوہ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا جو اپنے اپنے جوتے باہر اتار کر اندر آگئے تھے اور جو اندر نہ آسکے تھے' باہر ہی سے نتیجہ دیکھنے کے تمنائی تھے۔ جنہیں اندر کا منظر نظر نہیں آرہا تھا' وہ آوازوں سے اندازہ کر رہے تھے۔

اس وقت اندر کا منظر عجیب تھا۔ پانی سے بھرا ہوا طشت درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ پانی کی حرکت کم ہوتے ہوتے ساکن ہوجاتی' تب کارروائی شروع کی جاتی۔ لوگ انتظار کر رہے تھے اور ابراہیم بن کالب اس صورت حال سے حیرت زدہ سا ہو رہا تھا۔ دعائیں اتنی جلد اثر دکھائیں گی' اسے یقین تو تھا مگر خود پر اس کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ اسے لگا' ہونٹ بار بار خشک ہو رہے ہیں جنہیں زبان پھیر پھیر کر تر کرنا ضروری تھا۔ کبھی اسے لگتا' کوئی اندر سے کہہ رہا ہے۔ ''ابراہیم بن کالب' تم تو صرف عالم کی گنتی پوری کرنے کے لیے لائے گئے ہو پھر دھکیل دیے جاؤ گے۔ کاہن تو نہ جانے کون بننے والا ہے؟'' اس کے ساتھ ہی اسے لگتا' کوئی اندر سے ہی اطمینان دلا رہا۔ ''کیا تم بھول گئے کہ خاندان بنی لاوی کے لاتعداد اور جوان بھی صاحب علم ہیں اور یہاں موجود تھے مگر موسیٰ کا رب ہی تم کو طویل سفر سے یہاں لایا اور تم اندر تک آگئے۔'' ابھی امید و بیم کی یہ کیفیت جاری تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے طشت کا پانی ساکت ہوگیا' تب بوڑھے مجاور نے آواز بلند کی اور چلا کر بولا۔

''خاندان بنی لاوی کے معزز عالمو.....! اپنے اپنے قلم آہستگی سے پانی میں ڈال دو۔'' یہ آواز سنتے ہی ان بارہ عالموں نے اپنے اپنے قلم اس پانی میں ڈال دیئے۔ اس وقت بیت المقدس میں موجود ہر فرد کی نظریں اس طشت پر مرکوز تھیں اور سب علماء کے قلم تیزی سے چکر کھا رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد کوئی بھی قلم پانی کی سطح میں جا کر کسی بھی عالم کو مایوس کر دیتا اور قلموں کی تعداد گھٹ جاتی۔ یوں تعداد گھٹتی رہی' ایک...... دو...... تین...... چار......اور دیکھنے والے محو دید رہے۔ سب عالم پلکیں جھپائے بنا پانی کو دیکھ رہے تھے یا قلموں کو دیکھ رہے تھے یا پھر ان کی نظریں محض اس قلم کے لیے بے چین تھیں جو واحد تیرتا ہوا رہ جاتا اور اس جلیل القدر منصب کا اعلان کر دیتا۔ گیارہ قلم ڈوب گئے اور ایک قلم تیرتا رہ گیا۔ اس وقت ابراہیم بن کالب کو لگا کہ بصارت سے زیادہ سماعت نے کام کیا ہے اور بے شمار آوازوں میں سب سے پہلے آنے والی آواز الیش بن کالب کی تھی۔ اس نے خوشی سے مغلوب آواز میں لوگوں سے کہا۔

''دیکھو' دیکھو' ابراہیم بن کالب کا قلم پانی پر تیر رہا ہے۔''

''ہاں دیکھو' ابراہیم بن کالب کا قلم تیرتا ہوا رہ گیا۔'' کئی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر تو جیسے شور مچ گیا۔ اس وقت ابراہیم بن کالب کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی اور ہر طرف کی آوازیں سنتے ہوئے وہ خود کو سنبھال رہا تھا اور اس کا قلم ابھی تک پانی پر تیر رہا تھا۔ لوگ جگہ بنا بنا کر اس کی طرف آ رہے تھے اور اسے مبارک باد دے رہے تھے۔

''بیت المقدس کے عظیم کاہن ابراہیم بن کالب۔''

دیر تک نام پکارا جاتا رہا۔ جو لوگ خوش نہیں تھے' وہ صرف ناکام ہونے والے تھے۔ ایسے میں کامیاب ہونے والوں کے شور میں وہ بھی گم ہو کر رہ گئے اور صرف ایک ہی نام لیا جا رہا تھا جسے سن سن کر ابراہیم بن کالب کا یقین دعاؤں کی قبولیت پر بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں رَب کا شکر ادا کر رہا تھا۔ اسے بیت المقدس کا کاہن منتخب کر لیا گیا تھا۔ اب لوگ اسی وقت حلف وفاداری چاہتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے صحن کا منظر بدل گیا پانی کے طشت کے ہٹاتے ہی چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے ہونے والے سرک سرک کر صحن کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے لگے تاکہ وفاداری کا حلف اٹھاتے ہوئے عالم کو دیکھ اور سن سکیں۔ اس وقت حلف لینے والے جلیل القدر عالم اور یہ اقرار سننے والے لاتعداد افراد موجود تھے۔ ابراہیم بن کالب کو ان سب کی موجودگی میں وہ قسم کھانی تھی جس پر ایک کاہن کی حیثیت سے عمر بھر عمل کرنا تھا۔ چند لمحے وہ خود کو سنبھالتا رہا۔ اس دوران کسی عالم نے جا کر بیت المقدس کے خاص حصے میں بخور جلایا جس کی خوشبو سے صحن مہک گیا۔ اسی جگہ ایک بڑے طاق میں ایک فرشتے کا مجسمہ اپنے ہاتھ میں موم بتی لیے کھڑا تھا۔ اس موم بتی کو نئے کاہن نے خود جلا کر موسیٰ کے رَب سے قسم کھائی اور اب اسے یہاں موجود سب لوگوں سے عہد کرنا تھا۔

یہ رسم بڑی مقدس تصور کی جاتی تھی اور اس وقت بھی سب بڑے شوق اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ ابراہیم بن کالب نے اس موم بتی کو روشن کیا۔ اس وقت بیت المقدس کی معزز عورتیں مبارک بادی کا گیت گانے لگیں۔ کچھ نے اپنے ہاتھوں میں اگر بتیاں لی ہوئی تھیں اور حلف لینے والے عالم تیزی سے اس خاص حصے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں فرشتے کے سفید پیکر کے ہاتھ میں موم بتی تھی اور بخور کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ یہ عالم ابراہیم بن کالب کے دائیں اور بائیں اور عقب میں کھڑے ہو گئے تب اس نے اس مقدس صحن میں جمع سب کو دیکھا اور مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''محترم و بزرگ علما! آپ سب کی موجودگی میں موسیٰ کے رَب نے جس طرح مجھے یہ منصب سونپا' آپ سب گواہ ہیں۔ بے شک اس معزز خاندان میں سب ہی مجھ سے زیادہ قابل اور عالم ہیں مگر موسیٰ کے رَب نے میرا انتخاب کیا ہے تو میں اسی جلیل القدر رَب کی قسم کھا کر' آپ سب کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ بیت المقدس کے کاہن ہونے کا پورا پورا حق ادا کروں گا۔ میں آپ سب کی زندگیوں کو اپنی زندگی پر' آپ سب کے نفع کو اپنے نفع پر آپ سب کے حقوق کو اپنے حقوق پر ترجیح دوں گا۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام احکامات پر عمل کروں گا اور آپ سب کو بھی اسی کی ہدایت دوں گا۔''

•......•......•......•

اس بار گھر کی طرف جاتے ہوئے ابراہیم کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ کل تک وہ صرف خاندان بنی لاوی کا ایک صاحب علم جوان تھا لیکن اب ایک دم سے ہی بیت المقدس کا وہ عظیم کاہن بن گیا تھا جسے بادشاہ بھی سلام کرتا تھا۔ یہ وہ بلند ترین منصب تھا جس کے لیے بنی لاوی کا ہر مرد عمر بھر محنت کرتا تھا' تمنا کرتا تھا مگر محروم رہ جاتا تھا کیونکہ یہ منصب صرف ایک کو ملتا تھا۔ باقی محنت کرنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ منصب سے ناموری اور عزت ملتی ہے۔ دنیا کی نظر اسی پر ہوتی ہے۔ اس میں پنہاں آزمائشوں اور فتنوں کا احساس ان سے گزرے بغیر کسی کو نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے گھر تک پہنچنے سے قبل یہ خبر علاقے بھر میں عام ہو چکی تھی اور انہیں یقین تھا کہ حمنہ اور زلیخا دوسری معزز عورتوں کی طرح گھر سے باہر ہی انہیں مبارک باد دیں گی لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئیں اور دلوں کے اندیشے دلوں میں چھپائے اردگرد پر نظریں ڈالتے وہ دونوں گھر تک پہنچ گئے۔ اپنے گھوڑے اور دیگر اشیا غلام کے حوالے کر کے وہ دونوں بڑا احاطہ پار کر کے گھر میں داخل ہوئے تو دروازے پر خدمت گار لونڈی کے ساتھ صرف زلیخا نے لوبان جلا کر اس کا استقبال کیا اور بولی۔

''زلیخا بیت المقدس کے عظیم کاہن کو سلام پیش کرتی ہے اور مبارک باد دیتی ہے۔''

اس کے جواب میں ابراہیم نے بڑے مضطرب سے انداز میں ان کے سر پر ہاتھ رکھا' دعا دی۔ لونڈی کو بھی دعا دی۔ حمنہ کی غیر موجودگی ان دونوں کو متردد کر رہی تھی۔ الیش بن کالب نے کہا۔

''کیا یہ سلام اور مبارک باد معزز کاہن کی زوجہ کو پیش کرنا نہیں چاہیے تھا؟''

یہ سوال تھا' استفسار یا اپنے اضطراب کا اظہار' جو بھی تھا' زلیخا نے اسے محسوس کیا اور بولی۔

''یقیناً انہیں یہاں موجود ہونا چاہیے تھا لیکن علاقے کے معمر حکیم نے انہیں چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔ موسیٰ کا رَب معزز کاہن کو کہانت کے بلند مرتبے کے ساتھ ساتھ اولاد کی نعمت بھی عطا کرنا چاہتا ہے۔''

اس وقت الیشں بن کالب نے حیرت اور مسرت سے دیکھا اور ابراہیم بن کالب کو لگا کہ ہر طرف گھنٹیاں بج رہی ہیں' رگ رگ میں سنسنی سی دوڑ رہی ہے۔ کس قدر مایوسیوں کے بعد ایک دم ہی ہر خوشی مل گئی تھی۔ اس دن اپنی خواب گاہ میں جانا اسے عجیب لگ رہا تھا جیسے وہ حمنہ کو پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ حمنہ نے اسے بتایا کہ ان دونوں کے سفر پر جانے کے کچھ دن بعد ہی اس کی طبیعت خراب ہوئی تو حکیم نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ گویا کہ وقت کا بڑا حصہ گزر چکا تھا اور کم وقت باقی تھا۔ اس وقت بیت المقدس کا یہ جلیل القدر عالم اور عظیم کاہن اپنی دوسری آرزو کی تکمیل میں بے چینی سے گھڑیاں گننے لگا۔ موسیٰ کے رب نے دونوں خوشیاں ایک ساتھ ہی عطا کردی تھیں۔

کہتے ہیں' منصب مانگنے والے کو آزمائش ملتی ہے' شہرت طلب کرنے والے کو بدنامی اور دولت طلب کرنے والے کو ہوس مگر پھر بھی انسان کے دل میں یہ تمام آرزوئیں مچلتی رہتی ہیں' دولت' نام وری اور عزت۔ انسان ان خواہشات پر کبھی قابو نہیں پاسکتا۔ کبھی ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ ابراہیم بن کالب بھی انسان تھا اور اس کے علم کی بدولت اس منصب پر اس کا حق بنتا تھا' اولاد کی تمنا بھی اس کے خیال میں جائز تھی۔ اس دنیا میں کوئی شخص ایسا ہوا ہی نہیں جس نے اولاد کی آرزو نہ کی ہو۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھا اور پھر انسان ہے بھی عجیب و غریب مخلوق' بے پناہ نعمتوں کے حصول کے باوجود ایک کمی کو اپنی محرومی بنالیتا ہے پھر ہر کوشش' ہر خواہش اور ہر کاوش اسی کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ ایسے میں دعا' دوا اور علم و عمل کی سب صلاحیتوں کو اسی کے لیے آزماتا ہے اور ان لاتعداد نعمتوں کو بھول جاتا ہے جن کا شکر اُدا کرنا واجب ہوتا ہے۔ یوں عمر بھر شکر اُدا نہیں کرتا' بس مانگتا ہے' التجائیں کرتا ہے' گڑگڑاتا ہے اسی لیے کبھی کبھی بڑی دعاؤں کے بعد کوئی خواہش کسی بہت بڑے نقصان کے ساتھ پوری ہوجاتی ہے اور انسان کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ ابراہیم بن کالب نے بھی پندرہ برسوں میں صرف محرومی کو محسوس کیا تھا' کہانت کے منصب کی تمنا کی تھی۔ اور جبل موسیٰ پر جاکر نفع ہی نفع کی بات کی تھی۔ اس کے عوض نقصان کو بھول گیا تھا اور موسیٰ کے جلیل القدر رب نے اس کی دُعا قبول فرما لی تھی۔ منصب عطا کردیا تھا مگر آزمائش کے ساتھ جس کے بارے میں اس عالم نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ بس اب وہ بے چینی سے اولاد کا منتظر تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وقت کا انتظار کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ اس کے جلو میں کیا' کیا آنے والا ہے؟ اسے بھی اندازہ نہ تھا۔

سب ہی مگن تھے' سب ہی خوش تھے۔ لاثان اور باران خاندان بنی لاوی کے دو بیٹے ان کی توجہ کا اور تیسرا آنے والا ان کے انتظار کا مرکز تھا۔ وہ جو بھی تھا' بیٹا یا بیٹی' یقیناً اس گھر کو خوشیوں سے بھر دینے والا تھا۔ وہ سب جب ساتھ ساتھ ہوتے' یہی موضوع چھڑ جاتا۔ الیشں بن کالب کہتا۔ ''اگر مقدس کاہن کو موسیٰ کے رب نے بیٹا عطا کیا تو ہم اس کا نام ''یعقوب'' رکھیں گے۔''

ایسے میں زلیخا کہتی۔ ''اگر بیٹی ہوئی تو میں اس کا نام ''حوا'' رکھوں گی۔ ''حوا'' کے معنی ہیں' خواہش' تمنا' آرزو۔'' اس وقت سب ہنس دیتے۔ نام بھی عجیب تھا اور معنی بھی عجیب۔ یہ سب باتیں خوشیوں کا اظہار کرتیں۔ وہ سب ہی بے چین سے انتظار کررہے تھے۔ وقت گزرا اور بیت المقدس کے کاہن کو ذہنی مصروفیت دے گیا۔ اب اس کا زیادہ وقت اس مقدس گھر میں گزرنے لگا اور الیشں بن کالب ایک طویل سفر کے بعد آرام کرکے تھکن اتارنے میں مصروف تھا۔

ایسے میں موسم نے اپنے انداز بدلے۔ کسی پر خوشگوار اثر ڈالا' کسی کو لپیٹ میں لے لیا۔ ایسے میں کسی نے محسوس بھی نہ کیا جب اپنی ذات سے بے نیاز ہوکر کام کرنے والی زلیخا کو ٹھنڈ لگ گئی۔ بات تو کچھ بھی نہ تھی' موسم اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ لوگ نزلہ' بخار کا شکار ہورہے تھے لیکن اس بار مرض کی نوعیت کچھ اور تھی یا زلیخا نے ہی بے پروائی اختیار کرلی تھی کہ وقت گزرتا رہا' طبیب آتے گئے' علاج بدلتے گئے' سب مرض کی نوعیت پر گفتگو کرتے رہے مگر موت کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ سب دیکھتے ہی رہ گئے اور زلیخا ڈیڑھ ہفتے کی جان لیوا تکلیف کے بعد پانچ سالہ لاثان اور دودھ پیتے باران کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ ابراہیم اور حمنہ کی کاوشیں' الیشں بن کالب کی محبتیں اور معصوم بچوں کی بے بسی' کوئی بھی اسے نہ روک سکا۔ سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت جیسے ختم ہوگئی تھی۔ جو جہاں تھا' جیسے اپنی جگہ ایک پتھر تھا۔ ہاں' لاثان یا باران روتے تو انہیں لگتا' اس گھر میں زندگی موجود ہے۔ ابراہیم بھی چونک جاتا اور حمنہ بھی ہوش میں آکر ان بچوں کو سینے سے لگا لیتی۔ یوں بھی اب وہ دونوں اسی کی گود کے ہوکر رہ گئے تھے اور الیشں بن کالب اس کمرے کا جس سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

وہ تکیے میں منہ دے کر لیٹتا تو وقت کا پتا ہی نہ چلتا اور ابراہیم اس کی تنہائی پسندی سے گھبرا کر اسے سفر کے مشورے دیتا لیکن اس کے جانے کے تصور سے خود ہی گھبرا جاتا۔ لگتا تھا' غم ان سب کے اندر بیٹھ گئے ہیں کہ وہ سب خود سے بھی ڈرنے لگے ہیں یوں جیسے ایک دوسرے سے منہ چھپا رہے ہیں۔ ان ہی دنوں ایک بڑے میلے کا اعلان ہوا۔ تاجر لوگ مختلف علاقوں سے مال لے کر اس میلے میں جاتے اور اپنی دکان لگاتے۔ الیشں بن کالب ایسے میلوں میں جا جا کر بہت نفع کما لاتا تھا۔ اس وقت مال سے زیادہ سوچوں اور صحت کے لیے یہ سفر ضروری تھا' شاید اس بات کو اس نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ بہت کم وقت میں اس سفر کا فیصلہ ہوگیا اور لاثان کو پیار کرکے' باران کو چومتے ہوئے اس نے حمنہ کو دیکھا' ہنسنے کی کوشش کی' حمنہ نے آنسو پیتے ہوئے دُعا دی تب وہ ابراہیم سے گلے ملتے ہوئے ایک اچھے وقت پر ملنے کی تمنا لیے رخصت ہوگیا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ وقت کے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہیں جو ابراہیم کے سینے میں پیوست ہونے والے تھے؟ ایک خوشی کے انتظار میں انسان کتنے غم جھیل جاتا ہے' شاید جھیل کر ہی اندازہ ہوتا ہے۔

الیشں بن کالب چلا گیا۔ چند ہفتوں کا سفر تھا۔ یہ وقت ان سب نے ہی بڑی بے چینی سے گزارا۔ کسی نئی روح کی آمد کا تصور ہزارہا غموں میں بھی عجیب مسرت دیتا ہے۔ ابراہیم بھی خود کو بشاش رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت کا احساس اسے اب بھی تھا لیکن اس وقت کی قیمت ابھی ادا کرنی تھی۔ حمنہ کا پیر پھسلا اور وہ گر گئی۔ چیخ کی آواز نے سب کو متوجہ کرلیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر بھر گیا۔ خدمت گار لونڈی نے خدمت کی اور احباب نے خلوص کو آزمانے میں کمی نہ کی۔ اس وقت ان میں سے کسی کو بھی علم نہ تھا کہ جان کے

بدلے جان کا معاملہ ہے۔ وہ سب ہی حمنہ کو ہوش میں لانے اور نئی روح کے دنیا میں لانے کا اہتمام کر رہے تھے۔ دنیا میں آنے والی روح کو آنا تھا' وہ آ گئی مگر اس شب تمناؤں سے طلب کی ہوئی اور ارمانوں سے مانگی ہوئی اولاد نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا تو ہوش و خرد سے بے گانہ حمنہ نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ دیکھنے والے چیختے چلاتے رہ گئے' عورتوں نے غم اور بے ہوشی میں بال کھول کر منہ پیٹنے شروع کر دیئے مگر ابراہیم بن کالب اس نئے وجود کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ شاید انسان جتنے بلند منصب پر ہوتا ہے' اتنے ہی بڑے حوصلے کے ساتھ آزمائشوں سے گزر جاتا ہے۔ ابراہیم بن کالب' بیت المقدس کا عظیم کاہن ندامت خیز آزمائشوں سے گزر کر اس وجود کو تکتا رہ گیا جسے موسیٰ کے رب سے اس جلیل القدر نے باڑ پر جا کر مانگا تھا۔ ایک ننھا سا روئی کی طرح نرم وجود چھوٹی سی آواز' اس کا دل چاہا' اسے کلیجے میں اتار لے تب ہی خدمت گار لونڈی سیطہ نے کہا۔

''مقدس گھر کے جلیل القدر کاہن.....! آپ کو موسیٰ کے رب نے بیٹی عطا کی ہے۔''

''حوا!'' ابراہیم بن کالب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''حوا یعنی خواہش' تمنا' آرزو۔'' آنسوؤں سے نم یہ آواز کسی نے نہیں سنی' بس دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بنی لاوی کے عظیم کاہن نے اس نرم وجود کو سینے سے لگا لیا جسے باپ کے بوسے سے پہلے آنسو ملے تھے۔ ابراہیم بن کالب بہت بڑے غم سے گزرا تھا۔ ہمدردی کرنے والے بے پناہ محبتوں کے باوجود رخصت ہو گئے۔ اب غموں کو بانٹنے اور محبت کرنے والی ایک ہستی کا اسے شدت سے انتظار تھا۔ دل چاہتا تھا کہ گھڑی کی چوتھائی میں الیش بن کالب آ جائے اور وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنا سارا غم آنسوؤں میں بہا دے۔ دن ان تینوں کے کام کرانے اور ادھیڑ عمر سیطہ کو ہدایت دینے میں گزر جاتا اور رات میں ایک بازو کے ساتھ لاثان دوسرے بازو کے ساتھ ہاران اور سینے پر چھوٹی سی رضائی میں لپٹی حوا اسے مصروف رکھتی۔ خیالات کبھی ماضی اور کبھی حال کا احاطہ کرتے' کبھی کوئی پرانی یاد مضطرب کرتی تو کبھی حال کی کیفیت آنکھیں نم کر دیتی۔ ایسے میں مستقبل بھی اپنی کرن دکھاتا۔ وہ تصور ہی تصور میں الیش بن کالب کو واپس آتے ہوئے دیکھتا اور کہتا۔

'میرے بھائی! زلیخا کا نعم البدل نہیں مل سکتا مگر اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے۔ لاثان کو' ہاران کو اور حوا کو۔ پرورش اور نگہداشت کا کام صرف اور صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔' یہ سوچتے سوچتے اسے لگتا اب اسے صرف الیش بن کالب کی ضرورت ہے۔ اس کا انتظار ہے جس کے سہارے وقت گزارے۔ اب اس کے کان وہ دستک سننا چاہتے تھے جو الیش بن کالب کے آنے کی خبر دیتی۔

اور ایک رات دروازہ بجنے کی آواز نے اسے نیند سے چونکا دیا۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ آدھی رات گزر چکی ہے۔ الیش بن کالب کا آنا متوقع تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ کیا اس وقت دروازے پر متعین غلام موجود نہیں یا بہت گہری نیند سو گیا ہے جو آنے والے کو اتنے زور سے دستک دینی پڑی؟ جب تک ابراہیم بن کالب اٹھتا' سیطہ بڑے دروازے تک پہنچ گئی۔ اس وقت آنے والا الیش بن کالب نہیں بلکہ قافلے کے لٹ جانے کی خبر تھی۔

آنے والوں نے خبر دی کہ قافلہ منزل پر پہنچ کر لٹ گیا' میر قافلہ مارا گیا' مال لوٹ لیا گیا اور کچھ مسافروں کی حالت خراب ہے' ان میں الیش بن کالب بھی ہے۔ ابراہیم پر کیا گزری' یہ محسوس کرنے والا کوئی نہ تھا۔ تین کم سن بچوں کو سیطہ کے حوالے کر کے گھر سے قافلے کے پڑاؤ کے مقام تک وہ کس طرح پہنچا' شاید اسے خود بھی احساس نہ تھا' بس اسے اتنا ہی پتا تھا کہ الیش بن کالب اور اس کے ساتھیوں کو قزاقوں نے گھیر لیا۔ اس کے پہنچنے تک کچھ رخصت ہو گئے اور سانس توڑتا ہوا الیش بن کالب اس کے سامنے تھا مگر لگتا تھا' کچھ کہنے کی سکت نہیں ہے۔ وہ زخموں سے چور چور چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر سانس کھینچ کر بولا۔

''بھائی محترم.....! انسان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے' وہ فیصلہ اللہ ہی کا ہوتا ہے کیونکہ اس کی منشا و مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔'' یہ کہتے کہتے الیش بن کالب نے ہاتھ بڑھایا تو ابراہیم بن کالب نے یہ ہاتھ تھام لیا۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''آپ لاثان اور ہاران کا خیال رکھیے۔ حمنہ سے کہیے' انہیں ماں.....''

اس وقت بات پوری نہ ہوئی کہ عمر میں پہلی بار ابراہیم بن کالب بلند آواز سے رو دیا۔ کچھ کہنے یا وعدہ کرنے کا مقام ہی نہ تھا۔ کیسے کہہ دیتا کہ حمنہ تو خود ایک بڑی تمنا پوری کر کے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ان تین بچوں میں سے کسی کی بھی ماں نہیں ہے مگر وہ یہ بات کہہ نہ سکا اور روتا رہا۔ کہتا بھی کس سے' الیش بن کالب یہ سب سننے کو وہاں موجود نہ تھا۔ اس دن بیت المقدس کا عظیم کاہن اس کے جسد خاکی کو اٹھائے پلٹ آیا اور زلیخا اور حمنہ کی قبروں کے پاس ایک قبر اور بن گئی۔

•......•......•......•

وقت زخم دیتا ہے اور وقت ہی اسے بھر دیتا ہے' اس کا اندازہ انسان کو خود ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کو نہ زخم نظر آتے نہ ان کے بھر جانے کا احساس ہوتا۔ انسان خود گزرے وقت کی نشانیوں کو عزیز رکھ کر اسے بھول جاتا ہے یا صبر کر لیتا ہے۔

الیش بن کالب جسے اس نے بیٹوں کی طرح پرورش کیا تھا' اس خاندان کو دو بیٹے دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ابراہیم نے سوچا۔ ''قدرت کو یہی منظور تھا۔'' اب اس نے بچھڑے ہوئے بھائی کو ان دو بیٹوں میں پا لیا تھا۔ اسے بھولا نہیں تھا' بس سمجھوتا کر لیا تھا۔ حمنہ' اس کی عزیز بیوی' ٹوٹ کر محبت کرنے والی ساتھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ زندگی کا وہ عیش و آرام اسے لمحہ لمحہ یاد تھا۔ اس محبت' اس ساتھ سے وہ محروم ہو چکا تھا لیکن حمنہ کی نشانی موجود تھی جسے ہر محرومی سے بچانے کے لیے اس نے یہاں بھی سمجھوتا کر لیا تھا۔ ہاں' کبھی کبھی تنہائی کے لمحوں میں تعجب سے سوچتا۔

'کیا آرزوئیں یوں بھی تکمیل پاتی ہیں؟ تمنائیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں؟ کہانت کا مقدس منصب مانگا تو سب کچھ لٹ گیا۔ اولاد مانگی تو گھر میں اولاد کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔' یہ سب تصورات تنہائی میں متوجہ کرتے لیکن تنہائی کا وقت کم سے کم ہوتا گیا۔ کہانت کی ذمے داریاں اور بچوں کی موجودگی اسے مصروف کرتی رہی۔ سیطہ خادمہ بھی تھی اور ان بچوں کی ماں بھی۔ ان کی دیکھ بھال' کھانے پینے' کھیلنے اور سونے جاگنے کے اوقات کا خیال رکھنا اسی کی ذمے داری تھی۔ ہاں' ان سب کے مستقبل کے لیے سوچنا

ابراہیم بن کالب کا فرض تھا اور وہ ہمیشہ ایک ہی بات سوچتا' ایک ہی فیصلے کو دہراتا۔ 'ابراہیم بن کالب' بنی لاوی کے عظیم کاہن' تم خاندانی روایات کے مطابق بڑے فرزند کو عالم اور دوسرے کو تاجر بناؤ گے تاکہ تمہارے گھرانے کا ایک لڑکا ضرور کہانت کے مقابلے کے لیے موجود رہے۔ تمہارے باپ نے تمہیں عالم اور ایش کو تاجر بنایا' اب تم لاثان بن ایش کو عالم اور ہارون بن ایش کو تاجر بناؤ گے۔'

یہ آرزو کرتے وقت وہ بھول جاتا کہ اس گھر میں ایک بچی بھی ہے۔ اس کا بھی کوئی مستقبل ہے؟ اچھے سے اچھے علم کی تلاش صرف لاثان بن ایش کے لیے ہوتی اور تجارتی فن میں طاق کرنے کے لیے ہارون بن ایش پر توجہ دی جاتی۔ بے پناہ محبت کرنے والا باپ اس کم سن بچی کو سینے سے لگا کر سوتا۔ اس کی غذا' اس کے لباس کا سب سے بہتر انتظام کرتا لیکن وہ کیا چاہتی ہے' کس بچے کے ساتھ خوشی محسوس کرتی ہے' اس علیل القدر عالم کی نظر وہاں تک جاتی ہی نہ تھی۔ یوں وقت گزرتا گیا' ابراہیم بن کالب بیت المقدس کے کاموں میں مصروف ہوتا گیا اور بچے تیزی سے بڑے ہوتے گئے۔

علاقے کے کتب سے تعلیم پانے کے بعد اب لاثان بن ایش کو مزید علم کی ضرورت تھی۔ یوں بھی گھر میں کیا تھا جو وہ وقت گزاری کے لیے رہتا؟ اب اسے لمحہ لمحہ ابراہیم بن کالب کے ساتھ رہنا تھا۔ اب علاقے کے کتب میں دوسرے بچوں کے ساتھ ہارون جاتا' ھوا جاتی اور ان کی عمر کے چند بچے ان کے پاس آتے۔ یہ سب بھی بڑھتے' کبھی تصویریں بناتے۔ ہارون لکڑی کے کھلونے بنا کر ان پر روغن کرتا تو ھوا کو یہ سب اچھا لگتا۔ یوں بھی اپنے سے عمر میں کئی برس بڑا سنجیدہ سا لاثان اسے مسرور نہ کرتا۔ ہاں' ہارون چست' پھرتیلا' غصے اور محبت کا بے تکلف اظہار کرنے والا جو علم اور کھیل میں توازن رکھتا' اسے اچھا لگتا تھا۔ چند دن لاثان ابراہیم بن کالب کے ساتھ بیت المقدس میں رہا تو ھوا کو جلد ہی اس صورت حال کی عادت پڑ گئی۔ ہارون نے الجھتے ہوئے کہا۔

''ھوا لاثان اب کئی کئی دن کے بعد گھر آئے گا۔ تمہیں وہ یاد آتا ہے؟ میں تو اس کے بغیر اداس ہوں۔''

''میں اداس نہیں ہوں۔'' ھوا نے لکڑی کے گھوڑے پر روغن کرتے ہوئے کہا۔ ''لاثان ہمارے ساتھ کھیلتا نہیں' بس پڑھتا ہے۔ تم میرے ساتھ کھیلتے ہو' تم تو نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں۔'' ہارون نے اپنے طور پر فیصلہ کیا۔ ''ہم دونوں یہاں رہیں گے۔''

ھوا خوش ہو گئی۔ کتب اور گھر میں وہ دونوں ساتھ ہوتے' ساتھ کھیلتے۔ ہارون کوئی نئی بات سیکھتا تو اسے ضرور سکھاتا اور وہ خود بھی جو کام کرتی' اسے بتاتی۔ ابراہیم بن کالب ان پر دولت لٹاتا' انہیں خوش رکھنے کو سب کچھ کرتا۔ جب مقدس گھر سے واپس اپنے گھر آتا تو اسے لگتا' صرف یہی بچے ہیں جو اس کا دامن کھینچ لیتے ہیں۔ وہ تمام وقت ان میں گزارتا' ان کے کھیل دیکھتا' ان کے پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لیتا اور انہیں ڈھیروں نعمتیں دے کر پھر چند دن کے لیے چلا جاتا اور وہ خود مصروف اور بچے پھر ایک دوسرے میں گم ہو جاتے۔ اب وہ دونوں لاثان کو دیکھ کر خوش ہوتے مگر اس کی محفلیں دیر تک انہیں مسرور نہ کر سکتیں۔

لاثان کا راستہ جدا ہو چکا تھا جو بہت کشادہ' بہت طویل تھا۔ ابراہیم بن کالب بھی علاقے کے لوگوں میں بیٹھ کر اس کی باتیں کرتا تو وہ سب حیرت سے دیکھتے۔ توریت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ بہت جلد خاندان بنی لاوی کا فرد ہونے کے باعث مزید تعلیم کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اس انتخاب کے لیے بھی امتحان ہوتا تھا جس میں بنی لاوی کے خاص خاص لڑکے ہی شریک ہوتے اور چند ایک ہی کامیاب ہوتے تھے اور اس برس بارہ سالہ لاثان بن ایش نے اپنی قابلیت سے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور آئندہ کے لیے بیت المقدس کے مصلیوں نے اسے تعلیم و تربیت کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ ابراہیم بن کالب کی خوشی کی انتہا نہ تھی' وہ خود کاہن تھا اور اس کا ہونہار بھتیجا کاہن بننے والا تھا۔ اسے لگا' مستقبل محفوظ ہے۔ بنی لاوی کے خاندان کی عزت اور شان سب اسی کے دم سے ہے۔

اس بار وہ گھر آیا تو علاقہ بھر کے لوگوں نے حاضری دی' سلام پیش کیا اور مبارک باد دی۔ ان سب کو لگا کہ لاثان بن ایش' ابراہیم بن کالب کے لیے لازم و ملزوم بن چکا ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ بیت المقدس کا یہ عظیم کاہن اٹھتے بیٹھتے اسے کہانت کے اصول سمجھاتا' لوگوں سے محبت کی تعلیم دیتا' انصاف اور اخلاق کے درس دیتا' یہ باتیں ہارون بھی سنتا اور ھوا بھی لیکن ھوا کے سر سے گزر جاتیں۔ ہاں' ابراہیم بن کالب کا قرب اسے اچھا لگتا۔ اس کی موجودگی اسے بہت بھاتی' کبھی کبھی وہ اس کے قریب ہو جاتی' بازو ہلا ہلا کر یا اس کی داڑھی کو چھو کر پوچھتی۔

''بابا جان..... آپ کو سب سے زیادہ کس سے محبت ہے؟''

تب ابراہیم بن کالب اسے بازو کے حلقے میں لے لیتا' اس کے نرم نرم بالوں کو چومتا اور کہتا۔ ''ہمیں سب سے زیادہ محبت اپنی بیٹی سے ہے۔''

''اور اس کے بعد؟'' وہ سب کو فخر سے دیکھتے ہوئے دوسرا سوال کرتی۔

''اس کے بعد بھی اپنی بیٹی سے۔'' ابراہیم سچ کہتا۔

''اور اس کے بعد؟'' وہ پھر سوال کرتی۔

''اپنی بیٹی سے۔''

یوں سوال اور جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سب ہنستے مگر یہ حقیقت تھی کہ ابراہیم بن کالب کو ھوا سے حد درجہ محبت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس سے بات کرتے کرتے بھی کبھی کبھی وہ چونک جاتا۔ اسے لگتا' کسی نے کہا ہے۔

'ابراہیم بن کالب' اپنے خاندان کے اس آخری بیٹے کی کہانت اور منصب کے لیے تمہیں ابھی سے محنت کرنا چاہیے۔'

تب وہ لاثان بن ایش کو ایک دم ہی کوئی نیا درس دینے لگتا۔ ھوا پر سے گرفت کم ہو جاتی اور اسی وقت ہارون کو نزدیک آتا دیکھ کر ھوا بھی جیسے سب کچھ بھول جاتی۔ لمبے قد کا دبلا پتلا کتابوں میں گم اور ہر دم کہانت کے آداب سیکھنے والا لاثان اسے متوجہ نہ رکھتا اور بابا جان بھی مصروف ہوتے تب ہارون کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہی ساتھی تھا' وہی دوست اور وہی پناہ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ساتھ مضبوط ہو رہا تھا' انسیت بڑھ رہی تھی' ایک دوسرے کا ساتھ ضروری بنتا جا رہا تھا' سب کی دنیا وسیع ہو رہی تھی لیکن ھوا کی دنیا سمٹ کر صرف ہارون تک محدود ہو رہی تھی۔ بابا جان مصروف تھے' کوئی بات

نہیں۔ لاثان چلا گیا' اب آتا بھی تو اہم نہ لگتا۔ علاقے کے بچے کبھی ملتے' کبھی نہیں لیکن ہاران ساتھ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہ جذبہ پختہ ہوتا گیا اور اسے اندازہ ہی نہ ہوا۔ ہاں' جس دن ابراہیم بن کالب نے اعلان کیا۔

''ہاران..... !تمہاری علاقے کے مکتب کی تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ اب تمہیں فنِ حرب کی تربیت کے لیے جانا ہوگا۔''

ھوا نے چونک کر دیکھا' ہاران بھی اسی کو دیکھ رہا تھا مگر بابا جان سے کچھ کہنے کی ہمت اس میں نہ تھی لہٰذا یہ کام اس نے کیا اور بولی۔

''بابا جان..... !ہاران کو فنِ حرب کی تربیت کیوں لینی ہے؟ وہ تو تاجر بنے گا۔''

''ہاں بیٹی..... !'' ابراہیم بن کالب نے پیار سے کہا۔ ''مگر کبھی کبھی تجارت میں بھی مقابلہ اور لڑائی کی ضرورت پیش آ جاتی ہے لہٰذا فنِ حرب کی تربیت تو ہر لڑکے کے لیے ضروری ہے۔''

یہ آخری فیصلہ تھا گویا کہ ہاران بن ایش کو گھر سے جانا تھا۔ اس وقت ھوا کو لگا کہ ایک طویل ساتھ ہے جو چھوٹنے والا ہے۔ اتنا وقت تو اس نے ابراہیم بن کالب کے ساتھ بھی نہیں گزارا تھا لہٰذا اداسی لازمی تھی۔ اس نے کہا۔

''بابا جان..... ! میرے ساتھ کون کھیلے گا؟ کون پڑھے گا؟''

''بیٹی..... !تم کسی بھی لڑکی کو دوست بنا لو۔'' ابراہیم بن کالب نے اطمینان سے کہا۔ ''علاقے میں بہت سے گھر ہیں' بہت بچے ہیں' سب ہی تمہیں جانتے ہیں مگر ہاران کو تو شہ سواری اور شمشیر زنی ضرور سیکھنی ہے ورنہ وہ کسی بھی دشمن سے ہار جائے گا۔''

شاید ہاران نے اس بات کو سمجھ لیا تھا۔ وہ بس افسردہ تھا' اداس تھا۔ ابراہیم بن کالب نے اسے پیار سے دیکھا اور بولا۔

''ہاران..... !سب ہی جوان گھروں سے جاتے ہیں' پڑھتے' لکھتے اور لڑائی کی تربیت لیتے ہیں پھر آ جاتے ہیں تو لگتا ہے' کل ہی واپس آ گئے۔ مستقبل بنانے کے لیے چند برس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور پھر تم تو گھر سے بہت دور نہیں جاؤ گے' ہفتے' پندرہ دن میں گھر آتے رہو گے اور یہ میرا وعدہ ہے کہ جس دن تم فنِ حرب کی تربیت مکمل کر دو گے' جو مانگو گے' ملے گا۔''

ایک وعدہ ہو گیا۔ ہاران رخصت ہو گیا اور ھوا چپ چاپ روتی رہ گئی۔ آنسو جو نظر نہیں آتے' سسکیاں جو سنائی نہیں دیتیں' بڑا دکھ دیتی ہیں۔ ایسے دکھ جو سمجھے جاتے ہیں نہ سمجھائے جاتے ہیں' صرف اپنا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ہاران کی رخصتی کا دکھ بھی صرف اسی کا سرمایہ تھا۔ کسی سمجھ دار آدمی کو اس سے غرض ہی کیا تھی' بڑوں کے نزدیک ایسی بچکانہ باتوں کی اہمیت ہی کیا۔ کبھی ڈانٹ دیا' کبھی سمجھا دیا۔ ان کے بس پردہ کتنی خواہشات پامال ہوتی ہیں' کتنے جذبات کچلے جاتے ہیں' کوئی نہیں جان سکتا۔ ابراہیم بن کالب جیسے جلیل القدر عالم کے نزدیک بھی یہ باتیں بچپن اور نا سمجھی تھیں۔ ہاران کے لیے تعلیم و تربیت لازمی تھی۔ عمر بھر کا سوال تھا' نسلوں کا دارومدار تھا اور یہ افسردگی چند دن کی بات تھی۔ شاید جذباتی عمر سے گزرنے کے بعد جذبوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی لہٰذا ہاران بن ایش چلا گیا۔

ھوا کو لگا جیسے اب وہ اکیلی رہ گئی ہے' تنہا رہ گئی ہے' کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا' یوں ہفتے کے ایک ایک دن کر کے سب دن گزر گئے۔ اس نے کچھ بھی نہ کیا' ہاں اس دن ابراہیم بن کالب کے

ساتھی لاثان اور ہاران دونوں آئے تو اسے لگا' خالی گھر میں بہار آ گئی ہو اور ہاران کو بھی محسوس ہوا کہ آج بہت خوش ہے' مسرور ہے۔ اس دن وہ سب دنوں کی باتیں اسے سناتا رہا۔ فنِ حرب کی تعلیم اور یہ مکتب اس کے لیے نیا تھا اور ھوا کے لیے بھی۔ وہ دلچسپی سے یہ سب سنتی رہی اور سمجھ ہی نہ سکی کہ یہ باتیں اچھی لگ رہی ہیں یا یہ ساتھ خوشی دے رہا ہے؟ دن گزرا' رات بیتی اور ہاران پھر چلا گیا مگر اس بار وہ اس طرح نہیں روئی نہ اس نے بابا جان سے ضد کی بلکہ روانگی کے وقت سے ہی آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اب یہ ان سب کی زندگی کا معمول بن گیا کہ ایک ہفتے میں صرف ایک رات گزارنے آتے اور دوسرے دن صبح کی روشنی ہوتے ہی چلے جاتے۔

ایسے میں ابراہیم بن کالب حسب دستور کہانت کے آداب پر ہدایت دیتا رہتا' لاثان بن ایش اس منصب کے لیے دن رات مصروف رہتا اور ہاران اس کے ساتھ ساتھ اس سے ان اچھے دنوں کی باتیں سنتا اور اپنے اچھے دنوں کی لمحے لمحے کی باتیں اسے سناتا۔ اس طرح آنا جانا ہوتا رہا اور وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔

اس وقت نے کتنی خواہشات کو مٹا کر کتنے جذبوں کو جنم دیا' کسی کو پتا نہ چلا۔ ھوا کیا سوچتی ہے' یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس اسے خود لگتا کہ اس کا ہر تعلق' ہر خوشی اور ہر رشتہ صرف ایک نام ہے' ہاران بن ایش' جس کی گرفت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ دل و دماغ کو اس سوچ' اس تصور سے آزاد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ کوئی یاد یا تصور نہیں' اس کا دل ہے' اس کی سوچ ہے۔ وہی اس کا پہلا ساتھی تھا اور وہی اس کا ہر ساتھی تھا۔ بابا جان کا تصور بھی کہیں دھندلا گیا تھا۔ اس کی جگہ ایک معروف ترین کاہن نے لے لی تھی۔ وہ کاہن جس پر سب کا حق تھا جو اب مستقبل کا کاہن بنانے میں اس قدر معروف تھا کہ بے پناہ محبت کے باوجود بھی اپنی بیٹی کو وقت نہیں دے سکتا تھا مگر اسے کوئی گلہ نہیں تھا۔ وقت نے اسے ان سب کی مجبوریاں سمجھا دی تھیں اور اس کی سوچوں کا بھی تو ایک مرکز تھا جس سے اس نے ابتدائی سانس سے محبت کی تھی اور عمر نے اس محبت کو پختہ کر دیا تھا۔

بہت سا وقت گزر گیا' سیطہ تھکتی گئی۔ اب خدمت کے لیے کسی نئی خادمہ کی ضرورت تھی لیکن مکتب چھوڑنے کے بعد ھوا سب کچھ خود کرنا چاہتی تھی۔ ایسی ہی ایک دوپہر تھی جب پورے گھر کی صفائی کے بعد وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی تہہ بنا رہی تھی۔ سیطہ کھانا بنا کر اپنے کمرے میں آرام کے لیے جا چکی تھی کہ بڑے پھاٹک پر گھوڑا رکنے کی آواز نے اس کی توجہ لوٹ لی۔ اسے لگا' کوئی مہمان ہے جو دور سے سفر کرتا ہوا آیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بڑے پھاٹک پر متعین خادم ایسے آنے والوں کو ٹھہرانے اور میزبانی کرنے کا ذمے دار تھا مگر گھوڑا رکنے کے چند منٹ بعد ہی اندر کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک پڑی۔ کیا خادم وہاں موجود نہیں تھا؟ اس بات سے زیادہ اسے اس بات کا تردد تھا کہ سیطہ بھی تھک کر آرام کرنے چلی گئی تھی اور اب شام سے پہلے جاگنے والی نہ تھی۔ دستک پھر ہوئی تب اس نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''ایک مسافر..... مصیبت زدہ..... پیاسا.....'' یہ آواز بھی عجیب تھی۔ ھوا پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا۔

''کیا بڑے پھاٹک پر خادم نہیں ہے جو تم یہاں تک چلے آئے؟''

''جناب! اس مسافر کی مصیبت سننے والا وہاں کوئی نہیں ہے' آپ ہی تھوڑا سا پانی پلا دیجیے۔''

ہوا گومگو کے عالم میں تھی' طویل گرم دوپہر' پیاسا مسافر لیکن لٹیروں کی بھی کمی نہ تھی اور پھر بڑے پھاٹک کا غلام کیا ہوا؟ ان سوچوں کے ساتھ ہی وہ اپنی آواز میں دبدبہ اور بے خوفی پیدا کرتے ہوئے بولی۔

''آپ بڑے دروازے پر ٹھہریں' میں آپ کو کھانا اور پانی بھجواتی ہوں۔''

''مگر مجھے یہاں بیٹھ کر کھانا ہے۔'' مسافر نے ضد کی تو ہوا چونک گئی۔ اب اسے دھکانے کی ایک ہی صورت تھی کہ اس علاقے کی سب عورتوں کی طرح وہ بھی اپنی مدد کے لیے اپنے مردوں کو پکارنے لگتی۔ بے شک وہ گھر میں موجود ہوں یا نہ ہوں' اس سے وہ ڈر کر بھاگ جاتا' اس وقت اس نے بھی بے ساختہ وہ نام لیا جو اسے بہت عزیز تھا۔ جس سے محبت اور اعتماد کا ہر رشتہ قائم تھا۔ اس نے زور سے کہا۔

''ہارون..... اِدھر آؤ' ذرا اس مسافر کو پانی پلا دو۔''

''اچھا' آتا ہوں۔'' اس جواب کے ساتھ اچانک دروازہ کھل گیا اور مسافر بھاگنے کی بجائے اندر آ گیا۔ ہوا نے اندر آتے ہوئے ہارون کو دیکھا۔ حیرت' مسرت اور ستائش کے جذبوں نے ایک ساتھ یلغار کی اور فضا قہقہوں سے گونج اٹھی۔ اس نے کہا۔

''اس طرح آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ یقین کرنے کے لیے کہ مصیبت کے وقت تمہارے لبوں پر ہمارا ہی نام آتا ہے۔'' ہارون نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

''واقعی یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ آپ کا ہی نام پکارا۔''

''کیا تم کوئی اور نام بھی پکار سکتی ہو؟'' ہارون نے پوچھا۔

''آج آپ لاثان اور بابا جان سے پہلے کیسے آ گئے؟'' اس نے بات ٹالنی چاہی تو ہارون نے کہا۔

''اب ہم کبھی نہ جانے کے لیے آ گئے ہیں یعنی فنِ حرب کی تربیت مکمل' اب شادی پھر تجارت۔''

اسی لمحے ہوا نے رخ موڑ لیا اور واپس جاتے ہوئے بولی۔

''آپ پہلے کھانا کھائیں گے یا سفر سے واپسی کے بعد مکمل کریں گے؟''

''کیا تم نے کھانا کھالیا؟'' ہارون نے پوچھا۔

''نہیں' سیٹھ کھانا کھا کر سونے چلی گئی اور میں دھلے ہوئے کپڑے سمیٹ رہی تھی کہ اس کام کے بعد کھاؤں گی۔''

''تو پھر آؤ پہلے کھانا کھاتے ہیں اور اس دوران ہم تمہیں اپنی شاندار کامیابی کے قصے سنائیں گے اور تم داد دو گی۔''

اس دن ان دونوں نے ہمیشہ کی طرح بہت سا وقت ساتھ گزارا' بہت ساری باتیں کیں جس طرح بچپن سے کرتے تھے لیکن ہوا کو لگا کہ آج خوشی کا کوئی اور انداز ہے۔ ہارون واپس آ گیا تھا مگر کبھی نہ جانے کے لیے اور عین اسی وقت خود ہارون یہی سوچ رہا تھا کہ اس بار ابراہیم کو وہ بات یاد دلائے گا جو اس نے فنِ حرب کی تربیت کے لیے جانے سے پہلے کہی تھی۔

''ہارون..... اِدھر تم اپنی تربیت مکمل کر کے آؤ گے تو جو مانگو گے' ملے گا۔'' اور ہارون نے اس وعدے کو دل پر لکھ لیا تھا۔ اس بار وہ یہ وعدہ یاد دلانے والا تھا۔ الغرض کہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مصروف' آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی موجودگی سے حظ اٹھا رہے تھے۔ ایسے میں انہیں خود اپنے جذبوں کو پہچان لینے میں دیر نہ لگی۔ جب ہوا کام میں مصروف ہوتی اور ہارون مدد کرتا تو انہیں لگتا' یہ وہ بچپن والی ہوا نہیں ہے نہ وہ سادہ سا ہارون جو مل جل کر کام کرتے تھے بلکہ اب ہر بات تفریر اور ساعت کی حد سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اب تفریر میں جتنے معنی ہوتے' ساعت میں اس سے زیادہ اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ ہوا کو لگتا' ہارون کے سانس لینے میں بھی سیکڑوں جذبے پوشیدہ ہیں' ہر بات بامعنی اور ہر کام بامقصد لگتا۔

یوں اس بار دونوں ملے تو جذبوں کے نئے نئے معنی آشکار ہوتے گئے اور انہیں لگا کہ شعور' سمجھ' عقل سب کچھ آنے سے قبل انہوں نے محبت کی ہے..... محبت..... پتا نہیں کی جاتی ہے یا ہو جاتی ہے؟ انہیں اس سے بھی غرض نہ تھی' بس انہیں تو لگتا تھا کہ محبت ان کے خون میں گردش کر رہی ہے' سانس کی آمد و رفت کے ساتھ جاری ہے' محبت کا تصور بڑا خوش آیند لگتا ہے جبکہ سامنے کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو۔ ہر دم ساتھ رہنے اور کھیلنے والے دو بچے اپنے سوا کسی کے بارے میں سوچتے ہی نہ تھے اور کس کے لیے سوچتے؟ اپنے سوا انہوں نے کسی کو دیکھا بھی نہ تھا۔ ایک ابراہیم بن کالب' بیت المقدس کا عظیم کاہن اور دوسرا لاثان بن ایش' مستقبل کا کاہن' ان دو کو فرصت ہی نہ تھی۔

اس بار ان دونوں کو آنا تھا مگر نہیں آئے۔ ہوا رات گہری ہونے تک انتظار کرتی رہی مگر خبر ملی کہ لاثان بن ایش کو تو بیت مقدس کی تعلیم کے ساتھ اب مقدس مقامات کی سیر بھی کرنی ہے۔ ایسے میں وہ سفر پر جانے والا ہے اور ابراہیم بن کالب طالبانِ علم کے اس قافلے کو روانہ کر کے ہی آئیں گے۔ ہوا کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اسے لاثان بن ایش کے نہ آنے کی پروا نہ تھی۔ ہاں' ابراہیم کا انتظار ضرور تھا جس کے لیے وہ نت نئے کھانے بناتی تھی' تیاری کرتی تھی۔ اگر ہارون نہ ہوتا تو شاید وہ افسردگی سے رو دیتی لیکن جس نے ہر اداسی اور ہر دکھ کے بعد اسے ہنسایا تھا' وہ اب بھی موجود تھا لہٰذا چند لمحے کی اداسی کے بعد وہ پھر ہنس دی اور وقت پھر گزرنے لگا۔

گھنٹے' دنوں میں اور دن' ہفتوں میں بیت گئے اور ایک دن ابراہیم بن کالب آ گیا۔ ہوا کو لگا' فضاؤں میں ٹھنڈک ہے' ہواؤں میں مہک ہے اور یہ دن خوشیوں سے بھرپور دن ہے۔ اب وہ تینوں ہوتے اور زمانے بھر کی باتیں۔ ہمیشہ ابراہیم کی توجہ لاثان کی طرف رہتی' اس کی تعلیم' کہانت کا مقدس پیشہ۔ خاندان بنی لاوی کا یہ جوان جس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں ہوا کو نہ اس جوان سے غرض تھی نہ کہانت کے مقدس منصب سے اور نہ خاندان بنی لاوی سے۔ ہاں' ابراہیم دیر تک لاثان کی باتیں کرتا تو اسے اچھا نہ لگتا۔ دل چاہتا کہ اب وہ ہارون کی باتیں کریں۔ ابراہیم بن کالب کو ہارون سے بھی اتنی ہی محبت تھی جتنی لاثان سے۔ وہ تینوں جمع ہوتے تو بہت ساری باتیں ہوتیں' ماضی کی' حال کی' مستقبل کی۔ ہوا سنتی' ان میں حصہ لیتی۔ اس دن ابراہیم نے

کہا۔

''موسیٰ کے رب سے دُعا کرو کہ وہ بنی لاوی کے جس لڑکے کو مستقبل کا کاہن بنائے' وہ لاثان بن ایش ہی ہو۔''

''کیوں بابا جان؟'' ھوا نے حیران ہوکر دیکھا۔ ''اچھا کام کرنے کے لیے کوئی بھی ہوسکتا ہے' لاثان ہی کیوں؟'' ابراہیم بن کالب نے ہنس کر اسے دیکھا۔ وہ جتنی حسین تھی' اتنی ہی معصوم بھی۔ ابھی وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ھوا نے نیا سوال کیا اور بولی۔

''بابا جان! آپ نے کہانت کے لیے لاثان ہی کا کیوں انتخاب کیا ہے؟ کیا ہارران ذہین نہیں ہے؟''

''ہارران لاثان سے بہت زیادہ حسین بھی ہے' ذہین بھی اور بہادر بھی۔'' ابراہیم بن کالب نے سمجھایا۔ ''لیکن بنی لاوی برسوں سے کہانت کے لیے بڑے بیٹے کو ہی تیار کرتے ہیں۔ میرے باپ نے مجھے علم دیا اور ایش کو تاجر بنایا۔ اب میں نے لاثان کو علم دیا اور ہارران کو تاجر بناؤں گا تاکہ ہمارے خاندان میں علم بھی رہے اور تجارت بھی۔''

''لیکن بابا جان' بنی لاوی میں جن کے ایک ہی بیٹا ہو' وہ کیا کرتے ہیں؟'' اس بار ابراہیم بن کالب بے ساختہ ہنس دیا۔ اسے لگا کہ ھوا کی معصومیت بھی ذہانت ہے جس پر وہ فخر کرسکتا ہے۔ وقت یونہی گزرتا رہا' ھوا کی معصومیت اور ہارران کی شرارتیں ابراہیم کو سارے غم بھلا دیتیں۔ اس دن وہ دھوپ کی زد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ھوا نے عقب سے آکر اس کی آنکھیں بند کر لیں۔ ایسے میں جب تک وہ پہچانتا نہیں تھا' وہ چھوڑتی نہیں تھی اور اس دن ابراہیم بن کالب بھی شرارت پر آمادہ تھا۔ اس نے کہا۔

''میں پہچان گیا' تو کون ہے' یہ ہاتھ ہارران کے ہیں۔'' اس وقت ھوا کا ہنسی سے برا حال تھا۔ ہارران نے یہ منظر دیکھا اور بولا۔

''نہیں' میں یہاں ہوں۔''

''اچھا؟'' ابراہیم نے تجاہل عارفانہ برتا اور شرارت سے بولا۔ ''تو پھر یہ لاثان کے ہاتھ ہیں۔''

''مگر لاثان کی کلائیوں پر تو بال ہیں؟'' لاثان نے مذاق سے اس کی بات کاٹی۔

''اوہو.....'' ابراہیم نے کہا۔ ''میں نے پہچان لیا' یہ ہاتھ سیطہ کے ہیں۔'' اب فضا قہقہوں سے گونج گئی۔ سیطہ بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی اور ھوا اور ہارران تو تھے ہی بہت خوش اور ابراہیم کو ان سب کی خوشیاں ہی اچھی لگتی تھیں۔ اس کا دل چاہتا کہ لاثان کو کہانت کے مزید علم کے لیے انتخاب کرلیا جائے اور ھوا کو ہر عیش نصیب ہو' ہارران بنی لاوی کا معزز تاجر کہلائے۔ ان سب کو دیکھ کر وہ بار بار تمنا کرتا۔ ایسے میں ہارران اسے اس کا پرانا وعدہ یاد دلانے کا موقع تلاش کرتا رہ جاتا۔ اس کا دل چاہتا' اسے کہے۔ ''بابا' ھوا میری زندگی ہے' اسے میں جان دے کر بھی حاصل کرنا اور خوش رکھنا چاہتا ہوں۔'' مگر یہ سب کہتے ہوئے وہ جھجک جاتا اور وقت ہاتھ سے نکل جاتا۔ آخر ایک دن اس نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے کہا۔

''بابا' آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے جب آپ نے کہا تھا کہ جب میں اپنی تربیت مکمل کر کے لوٹوں گا تو جو مانگوں گا' ملے گا؟''

''ہاں' ہاں مجھے اپنا وعدہ خوب یاد ہے۔'' ابراہیم نے یاد کیا۔ ''مگر تو کیا مانگے گا؟''

''جو مانگوں گا' وہ دے دیں گے؟'' ہارران نے پکا وعدہ لینا چاہا۔

''ارے' کیا تو مجھ سے پھر سے عہد لینا چاہتا ہے؟'' ابراہیم نے ہنس کر کہا۔ ''ارے پاگل' میں نے تو تیرے باپ کو بھی پالا تھا اور تجھے بھی۔ بھلا کیا کوئی اپنی اولاد کو مایوس کرتا ہے؟ میرے پاس جو کچھ بھی ہے' تم ہی لوگوں کا تو ہے اور تو کیا مانگنے والا ہے' کیا میں جانتا نہیں' میں تو تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔''

اس وقت ہارران کی آنکھیں چمک گئیں۔ اسے خوشخواہ ہی لگا کہ ابراہیم سب جانتا ہے۔ وہ جھینپ سا گیا اور اسے آزمانے کو بولا۔

''اچھا' بتایئے کہ میں آپ سے کیا مانگنے والا ہوں؟''

اس وقت ابراہیم نے اس خوب صورت جوان کو محبت سے دیکھا جو بلاشبہ بہت پیچیدہ' بہت حسین تھا' بہت ہنس مکھ تھا۔ چند لمحے محبت اور تجسس سے دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔

''اوشریر لڑکے! میں جانتا ہوں تو کیا مانگے گا۔ ایک لمبے تجارتی سفر کی اجازت۔''

ہارران بے ساختہ افسردہ سی ہنسی ہنس دیا۔ علم کے کمال کو پہنچ کر بھی یہ مقدس کاہن اپنی ہی اولاد کے جذبات سے ناواقف تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہا کہ کہہ دے۔ ''مجھے تجارتی سفر کی نہیں' ھوا کی ضرورت ہے' ھوا تو میری تمنا ہے' میری زندگی ہے۔'' مگر وہ یہ سب ایک دم سے کہہ نہ سکا اور کہنے کا موقع بھی نہ ملا۔ ھوا کھانے کی اطلاع دینے اسی طرف آرہی تھی' ان دونوں کو خوش و مسرور دیکھ کر وہ بھی مسرور ہوگئی۔

اس رات جب کھانے کے بعد وہ دونوں کھلے آسمان کے نیچے چہل قدمی کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے' عین اسی وقت ابراہیم اپنی خواب گاہ میں لیٹا ہوا ایش بن کالب سے کیے ہوئے وعدے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے مرتے ہوئے کہا تھا۔ ''لاثان اور ہارران کا خیال رکھیے گا۔'' اور اس خواہش پر ابراہیم نے عمر بھر عمل کیا تھا۔ انہیں خوش رکھنے کے لیے زندہ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ لاثان کو عالم بنانے کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور ہارران کی تعلیم اور حربی تربیت اسی محبت کا نتیجہ تھی۔ اس نے ہمیشہ ہی آرزو کی تھی کہ اس کے دونوں بھتیجے نامور عالم اور بڑے تاجر بنیں اور اب اس کی تکمیل کے لیے اس کے دل میں تمنا مچل رہی تھی کہ ہارران کو تجارتی سفر پر جانے کی اجازت دے دے اور ھوا اور لاثان کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کردے۔ اس کے خیال میں لاثان جیسا عالم اور سنجیدہ مزاج جوان ہی ھوا کی قدر کرسکتا تھا۔ وہ یہ سب سوچتا رہا' غور کرتا رہا مگر اسے پتا ہی نہ تھا کہ ان کی خوشی کیا ہے؟ ہاں' اگر وہ اس وقت کھلے آسمان کے نیچے خوش اور مسرور ہونے والے ان دونوں بچوں کو دیکھ لیتا تو شاید جان جاتا کہ ان کی خوشی کیا ہے لیکن والدین اولاد کو خوشیاں ان کی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے پیمانے سے ناپ کر دیتے ہیں۔ اس کا بھی اپنا پیمانہ تھا' وہ بھی ناپ کر دینا چاہتا تھا' پیاس بجھے نہ بجھے' یہ ان کا نصیب۔ یہ رات گزر گئی۔ دوسری صبح بہت بڑی خوشی لائی۔ لاثان بن ایش اپنے تعلیمی سفر سے واپس آگیا تھا مگر رات میں کس وقت آیا' یہ کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔ صبح ہارران نے تعجب سے کہا۔

''بھائی! آپ رات کس وقت آئے؟''

''تم سب آرام کر رہے تھے۔ میں نے بے آرام کرنا گوارہ نہیں کیا۔'' لاثان نے جواب

دیا۔"اور پھر راستے میں سرائے سے کھانا کھا کر آیا تھا لہٰذا خادم نے دروازہ کھول دیا اور میں آ کر لیٹ گیا۔"

حوا کو یہ بات عجیب سی لگی۔ بھلا اتنے عرصے بعد کوئی اپنے ہی گھر میں اتنے پھیکے انداز سے آتا ہے؟ مگر اس نے اس وقت کچھ نہ کہا' ہاں' جب ہاران سے کہا تو وہ بولا۔

"دراصل بھائی کسی کو بھی تکلیف دینا نہیں جانتے' وہ بہت عظیم ہیں۔ بس دینا جانتے ہیں' لیتے کچھ بھی نہیں۔"

یہ بات غلط نہیں تھی۔ لاثان بن الیش بے ضرر فطرت کا مالک تھا۔ علم کے سوا کسی شئے سے غرض نہ تھی۔ اپنی کوئی آرزو نہ تھی' کوئی طلب نہ تھی اسی لیے جب ابراہیم بن کالب نے کہا۔

"میرے بھتیجے لاثان بن الیش! تمہارے لیے میرے دل میں عجیب سی آرزو مچل رہی ہے۔ اگر میں تمہارے لیے کوئی فیصلہ کروں تو قبول کرو گے؟"

"بابا! آپ سے ہٹ کر نہ میں کچھ ہوں نہ میرا کوئی فیصلہ۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے اور مجھے آپ کا ہر حکم منظور ہے۔" لاثان نے کہا۔

"حکم نہیں' بس میری خواہش ہے کہ میں تمہیں حوا سے منسوب کردوں۔ اگر تمہاری کوئی اور پسند نہیں......"

"میری کوئی پسند نہیں۔" لاثان نے جواب میں جلدی کی۔ "آج تک حصولِ علم کے سوا میں نے کوئی آرزو بھی نہیں کی' یہاں تک کہ آج سے قبل میں نے حوا کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا لیکن اب جبکہ وہ آپ کی آرزو ہے تو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہستی ہو کر رہے گی۔"

ابراہیم بن کالب اس بھتیجے پر جتنا بھی فخر کرتا' کم تھا جس نے کم عمری میں ہی علم بھی حاصل کرلیا تھا اور تمام مقدس مقامات کی زیارتیں بھی۔ اب اسے کہانت کے منصب سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت فرماں بردار تھا' اطاعت گزار تھا۔ آج حوا کے مستقبل کی طرف سے وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

دوسرے دن سننے والوں نے اس اعلان کو حیرت اور خوشی کے ساتھ سنا جب بیت المقدس کے عظیم کاہن نے کہا۔

"میں نے اپنی تمناؤں سے مانگی ہوئی بیٹی کے لیے جس سے میں دنیا جہان میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں' ایک اعلیٰ ترین جوان کا انتخاب کرلیا اور وہ ہے میرا بھتیجا لاثان بن الیش۔"

اس وقت سب نے خوشی کا اظہار کیا' مبارک باد دی اور حوا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ نجانے غم کی کیفیت چھپانا چاہتی تھی یا آنسو روکنا مقصود تھا؟ ہاران بن الیش نے پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھا۔ ابراہیم بن کالب' اس کا عظیم چچا تھا' اس کا محسن تھا' مربی تھا جسے اس نے کبھی دکھ دینا نہیں چاہا تھا اور دوسرا لاثان بن الیش تھا۔ اس کا محبوب بھائی جس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا' کبھی ضد نہیں کی تھی اور اس کی خوشی اسے اپنی خوشی سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کا صحت مند چہرہ مسرور تھا۔ ہاران کو اس کی مسرت اچھی لگی۔ اس کے رخ کے گرد نور کا ہالہ اس کے پاکیزہ کردار کی گواہی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی محرومیوں' اپنے غموں کو ضبط کرتے ہوئے سوچا۔

'ہاران' بے شک حوا کو ایسے ہی پاکیزہ کردار جوان کی ضرورت ہے۔'

غرض کہ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جو مسرور تھے' مبارک باد دے رہے تھے اور جو غمگین تھے' غموں کے جام پی گئے تھے۔ غم کے جام پینا زہر کے جام پینے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ وہ تڑپے' مچلے اور موت کے سوا ہر اذیت سے گزر گئے اور کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔ سب نے اپنے اپنے انداز سے خوشی منائی مگر اس شام اندھیرا ہونے کے بعد ہاران بن الیش نے تاریکی کی زد میں کھڑے ابراہیم بن کالب سے کہا۔

"بابا' آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا کہ مجھے طویل تجارتی سفر کی اجازت دیں گے؟"

"تمہیں اجازت ہے بیٹے!" ابراہیم بن کالب نے تاریکی کے سبب اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور پیار سے بولا۔ "تمہاری خوشی میری خوشی اور تمہاری ترقی' میری ترقی ہے مگر تمہاری آواز کیوں رندھ رہی ہے؟"

"کچھ نہیں۔" ہاران مزید اندھیرے کی طرف پلٹ گیا۔ "موسم خراب ہے......"

"اور تم لوگ احتیاط بھی نہیں کرتے۔" ابراہیم نے محبت سے کہا۔ "جانتے نہیں ہو نا کہ تمہاری تکلیف سے مجھ پر کیا قیامت گزر جاتی ہے۔ باپ بنو گے تو پتا چلے گا۔ ہاں' تمہارا تجارتی قافلہ کب روانہ ہونے والا ہے؟"

"بابا! شاید مجھے آج رات ہی جانا پڑ جائے۔" ہاران نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

جو لوگ کثیر الاولاد ہوتے ہیں' جنہیں بن مانگے ہی اولاد مل جاتی ہے' وہ بھی اپنی اولاد کو یہی کچھ دیتے ہیں اور ابراہیم بن کالب نے اپنی ترسی ہوئی محبت کے لیے "جبلِ موسیٰ" پر جا کر موسیٰ کے رب سے اس نعمت کی آرزو کی تھی جسے رب نے سن لیا تھا اور شادی کے برسوں بعد یہ بیٹی عطا کردی تھی۔ اس نے بھی اس بیٹی کو یہی کچھ دیا تھا۔ کپڑا' روٹی اور خود فیصلے کے نام پر زندگی کا ساتھی۔ لاثان بن الیش سنجیدہ' باوقار' محبت کرنے اور دکھ درد کو محسوس کرنے والا وہ جوان جو بابا جان کی نظر میں ہی نہیں بلکہ سب کی نظروں میں اعلیٰ و ارفع تھا' اگر اس نے ہاران بن الیش کی پرستش نہ کی ہوتی تو اس کی پسند بابا جان سے جدا نہ ہوتی۔ سر تو اس نے اب بھی جھکا دیا تھا مگر دل کا نقش انمٹ تھا۔ ہاں' باپ کی محبت نے اس کی محبت کا خون کردیا تھا۔

(اس کہانی کا دوسرا حصہ آئندہ ماہ پڑھیے)

•.....•.....•.....•

اس کا محبوب' سفر کے نام پر اس گھر کو چھوڑ چکا تھا۔ جس رات ابراہیم بن کالب نے ان دونوں کے رشتے کا اعلان کیا تھا' اسی رات ہاران بن الیش نے اس گھر کو چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت کوئی بھی نہ جان سکا اور نہ کوئی کچھ کہہ سکا۔ بات بھی ایسی تھی۔ ابراہیم بن کالب کے خیال میں اس کی تعلیم و تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ اب اسے عملی زندگی گزارنے کی آزادی تھی۔ وہ کسی بھی قافلے کے ساتھ تجارت کے لیے جائے' کہیں بھی جائے' کوئی رشتہ رکاوٹ کیوں بنے؟ لاثان بن الیش کے خیال میں بھی کسی کی شخصی آزادی میں رکاوٹ ڈالنا اخلاقی جرم تھا اور پھر چند ماہ کی تجارت کے بعد دوسرے تاجروں کی طرح اسے پلٹ کر ہی آنا تھا۔ ایسے میں اگر اسے اچھا موقع مل رہا تھا تو ضائع کرنا نادانی تھی لیکن حوا؟ وہ نہ تو ابراہیم بن کالب تھی اور نہ لاثان بن الیش جو جذبوں سے ناواقف' اس سفر کو ہاران بن الیش کی ضرورت اور حق سمجھ رہے تھے۔ ہر چند کہ اسے اس سفر کے

فیصلے اور وقت کا پتا نہیں چلا تھا مگر وہ اس کے چلے جانے کی وجہ سے خوب واقف تھی۔ شاید اسے اپنے دکھوں پر چلانے اور گریہ کرنے کے لیے تنہائی اور ویرانے کی ضرورت تھی۔

وہ چلا گیا تھا۔ اس سب سے بڑے غم میں اسے تنہا چھوڑ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا تھا اور اب اسے خود اپنے دکھوں پر رونے کے لیے تنہائی بھی نصیب نہ تھی کیونکہ ان ہی دنوں علاقے' قبیلے اور دور و نزدیک کے سب لوگ جمع ہو رہے تھے۔ بیت المقدس کے جلیل القدر کاہن نے اپنی لاڈلی بیٹی اور بھتیجے کی شادی کی تھی۔ یوں ھوا لاعان بن ایش سے منسوب کر دی گئی۔ اس وقت اس نے صرف ایک گلہ کیا جسے کسی نے نہیں سنا۔

''ہاران' تم نے بابا سے کچھ بھی نہیں کہا۔ تمہاری محبت کسی اور کو دے دی گئی۔ تم کچھ نہ بولے۔ کیا یہ محبت ہے؟ کیا یہ عشق ہے؟'' پتا نہیں یہ سوال تھا یا گلہ مگر اس وقت بابو سیوں نے اسے گھیر لیا تھا پھر نہ وہ اس گھر سے گئی نہ ماحول بدلا مگر سب کچھ بدل گیا تھا۔

اس دن ابراہیم بن کالب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

''ھوا میری بیٹی! موتی کے رَب کا سب سے قیمتی تحفہ اور میری دُعاؤں کا نتیجہ! میں نے تیرے لیے اتنا ہی اعلیٰ انسان منتخب کیا ہے جتنی تو ہے۔ وہ میری نظر میں اعلیٰ ترین ہے۔ وہ تجھے کبھی کوئی دکھ نہیں دے گا اور تو بھی اسے خوش رکھنا۔''

اس وقت ھوا سسک پڑی۔ اس نے اپنے سر کو ابراہیم بن کالب کے کندھے سے لگا دیا اور آنسوؤں کے بندٹوٹ گئے۔ ابھی تک وہ سمجھ رہی تھی کہ اس نے صبر کرلیا ہے' ضبط کرلیا ہے لیکن ایک محبت کرنے والے کی محبت نے شاید جانے والے کی یاد دلا دی تھی۔ وہ رو پڑی۔ اسی وقت کسی مہمان عورت نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''واہ ھوا! اگر تو رخصت ہو کر کہیں اور جاتی' تب کتنا روتی۔ اب تو صرف اپنے کمرے سے لاعان بن ایش کے کمرے تک جا رہی ہے تو اتنی اداس ہے۔''

اب سب ہی کچھ نہ کچھ کہنے لگے مگر اس نے کچھ نہیں سنا۔ ہاں' اس نے دیکھا' ابراہیم بن کالب نے لاعان سے کہا۔

''لاعان میری نظر میں تو ایک اعلیٰ انسان ہے لیکن ھوا کا بھی کوئی مول نہیں ہے۔ یہ موتی کے عظیم رَب کا تحفہ ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں دے گی۔ اس نے مجھے بھی کوئی دکھ نہیں دیا۔ اب تیرا بھی فرض ہے کہ تو اسے ہر امکانی سکھ دے۔ وعدہ کر تو اسے سکھی رکھے گا؟''

یہ سن کر لاعان بن ایش نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور مضبوط آواز میں بولا۔ ''بابا' مجھے عمر بھر آپ نے جو کچھ دیا ہے' ان میں سب سے اعلیٰ اور محبوب چیز اگر کوئی ہے تو ھوا ہے۔ میں اپنی جان دے کر بھی اسے خوشی دینا چاہوں گا۔''

اس وقت ھوا کو لگا کہ اس کے عہد کی گواہی' اس کے ہاتھ کی حدت دے رہی ہے۔ اس کا دباؤ بھی محبت' تحفظ اور وفا کا اظہار کر رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جذبے اپنا یقین دلا رہے تھے اور وہ اس گرفت میں ہاتھ دیئے رہنے پر مجبور تھی پھر ایک طرف محبت کرنے والا باپ اور دوسری طرف 'محبت' کا بے لفظ وعدہ کرنے والا شوہر' اسے درمیان میں لیے لیے اس کی طرف بڑھ گئے جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ اس دن لاعان بن ایش نے پہلی بار اس سے کہا۔

''ھوا' کچھ لوگ شادی سے پہلے محبت کرتے ہیں اور کچھ شادی کے بعد۔ میں نہیں جانتا کہ لڑکیاں کیا چاہتی ہیں کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں یہ موقع کبھی کسی لڑکی کو نہیں دیا۔ ایک تو علم نے فرصت نہیں دی۔ دوسرے میرا خیال تھا کہ میری محبت' میری چاہت' میری وفا اور میرے پیار کی واحد حق دار صرف وہ لڑکی ہوگی جو بیوی بن کر میری زندگی میں آئے گی اس لیے میں نے کبھی محبت نہیں کی۔ امانت میں خیانت کرنا میری عادت نہیں ہے۔ ہاں' آج میں کھلے دل سے تمہیں یہ بتا دوں کہ میں نے زندگی میں صرف دو ہستیوں سے پیار کیا ہے' والہانہ پیار' ایک تم اور ایک ہاران۔''

ھوا نے نظر اٹھا کر اس شخص کو دیکھا جس کا چہرہ اس کی صداقت کی گواہی دے رہا تھا۔ اس وقت لاعان مسکرا دیا اور اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مگر تمہیں چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری اور ہاران کی محبتوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ 'محبت' کے نام پر تو میں نے بابا اور ہاران کے سوا کسی کو دیکھا ہی نہیں اور آج تمہارے ساتھ نئی زندگی کی ابتدا کرتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک تمہاری چاہت اور رفاقت ہی میرا سرمایہ حیات ہوگی اور تمہاری خوشی میرا مقصد۔ اب ان دو محبتوں میں کیا فرق ہے' تم خوب سمجھ سکتی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو رکا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ''بابا کا یہ فیصلہ تمہارے لیے بھی اچانک ہی تھا۔ کیا تم بھی اس سے خوش ہو۔''

جذبوں کی اپنی طاقت ہوتی ہے کہ محبت سے کیے ہوئے سوال کا جواب نفرت ہو ہی نہیں سکتا' اس کا اندازہ اسے ایک دم ہی ہوا۔ وہ لمحہ بھر اسے تعجب سے دیکھتی رہی۔ چھپ چھپ کر گریہ کرنا اپنی جگہ' شادی سے ناخوش ہونا اپنی جگہ لیکن اسے لگا کہ محبت ہو یا نہ ہو مگر اس سوال کا جواب نفرت نہیں ہو سکتا' تب اس نے دھیرے سے کہا۔ ''بابا جان کا فیصلہ اچانک نہیں تھا۔ ہاں' اس کا اظہار اچانک تھا اور پھر جو شخص ان کی نظر میں اعلیٰ ترین ہو' وہ میری نظر میں عام کیسے ہو سکتا تھا؟'' بات کچھ بھی نہ تھی اور سب کچھ تھی۔ لاعان بن ایش حیرت اور محبت میں ڈوبتا چلا گیا۔

ھوا کو اس کی منزل تک پہنچانے کے بعد اب ابراہیم بن کالب کہانت کے کاموں میں زیادہ مصروف ہوتا گیا۔ کاہنوں کی ذمے داریاں بیک وقت کئی کئی ہوتی تھیں۔ وہ مدرس بھی تھے' منصف بھی اور مربی بھی۔ بیت المقدس کی نذر کیے ہوئے بچوں کی پرورش بھی ان ہی کی ذمے داری ہوتی' مصلیوں کو دین کا درس بھی وہی دیتے' قربہ اندازی کا اہتمام بھی انہی کو کرنا ہوتا' بخور جلانے اور دعا مانگنے کا فرض بھی وہی ادا کرتے۔ یہی کاہن خاندان بنی لاوی کے جوانوں کی درس وتدریس کا انتظام کرتے اور تمام قبائل کے مقدموں کے فیصلے بھی انہی کے ہاتھ میں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ قوم کا بچہ بچہ ان پر کامل بھروسا کرتا۔ خود کو ان کا محتاج سمجھتا اور حاکم وقت بھی ان کے فیصلے اور دعاؤں پر یقین رکھتا تھا۔ اب ابراہیم بن کالب ان سب امور کا نگراں تھا اور اپنی ذمے داری ادا کرنے میں اس نے کبھی غفلت نہیں برتی تھی' بارہا اپنی اکلوتی بیٹی کو نظر انداز کر دیا تھا مگر قوم کے معاملات کو نہیں۔ اس وقت بھی ھوا کی طرف سے مطمئن ہو کر زیادہ سے زیادہ مصروف ہوتا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا آنا

بھی کم ہو گیا۔ کبھی خود نہ آتا' پیغام بھیج دیتا۔ کبھی کوئی شے بھیج دیتا اور کبھی یہ بھی نہیں' بس لاثان بن ایش گھر آتا تو کہتا۔

''ہوا! بابا کا انتظار مت کرنا' وہ مصروف ہیں۔''

ہوا دن بدن اس بات کی عادی ہوتی گئی۔ اسے بابا کے آنے سے بڑی خوشی ہوتی مگر آہستہ آہستہ ان کے نہ آنے سے تشویش نہ ہوتی اور پھر لاثان بن ایش تفصیلی حال بتا دیتا۔ ''آج بابا کو ایک خاص مقدمے کا فیصلہ کرنا ہے۔ وہاں علاقے بھر کے لوگ جمع ہیں۔''

''آج بیت المقدس میں قرعہ اندازی ہے۔ بابا کو وہاں ٹھہرنا ہے۔''

''آج خاندان بنی لاوی کے جوانوں کا درس ہے۔''

''آج منت کا فلاں بچہ بیت المقدس کی نذر کیا گیا ہے۔''

''آج بخور جلانے کا دن ہے۔ دعا میں شریک ہونے والے سب جمع ہو رہے تھے۔''

اسے معلوم تھا کہ کاہن اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ سوچتی' جب ان کا سب کچھ دوسروں کے لیے ہوتا ہے تو وہ شادی کیوں کرتے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوتا کہ شادی ضروری چیز ہے۔ کیوں؟ یہ اسے پتا ہی نہ تھا۔ بس لگتا' ایک گھر ہو جہاں دکھ' تکلیف میں آدمی آرام کرتا ہے' سکھ پاتا ہے اور آرام کا خیال آتے ہی اسے لاثان بن ایش کا تصور آ جاتا۔ وہ جب جب بیمار ہوئی تھی' اسی نے دیکھ بھال کی تھی۔ وہ جب جب اکیلی ہوئی تھی' اسی نے دیکھ بھال کی تھی۔ وہ جب جب اکیلی ہوئی تھی' وہی ساتھ دینے آ جاتا تھا اور پھر وہ اس کی عادی ہوگئی تھی اور جب یہ اس کا گھر تھا جس میں ہر چیز کے ساتھ لاثان بن ایش کا تصور وابستہ تھا۔ وہ اس گھر کے اور اس کے لیے ضروری بنتا چلا گیا تھا اور اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔

عجیب بات تھی۔ ہارون اس کی محبت تھا اور لاثان اس کی ضرورت بن گیا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ ضرورت اپنی اہمیت واضح کر کے خود کو منوائی چلی گئی تھی۔ وہ گھر سے جاتا تو لاشعوری طور پر وہ اس کی منتظر ہوتی کیونکہ وہ اس کے ساتھ دھلے کپڑوں کی تہہ لگواتا۔ اس کے لیے جشنے سے پانی لاتا اور اتنا جمع کر دیتا کہ دن بھر بھی استعمال کرتی تو کم نہ تھا۔ یہی نہیں' وہ ہر بھاری اور مشکل کام اس کے ہاتھ سے لے لیتا۔ جب وہ سبزیاں بناتی تو خود دھونے لگتا۔ ایسے میں وہ یہ کام خود کرنا چاہتی اور اصرار کرتی۔

''یہ کام مشکل نہیں ہے' میں کرلوں گی۔'' تب وہ سمجھاتا۔

''بے شک' یہ کام مشکل نہیں ہے مگر اس موسم میں تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی' بخار ہو جائے گا یا سردی سے کہیں درد ہو جائے گا' تب میں کیا کروں گا؟''

محبت کا یہ انداز ہوا کو عجیب لگتا۔ وہ سوچتی۔ ''ایسی محبت تو کبھی بابا نے بھی نہیں کی۔'' کبھی شام ہونے سے پہلے ہی وہ گھر آتا تو اسے لگتا' بہت تیز سفر کر کے آیا ہے۔ وہ دریافت کرتی تو وہ ہنس دیتا اور کہتا۔

''ہاں' آج میں نے بہت تیز سواری کی ہے۔ پہلے مجھے بابا کے پاس دیر ہوگئی۔ جب وہاں سے چلا تو سوچا کہ رات ہونے سے پہلے ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں تاکہ تم اکیلی نہ رہو۔''

اس وقت اسے یاد آتا کہ بار بار ایسا ہوا کہ بابا

دیر سے آتے تھے' تب وہ ڈرنے لگتی تھی مگر اس نے کہا تو نہیں پھر لاثان کو کیسے خبر ہوگئی؟ وہ تعجب سے پوچھتی تو وہ محبت سے کہتا۔

''ہوا! تم نے دیکھا نہیں مگر محبت کو لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم بتاؤ یا نہ بتاؤ' میں جانتا ہوں کہ شام کے بعد مجھے تمہارے ساتھ ہونا چاہیے لیکن کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ تم مجھے بتاؤ۔ میرا وقت' میرا پیار' میری دولت اور میرا آپ' سب کچھ تمہارا ہے۔'' الغرض وہ اس پیار سے اس کی ہر ذمے داری اٹھاتا کہ وہ خود کو اس کا محتاج سمجھنے لگتی۔ شادی کے شروع کا زمانہ قدرے مشکل تھا۔ اسے ہارون کا خیال آتا تو پریشان ہو جاتی پھر لاثان کی عادت ہوتی گئی اور اسے ہارون کا خیال تنہائی میں آتا لاثان ہوتا تو اپنی بے پناہ چاہت سے اس کے ذہن کو بھٹکنے کا موقع ہی نہ دیتا اور پھر ہارون نے بھی طویل عرصے تک کوئی پیغام نہ بھیجا۔ ایسے میں ابراہیم بن کالب کو تشویش ہوئی لیکن موسیٰ کے رب پر اس کا یقین پختہ تھا کہ ہارون جہاں ہوگا' اپنا فرض نبھا رہا ہوگا۔ وہ جب بھی گفتگو کرتے' کہتے۔

''ہارون خاندان بن لاوی کا جوان ہے۔ ایش بن کالب کا بیٹا ہے اور بیت المقدس کے جلیل القدر کاہن کا بھتیجا ہے اور اس خاندان نے ابتدا سے آج تک کبھی ناجائز کام نہیں کیے لہٰذا ہارون سے بھی کوئی غلط امید نہ تھی۔'' لاثان کو جب بھی اس کا خیال آتا' وہ بڑے پیار سے اس کھلنڈرے سے جوان بھائی کا ذکر کرتا اور کہتا۔

''جب نئے ماحول' نئے دوست اور تجارت سے فرصت ملے گی تو گھر یاد آئے گا۔''

ہوا کو بھی اس کا خیال آتا مگر دوسرے انداز سے۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہتی مگر چاند کی ٹھنڈک اور روپہلی دھوپ کی چمک اسے اس خوب صورت ساتھی کی یاد دلاتی جو گھر سے جا چکا تھا۔ جہاں کے پیچھے پیچھے سے اس کی یاد وابستہ تھی۔ ہر چند کہ بھلانے کا کوئی جواز نہ تھا مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور وہ شخص سامنے تھا جس کا ہر عمل متوجہ کرنے والا تھا' ایک سے اس نے محبت کی تھی لیکن دوسرا خود اس سے محبت کرتا تھا۔ ایک تصور تھا اور ایک حقیقت اور حقیقت کسی بھی روپ میں ہو خود کو منوانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور جب وہ محبت ہو' نظر انداز کر دینے والی بات نہیں ہوتی۔ کچھ وقت گزرا تو تصور دھندلانے لگا۔ پرانی یادیں حال کی مصروفیت کی نذر ہونے لگیں اور نہ چاہنے کے باوجود لاثان کی محبت مائل کرنے لگی۔ بھلا اس انسان کا کیا تصور تھا جس نے عمر بھر اپنی محبت کو شریک حیات کی امانت سمجھ کر رکھا تھا اور اس کے نصیب میں شریک حیات کے طور پر وہی لکھی تھی جس پر اس نے سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ اب وہ اگر محبت کا نہیں تو اظہار محبت کا مستحق تو ضرور تھا پھر معمولی سا اظہار بھی ہوتا تو چاہتوں سے اس کی جھولی بھر جاتی۔ اس طرح لاثان نے اسے خوشیوں سے بھر دیا اور ایک دن وہ چونک گئی جب ایک ''نئی زندگی'' نے اسے اندر سے اپنے وجود کا احساس دلایا اور اس نے جیسے خود سے کہا۔

''ہوا! تم ماں بننے والی ہو' ماں..... ماں..... ماں.....'' اس لمحے اس کے ہر طرف گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ یہ خوشی وہ تھی جو اس کی ماں کو بھی نصیب نہ ہوئی تھی اور جس کی تکمیل کے لیے اس کا باپ ''جبل موسیٰ'' تک گیا تھا اور اسے شادی کے چند ماہ بعد ہی مل گئی تھی۔ اس نے تعجب سے قد آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ چہرے پر چھایا ہوا نورانی حجاب اسے بہت حسین بنا رہا تھا پھر اس

نے پیار سے اس بچے پر ہاتھ پھیرا جو نظروں سے ''اوجھل'' تھا مگر جس کے اپنا' بالکل اپنا ہونے کا احساس اسے مسحور کیے دے رہا تھا۔ وہ سحرزدہ سی دیکھتی رہی۔ شاید اس خوشی میں سب کچھ بھول جاتی کہ اچانک پیچھے سے آجانے والے لالان کو دیکھ کر جھینپ گئی۔ اس کا شوہر' اس کے ہونے والے بچے کا باپ۔ یہ کیسا رشتہ تھا' یہ کیسا تعلق تھا جس نے لمحہ بھر میں ہر تعلق کو بھلا دیا؟ ایک نئے جذبے' ایک نئی امنگ کے ساتھ اس نے اسے دیکھا اور سحرزدہ سی جذبات سے مرتعش آواز میں بولی۔

''لالان! تم..... باپ..... لالان.....! ہمارا بچہ.....'' ٹوٹے ٹوٹے الفاظ کے ساتھ وہ ڈگمگا گئی اور لالان نے بازو پھیلا دیئے۔ خوشی اور حیرانی کی کیفیت دونوں طرف تھی۔ حوا ان بازوؤں میں گر گئی تھی اور وہ اس کے دل کی دھڑکن بخوبی سن رہا تھا۔ آج جو تعلق ان دونوں کے درمیان پیدا ہوا تھا' وہ ہر تعلق سے زیادہ مضبوط تھا۔ عجیب جذبہ تھا' عجیب محبت تھی جس نے پرانے ہر نقش کو مٹا دیا تھا۔ لالان نے اس کے ہلکے پھلکے وجود کو بازوؤں میں اٹھایا اور بستر پر لٹاتے ہوئے پیار سے بولا۔

''حوا! ادھر آنے والے ایک قافلے نے خبر دی ہے کہ ہاران خیریت سے ہے۔ اس نے چند چیزیں تمہارے میرے اور بابا کے لیے بھیجی ہیں جو جلد ہی مل جائیں گی۔'' اس نے یہ سنا مگر عجیب بات تھی' آج اس پر نہ اداسی چھائی اور نہ دل دھڑکا۔ ہمیشہ کی طرح تنہائی بھی ملی مگر نہ وہ تڑپی نہ روئی اور نہ ماضی کی یاد نے ایسے بےقابو کیا۔ اس نے محسوس کیا' ان سب مرحلوں سے گزرنے کے بعد اب اس کے تصور کا مرکز کچھ اور ہے اور جب اس رات اپنی خواب گاہ میں آرام کرتے ہوئے لالان بن ایش نے مستقبل کی بات شروع کی تو اسے اچھی لگی۔ لالان نے دھیرے سے کہا۔

''حوا! تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں' سچی بات یہ ہے کہ میں بیٹی چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟'' حوا نے حیرانی سے دیکھا۔ ''بیٹی لاولی کا پورا قبیلہ بیٹے پر جان دیتا ہے تاکہ اعلیٰ تعلیم دے کر اس قبیلے کو زندہ رکھ سکے اور آپ بیٹی چاہتے ہیں؟''

''ہاں۔'' لالان نے آہستہ سے پریقین لہجے میں کہا۔ ''شاید یہ تمہاری محبت کی انتہا ہے کہ میں تمہارے بے شمار روپ دیکھنا چاہتا ہوں۔ دل چاہتا ہے' ہر طرف تم ہی تم ہو۔''

اس وقت حوا کھلکھلا کر ہنس دی' ایک زندہ اور خوشیوں سے بھرپور قہقہہ۔ شاید زندگی میں پہلی بار اتنی مسرور کن ہنسی آئی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں اور رخسار تمتمانے لگے۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

''اگر یہی خواہش مجھے ہو کہ آپ کی طرح کشادہ رخ اور ذہین آنکھوں والا بیٹا آئے؟''

''کیا تم مجھ سے واقعی اتنی محبت کرتی ہو؟'' لالان نے آہستہ سے پوچھا۔

اس لمحے حوا خود شناسی میں رہ گئی۔ اسے لگا' اس وقت اس کے دل میں اس شخص کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس سے بڑا تعلق اس کا کسی سے نہیں ہے۔ یہ اس کے بچے کا باپ ہے' اس کا شوہر ہے۔ اسے بہت عزیز ہے اور وہ سب کچھ بھول چکی ہے اور واقعی سب کچھ بھول کر اس نے بے ساختہ اس کے گلے میں بانہیں حمائل کردیں اور بولی۔

''اچھا یہ بتایئے کہ ''آنے والے'' کا کیا نام

رکھیں گے؟''

لالان بن ایش ہنس دیا۔ اسے لفظوں میں اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا مگر حوا کی خوشی کا انداز محبت کا یقین دلانے کے لیے کافی تھا لہٰذا اس نے گلہ نہیں کیا اور بولا۔

''میرے ذہن میں تمام لڑکیوں کے ہی آتے ہیں جن میں سب سے پسندیدہ' سب سے پیارا نام ہے' صفورہ' تمہیں پسند ہے؟'' اگر لڑکی ہوئی تو یہی رکھیں گے۔''

''اس قدر پسندیدگی کی وجہ کیا ہے؟'' حوا نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا تو لالان بے ساختہ ہنس دیا۔ حوا کا شک کرنے کا انداز اسے اچھا لگا۔ یہ سب محبت کی علامت تھا۔ وہ بولا۔

''مشکوک مت ہونا! اس نام کی پسندیدگی کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے نہ میرا تعلق اس نام کی کسی لڑکی سے رہا بلکہ تمہارے سوا میں نے کسی لڑکی کو دیکھا ہی نہیں۔ بس یہ نام مجھے اچھا لگتا ہے اور میں سوچتا تھا کہ اگر مجھے موسیٰ کے رب نے بیٹی عطا کی تو اس کا نام ''صفورہ'' رکھوں گا لیکن اب تمہاری پسند ضروری ہے۔''

''میری پسند آپ سے الگ نہیں ہے۔'' حوا نے کہا۔ ''ہم اپنی بیٹی کا نام یہی رکھیں گے۔''

وقت گزرا۔ محبت' اعتماد' چاہت اور اس بندھن میں پختگی پیدا کرتا گیا اور صفورہ کی پیدائش نے ان دونوں سے اپنے سوا ہر خیال چھین لیا۔ یہ خوشی ان دونوں کے لیے ہی نہیں' ابراہیم بن کالب کے لیے بھی بڑی اہم تھی۔ لگتا تھا' اس گھر میں اب کوئی کمی نہیں رہی' اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ وہ سب ایک دوسرے میں مگن ہوتے گئے۔ اس گھر کی ہر چیز' صفورہ کے لیے تھی۔ ابراہیم بن کالب' لالان اور حوا سب گویا اسی کو دیکھ کر جیتے۔ اس دوران کئی بار کسی گزرتے ہوئے قافلے کے امیر نے بھی ابراہیم بن کالب سے ملاقات کی' کبھی پیغام بھیجا اور کبھی ہاران بن کالب کی طرف سے کوئی مکتوب اور چند تحائف ملے اور اس طرح اس کی خیریت ملتی۔ اس گھر میں اس کا ذکر ہوتا اور ہر جانے والے قافلے کو ابراہیم بن کالب یہی پیغام دیتا۔

''ہاران بن ایش سے کہنا' بہت دولت کما لی۔ اب گھر آجاؤ۔''

''ہاران بن ایش سے کہنا' تمہارا چچا تمہیں بہت یاد کرتا ہے' اب لوٹ آؤ۔''

کبھی لالان بھی اس کا ذکر شروع کرتا تو وقت کا اندازہ ہی نہ ہوتا۔ وہ کہتا۔

''حوا! عجیب بات ہے کہ ہاران کا کوئی ملنے والا کبھی اس کی وہاں کی زندگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ جانتی ہو' اس بار میں نے پوچھا تو اس قافلے کے امیر نے بس اتنا کہا کہ جس رات ہم روانہ ہوئے' اس رات معزز ہاران کے گھر پر بہت بڑی ضیافت تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا گھر بہت بڑا ہے اور وہ ایک خوش حال تاجر ہے۔''

''یقیناً ایسا ہوگا۔'' ابراہیم بن کالب نے دور بیٹھے بیٹھے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''تمہارے باپ ایش بن کالب کی بھی یہی عادت تھی۔ دور دراز تجارت کرنا اور بڑی بڑی دھونیں کرنا اس کے شوق میں شامل تھا۔ سنا ہے' یہی عادت ہاران کی ہے اور تمہارے باپ نے بھی تجارت کے دوران شادی کرلی تھی۔ میں تو ایک دم خوش نہیں ہوا تھا لیکن حوا کی ماں نے بہت خوشی منائی تھی۔ جتنی محبت ہم دو بھائیوں میں تھی' اتنی ہی ان دو عورتوں میں بھی تھی اسی لیے زلیخا نے لالان کو پیدا ہوتے ہی حوا کی

ماں کی گود میں ڈال دیا تھا۔''

ابراہیم بن کالب دیر تک ماضی کو یاد کرتا رہا اور وہ دونوں سنتے رہے۔ ہاران نے شادی کی یا نہیں' کوئی نہ جان سکا۔ وقت کچھ اور گزر گیا' ابراہیم بن کالب مزید مصروف ہوگیا۔ ھوا سے گھر' لاثان اور صفورہ کی ذمے داریوں نے پچھلی یادوں کو یاد کرنے کے لیے بھی چھین لیے۔ اگر کبھی ذہن کے کسی گوشے میں بچپن کی کوئی یاد تھی بھی تو اس نے خود بھلادی۔ اچھی ماں اور اچھی بیوی کے مقام کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ یوں زندگی کے پانچ برس گزر گئے اور پتا ہی نہ چلا۔ صفورہ بولنے لگی' بھاگنے دوڑنے لگی۔ وہ ھوا کی نزاکت' لاثان کی ذہانت اور ہاران کا حسن لائی تھی۔ اس کی آواز میں گھنٹیوں کا ترنم تھا۔ کوئی شخص اسے نظرانداز کر ہی نہیں سکتا تھا۔ زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر چل رہی تھی۔ ایسے میں ایک دن اچانک ہی ابراہیم بن کالب نے کہا۔

''لاثان! نوجوان کاہنوں کی ایک جماعت تعلیمی سفر پر جارہی ہے' تم بھی اپنا نام دے دو۔''

''مگر بابا! اس کی کیا ضرورت ہے؟'' ھوا نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

''اس کی بہت ضرورت ہے۔'' ابراہیم بن کالب نے سمجھایا۔ ''میرے باپ کالب کی اولاد میں' میں آخری کاہن ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ لاثان میری زندگی میں ہی اس منصب کے قابل ہو جائے تاکہ یہ عہدہ ہمارے ہی خاندان میں رہے۔ اب تعلیم کتابوں سے حاصل ہو یا سفر سے' ایک کاہن کے لیے بہت ضروری ہے۔''

ھوا کچھ نہ کہہ سکی اور لاثان بھی مجبور سا دیکھتا رہ گیا۔ اسے عہدے یا منصب سے کوئی غرض نہ تھی۔ ھوا اور صفورہ کے سوا کچھ درکار نہ تھا مگر ابراہیم بن کالب کو ان کے ساتھ ساتھ منصب بھی درکار تھا اور اپنے خاندان کے سوا یہ منصب اسے کہیں اور گوارہ نہ تھا لہٰذا تعلیمی سفر پر جانے والی جماعت کے چار کاہنوں میں ایک کا اضافہ ہوگیا۔ جدائی نہ چاہنے کے باوجود ان کو جدا ہونا پڑا۔ بڑی جلدی میں تیاری کر کے لاثان' ھوا اور صفورہ سے رخصت ہوگیا۔ اس وقت اس نے کہا۔

''ھوا! چند ماہ کا سفر ہے اور پھر بابا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ اگر میں نے ذرا سی غفلت کی تو کہانت کا منصب ہمارے خاندان سے ختم ہوکر بنی لادی کے دوسرے خاندان میں چلا جائے گا اور بابا کو دکھ ہوگا لہٰذا یہ جدائی تو برداشت کرنی پڑے گی۔ دیکھو نا' کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ بس اب تم خوش ہو جاؤ' مجھے ہنس کر رخصت کرو اور ایک بات یاد رکھنا' میں تمہاری آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کرسکتا۔''

اس رات صفورہ ان دونوں کے درمیان سوتی رہی اور وہ صبح ہونے تک باتیں کرتے رہے۔ چند ماہ کا تعلیمی سفر تھا۔ مقدس مقامات کی سیر تھی اور اہم جگہوں کا دیدار تھا۔ کہنے کے لیے چند ماہ تھے مگر ہر مہینے میں تیس دن ہوتے تھے۔ ہر دن میں چوبیس گھنٹے' ہر گھنٹے میں ساٹھ منٹ' ہر منٹ میں ساٹھ لمحے اور جدائی کا ایک لمحہ بھی قیامت تھا۔ یوں لاتعداد لمحوں کی قیامتیں اسے سہنی تھیں۔ جدائی کی' تنہائی کی اور انتظار کی۔ محبت کرنے والے' سفر شروع کرنے کے وقت سے ہی انتظار شروع کردیتے ہیں۔ یہی حال اس کا تھا کہ لاثان کے روانہ ہوتے ہی گھر خالی خالی لگنے لگا۔ اب خواب گاہ سے دل گھبراتا' کونے کونے سے اضطراب محسوس ہوتا تو وہ صفورہ

کو سینے سے لگا کر لوری سنانے لگتی پھر وہ کب سوتی' اسے پتا ہی نہ چلتا۔ ہاں' وہ خود آنکھوں آنکھوں میں رات گزار دیتی۔ ان پانچ برسوں میں جدائی کا پہلا موقع تھا اور پھر اتنی محبت' اس قدر والہانہ پن برتنے والے ساتھی کی غیر موجودگی بری طرح کھل رہی تھی۔ اسی کیفیت میں دن گزرتے رہے' ہفتے گزرے اور مہینا شروع ہوا اور سرکنے لگا۔ ہر صبح سورج طلوع ہوتا اور ہر شام اپنی سرخی کائنات پر نچھاور کرتی تو اسے لگتا' لاثان کے آنے کا ایک دن کم ہوگیا۔ دن یونہی کم ہوتے رہے اور ایک دن ابراہیم بن کالب نے کہا کہ تعلیمی جماعت واپس آنے والی ہے تو ھوا کو لگا' اس میں زندگی لوٹ آئی ہے۔ اب انتظار کے صرف چند دن باقی ہیں جنہیں وہ آنے والے کے لیے تیاری کر کے گزارے گی۔ یوں جدائی کی اذیتیں بھول کر اس نے تیاری شروع کردی۔ یہ جماعت کبھی بھی پہنچ سکتی تھی اور لاثان بن ایش کو سیدھے گھر ہی آنا تھا۔ وقت کی کوئی خبر نہیں تھی اور واقعی آنے والے وقت کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ لاثان واپس آنے کے لیے نہیں گیا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں' تیز سفر کر کے پلٹ آنے والے تیز رفتار سواروں نے خبر دی۔ ''نامعلوم افراد نے جماعت پر حملہ کردیا۔ دو جوان زخمی ہوگئے۔ ایک موقع پر ہی مارا گیا۔ یہ مارا جانے والا لاثان بن ایش تھا۔''

ابراہیم بن کالب گر گیا۔ ھوا بے ہوش ہوگئی اور صفورہ کو سنبھالنے والوں سے گھر بھر گیا۔ محبت کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی مگر جانے والے کی کمی کو کوئی پورا نہیں کرسکتا۔ لاثان لوٹ کر نہیں آیا مگر ھوا کو ہوش میں ضرور آنا تھا۔ صفورہ کو اس کی ضرورت تھی اور ابراہیم بن کالب کو اسی کا حوصلہ تھا بلکہ اور بھی کام تھے۔ سب سے اہم کام حملہ آور لوگوں کی تحقیق اور قاتلوں کا کھوج لگانا تھا۔ کسی نے خبر دی۔

''حملہ آور لٹیرے نہیں بلکہ تعلیمی جماعت کے ہونہار جوانوں کو راہ سے ہٹانے والے تھے۔'' کسی نے اپنی معلومات اور تحقیق نئے انداز سے پیش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ حملہ صرف لاثان بن ایش کو راہ سے ہٹانے کے لیے ہی کیا گیا تھا۔ یہ بنی لادی ہی کے وہ عالم تھے جو ابراہیم بن کالب کو بھی مشکل سے ہی برداشت کررہے تھے۔ ان کے خیال میں وہ اتفاقیہ طور پر اس منصب پر آگیا تھا اور اب یہ موقع اس کی نسلوں کو نہیں دینا تھا۔''

....

تحقیق ہوتی رہی' نت نئی باتیں سامنے آتی رہیں۔ دو زخمی ہوجانے والے جوان تندرست ہوگئے اور کاہنوں کے لیے پھر جماعت تیار ہونے لگی لیکن ھوا تو اجڑ چکی تھی' صفورہ لٹ چکی تھی۔ ہاں' غمزدہ ابراہیم بن کالب کے سامنے ایک راستہ موجود تھا۔ ''ہاران بن ایش'' اس کا دوسرا بھتیجا جو اسے اتنا ہی عزیز تھا جتنا لاثان اور جو برسوں قبل اس کی اجازت سے تجارت کے لیے گیا تھا اور وہاں بس گیا تھا۔ گاہے بگاہے اس کی خیریت ملتی تھی اور یہاں کے حال احوال بھی بھیجے جاتے تھے۔ اب یہ تباہ کن خبر بھی جانی تھی مگر اس کے ساتھ ہی ابراہیم بن کالب نے اسے پیغام بھیجا تھا۔

''ہاران! واپس آجاؤ' ہم برباد ہوگئے ہیں' ہمارا سب سے بڑا سہارا چل بسا' لاثان قتل کردیا گیا' ہم سب کو تمہاری ضرورت ہے۔''

کبھی کبھی روٹھنے والے ماننا نہیں چاہتے اور

کبھی صرف ایک پکار کا انتظار کرتے ہیں۔ شاید یہی کیفیت ہارون ابن ایش کی تھی۔ جس گھر سے اس کا بڑا مضبوط تعلق تھا' جہاں کے بچے بچے سے گہری یادیں وابستہ تھیں اور جسے لحہ بھر کو بھی بھول نہ سکا تھا' اسی گھر سے اس شخص نے بلایا تھا جو اس کا باپ بھی تھا اور چچا بھی' جو اس کا مربی بھی تھا اور استاد بھی' جس کے لاتعداد روپ تھے اور ہر روپ اسے بہت محبوب تھا مگر ایک ہستی کو بھلا دینے کے لیے اس نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا اور پلٹ کر جانا نہیں چاہا تھا مگر اب اسے جانا ہی تھا۔ اس نے اطلاع نہیں دی' اعلان نہیں کیا۔ اطلاع تو خوشی کی دی جاتی ہے' اعلان تو تقریب کا ہوتا ہے۔ وہ تو برباد ہو گیا تھا' لٹ گیا تھا۔ لاثانی اس کا بھی سب کچھ تھا' دوست بھی' بھائی بھی۔ شاید یہ اس کی بے پناہ محبت ہی تھی کہ اس کی شادی کا اعلان سن کر اس نے ہوا سے ملنا بھی پسند نہیں کیا تھا اور رات کی تاریکی میں گھر چھوڑ آیا تھا جہاں اب لوٹ کر جانا تھا۔ اسے لگا' اس سفر کی ابتدا بھی عجیب تھی اور انتہا بھی عجیب۔ جب بھی ایک گھوڑے کی پیٹھ پر تنہا مسافر تھا اور اب بھی۔ اپنی تجارت' اپنا گھر غلام کے حوالے کر کے چل دیا۔ ایک گھوڑے کے سوا اب بھی کچھ نہ تھا نہ کوئی یہ پوچھنے والا تھا کہ سب سفر کیا ہے اور منزل کیا؟ ہاں' سفر کی تھکن اسے تھکاتی رہی اور وہ سفر کرتا رہا اور..... اس دوپہر گھوڑے کی ٹاپوں سے فضا گونج گئی۔ یہ دور سے آنے والی آواز نہیں تھی بلکہ گھوڑے کا رخ گھر کے بیرونی احاطے کی طرف موڑ لیا گیا تھا۔ لاثانی تو اپنا گھوڑا غلام کے حوالے کر کے اندر آ جاتا تھا لیکن ہارون ہمیشہ اسے بڑے احاطے تک لاتا تھا' تب فضا یونہی ٹاپوں سے گونجتی تھی۔ یہ احساس ابراہیم بن کالب کو بھی تھا اور ہوا کو بھی جس نے ان دونوں کو ہارون کی واپسی کا یقین دلا دیا۔ ہاں' اس لمحے ان دونوں کی کیفیات مختلف ہوئیں۔ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے بوڑھے کو لگا کہ توانائی لوٹ آئی ہے۔ بڑی سرعت سے یوں اٹھا جیسے پیغام بھیجنے کے بعد اسے اس آمد کا یقین ہو۔ اس نے کہا۔

''ہارون آ گیا۔ میرا بیٹا آ گیا۔ میرا بیٹا.....!

میرا بیٹا.....!'' پھر یہ آواز سسکیوں اور ہچکیوں میں بدل گئی۔ ایک غم کو سہتے سہتے تھک گیا تھا اور دوسرا بہت دور سے اس غم میں آیا تھا اور دونوں کا غم ایک ہی تھا۔ گھر میں آہ و بکا مچ گئی تھی۔ نئے اور پرانے سب ملازم بھی رو رہے تھے۔ آس پاس کے لوگ بھی جمع تھے جنہوں نے ہارون کا بچپن بھی دیکھا تھا اور لڑکپن بھی جو اس کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے کہ ابراہیم بن کالب نے اپنے جوان بھائی کی موت کے بعد اس کے دو کم سن بچوں کو پرورش کیا تھا۔ انہیں اعلیٰ تعلیم دی تھی۔ ایک کو گہنات کے قابل بنایا تھا اور دوسرے کو تجارت کے اور یہی اس کا سرمایۂ حیات تھے جن میں سے ایک بے وقت چل بسا اور دوسرا برسوں بعد آیا ہے۔ سب کے دل پھٹ رہے تھے۔ سب ہی اشکبار تھے۔ اس گھر میں سسکیاں تھیں' چیخیں تھیں اور آنسوؤں کا سیلاب تھا لیکن اتنے غمگین ماحول میں ہوا بھی تھی جو ہارون کے اچانک آنے سے وحشت زدہ سی اپنے کمرے میں کھڑی یہ سب آوازیں سن رہی تھی۔ نجانے یہ کون سی کیفیت تھی' اضطراب تھا' خوف یا غم' وہ خود بھی پہچان نہ پا رہی تھی۔ شاید اگر اسے ہارون کے آنے کی خبر پہلے مل جاتی تو وہ اس کے کبھی واپس نہ آنے کی دعا مانگتی۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ وہ اب اس گھر میں کبھی نہ آئے مگر وہ آ چکا تھا اور وہ صفورہ

کے بال گوندھتے گوندھتے سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے خوف زدہ سے انداز میں سنا۔ گھر میں شور اٹھا۔ سسکیاں' ہچکیوں میں بدلیں' چیخوں میں اور چیخیں شامل ہوئیں پھر سسکیوں میں معدوم ہوتے ہوتے تھم گئیں۔

قیامت آئی اور گزر گئی لیکن اپنی تباہی کے سارے اثرات اس پر چھوڑ گئی۔ وہ جس نے وحشت سے سنبھلنے تک کی ہر کیفیت کو اکیلے سہا' تنہا برداشت کیا اور کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی' یہ کیسا غم تھا جس میں کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا؟ یہی غم بابا کو تھا مگر دنیا ان کے ساتھ تھی اور وہ وحشت زدہ سی' نیم جان سی ایک عجیب کیفیت سے گزر گئی تھی۔ دوپہر گزری' شام ہو گئی' تب ہی خادمہ زینب کی آمد نے اسے چونکا دینے ابراہیم بن کالب نے بھیجا تھا۔ اس نے کہا۔

''آقا آپ کو بلا رہے ہیں اور آقازادی کو بھی۔''

''مجھے کیوں بلا رہے ہیں؟'' صفورہ نے پوچھا۔

''آقازادی! آپ کے چچا آئے ہیں۔'' زینب بولی۔

''بالکل تمہارے پاپا جیسے ہیں۔ انہوں نے بھی تمہیں بلایا ہے۔''

اس وقت ہوا کو لگا' سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔ صفورہ اسے اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسے تھپکی دیتے ہوئے زینب کو دیکھا اور بولی۔

''صفورہ کو لے جاؤ اور بابا جان سے کہنا' میرے سر میں درد ہے' میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

کسی کو بھی خبر نہیں تھی کہ آرام کے پس پردہ کون سی کیفیت کارفرما ہے اور شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی' بس اسے لگتا' وہ ہارون کا سامنا نہیں کر سکتی اور پھر عجیب بات تھی کہ شام ڈھلے اس کی طبیعت کی خرابی کا جان کر ابراہیم بن کالب خود اس کے کمرے میں آیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جب بھی علیل ہوتی' ابراہیم کو وقت کا احساس مٹ جاتا۔ جب تک وہ ٹھیک نہ ہوتی' اسی کے پاس رہنا چاہتا۔ اس وقت بھی وہ چند لمحے کھڑا اسے تشویش کے عالم میں دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ بستر کے نزدیک آیا اور بولا۔

''ہوا بیٹی! تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ زینب نے بتایا' تمہیں سر درد ہے؟''

''بابا! معمولی سا درد تھا' میں نے قدرے آرام کیا' اب میں ٹھیک ہوں۔'' ہوا نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ خواہ مخواہ ہی پریشان ہو گئے' بھلا اس زینب کو کیا ضرورت تھی جو آپ سے کہا؟'' اب تک ابراہیم بن کالب اس کے نزدیک آ گیا تھا۔ اس نے پیار سے کہا۔

''تیرا خیال ہے کہ اگر زینب مجھے نہ بتاتی تو مجھے پتا ہی نہ چلتا کہ تیری طبیعت خراب ہے؟ بے وقوف' خود ماں بن گئی اور ماں باپ کے دل کو نہیں سمجھ سکی؟ مجھے کسی کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے تو دل کو خبر ہو جاتی ہے کہ تو کیا چاہتی ہے اور کیا سوچتی ہے؟''

ہوا سمجھ نہ سکی کہ روئے یا ہنسے؟ سب کچھ سمجھنے کا دعویٰ کرنے والے والدین بھی بعض جذبوں کو جان ہی نہیں پاتے۔ اس نے دیکھا' ابراہیم کے رخ پر شفقت ہی شفقت تھی۔ بولا۔

''اپنی صحت کا خیال رکھ۔ میں اب کوئی دکھ' کوئی پریشانی برداشت نہیں کر سکتا۔'' بات پوری نہ ہو سکی۔ گلا رندھ گیا اور اپنے اشک

چھپانے کے لیے وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا مگر حوا اپنے اشک نہ روک سکی۔ سر میں درد نہیں تھا۔ وہ تکیے میں منہ دے کر دیر تک روتی رہی' آنسو بہاتی رہی جنہیں دیکھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ رات گہری ہوگئی۔ زینب نے خبر دی۔

''مالکن! کھانے پر مالک انتظار کر رہے ہیں۔''

''صفورہ نے کھالیا؟'' حوا نے خواہ مخواہ سوال کیا تو زینب سادگی سے بولی۔

''صفورہ بی بی اپنے چچا کے ساتھ باہر گئی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا' کھانے پر ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ وہ اپنے کسی ساتھی تاجر سے ملنے گئے ہیں۔''

حوا نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ بابا اکیلے تھے اور کھانے پر منتظر بھی اور بھوک اسے بھی لگ رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھو کر خود کو سنبھال کر وہ دسترخوان پر آگئی۔ ابراہیم چپ چاپ پلیٹ سامنے رکھے شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے بہت ساری باتیں کیں اور وہ سنتی رہی۔ وہ بولا۔ ''ہاران بہت نادان ہے۔ تم نے سنا' اپنا گھر بار سب دوسروں کے حوالے کر کے آگیا۔ خالی ہاتھ گیا تھا اور خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ خیر' مجھے مال سے غرض نہیں ہے' وہ تاجر ہے' یہاں بھی کما لے گا مگر حیرت ہے' اس نے شادی بھی نہیں کی۔ کہتا ہے بابا! دل ہی نہیں چاہا اور نہ کوئی لڑکی پسند آئی۔ بھلا مال بھی نہیں کمایا اور شادی بھی نہیں کی تو پانچ برس تک کیا کرتا رہا؟''

ابراہیم بن کالب بولتا رہا اور وہ اسے بولنے دیتی رہی۔ شاید کبھی بولنا بہتر ہوتا ہے۔ انسان کچھ بھی بولے' وہ دونوں ہی گم تھے۔ ایسے میں انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ ہاران کب واپس آگیا؟ ہاں' صفورہ کی آواز نے اسے چونکا دیا جس کے ساتھ دروازے میں کھڑا ہوا۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے تھے' غم تھا' پانچ برس کی جدائی اور سب کچھ گنوا دینے کی اذیت تھی۔ حوا کو لگا' سانس لینا دشوار ہے۔ زندگی اور موت کے سوا ایک کیفیت اور بھی تو ہوتی ہے' وہ اسی سے دوچار تھی۔ یہ اس کے مرحوم شوہر کا بھائی تھا جو اسی کی وجاہت اور حسن لیے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس کا چچازاد بھی تھا۔ بڑا مضبوط رشتہ تھا۔ وہ اس کو سینے سے لگا کر رو بھی سکتی تھی' اپنے دکھوں پر واویلا بھی کر سکتی تھی لیکن وہ اس کی محبت بھی تھا۔ ان پانچ برسوں کی جدائی کا سبب یہ محبت ہی تو تھی۔ اسے لگا ''آنکھ اوجھل' پہاڑ اوجھل'' والی بات تھی ورنہ پہاڑ تو پہاڑ ہی تھا۔ چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں غم لیے چند ساعت وہ اسے دیکھتا رہا اور پھر اندر آتے ہوئے بولا۔

''کیسی ہو حوا؟'' اس آواز نے کبھی سینکڑوں سرگوشیاں کی تھیں۔ اسی آواز نے کبھی مستقبل کی ڈھیروں باتیں کی تھیں اور وہی آج حال پوچھ رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو؟'' اسی وقت ابراہیم بن کالب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی ابھی حوا سے تمہاری ہی باتیں کر رہا تھا۔'' پھر بابا نے کیا کہا' حوا نے سنا نہیں۔ وہ صفورہ کو لیے اپنے کمرے میں آگئی۔ نجانے کیوں وہ بری طرح خوف زدہ تھی' سراسیمہ تھی؟ دل کی دھڑکن کسی آنے والے برے وقت کا پتا دے رہی تھی اور وہ جان نہیں پا رہی تھی کہ کون سا

وقت آنے والا ہے؟ چند دن یونہی بیت گئے۔ ان دونوں کا آمنا سامنا ہوتا' رسمی بات چیت ہوتی اور بس۔ ایک دن ہاران' صفورہ کو لیے کہیں گیا ہوا تھا اور ابراہیم بن کالب نشست گاہ میں مہمانوں سے ملاقات کر رہا تھا' تب ہی ادھر سے گزرتے گزرتے وہ اپنا نام سن کر چونک گئی۔ باپ نے کچھ کہا تھا جس کے جواب میں علاقے کے بوڑھے استاد نے کہا۔

''ابراہیم بن کالب! بھول جاؤ گزرے وقت کو۔ موسیٰ کے رب کا شکر ادا کرو۔ تمہارا دوسرا بھتیجا تجارت سے لوٹ آیا اور اس نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی اور پھر حوا بیٹی کی عمر ہی کیا ہے۔ صفورہ کو بھی باپ کی ضرورت ہے اور تمہیں بھی سہارے کی' بس فیصلہ کر دو۔''

بابا نے کیا کہا' حوا کو نہ جاننے کا شوق تھا نہ ہوش اور وہ کیسے پلٹ کر آئی' یہ بھی خبر نہ تھی' بس آج آنسوؤں کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ روئی تو وہ بہت تھی مگر آج تو گریہ ہی اور تھا۔ وہ تصور ہی تصور میں گڑگڑا رہی تھی۔

''باباجان! اب میں کچھ بھی نہیں چاہتی۔ جب میں نے ہاران کو چاہا تو مجھے وہ نہ ملا' جب میں نے لاثان کو چاہا تو وہ نہ رہا مگر اب مجھ سے میری تنہائی نہ چھینیے۔ مجھے اکیلا رہنے دیجیے۔''

پھر یہ وقت حقیقت بن گیا۔ وہ چیخی' چلائی' روئی' سسکتی رہی مگر بابا کی ایک ہی التجا تھی۔

''حوا! مجھے چند دن کی زندگی اور دے دے۔ میں تیرا غم' صفورہ کی یتیمی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تجھے تنہا چھوڑ کر نہیں مر سکتا۔ کیا والدین کی عمر بھر کی محبتوں کے جواب میں اولاد انہیں ایک فیصلہ کرنے کا حق بھی نہیں دے سکتی؟''

اس سوال کے جواب میں حوا چیخ چیخ کر روئی۔ اس نے بابا کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

'بابا! میرا تو ہر فیصلہ آپ ہی نے کیا ہے۔ آپ تو جانتے ہی نہیں کہ میری خوشی کیا ہے؟''

مگر بابا کو اس گلے کی بھی خبر نہ ہوئی پھر اصرار' محبتوں کے واسطے اور مجبوریوں کے جواب میں آنسو رک گئے' سسکیاں بند ہوگئیں اور ایک بہت بڑے طوفان کو اس نے اپنے اندر دفن کر لیا۔ اپنی خوشی کو دوسروں پر قربان کر دینا معمولی بات نہیں ہے اور اس نے تو بار بار یہ کام کیا تھا۔ قربانی کی لاتعداد قسمیں ہوتی ہیں مگر سب سے بڑی قربانی جذبات و احساسات کی ہوتی ہے جو اس نے لحہ لحہ دی تھی۔ خوشی کے لیے بھی' غم کے لیے بھی۔ آج پھر اس کا سر جھک گیا اور بابا مطمئن ہوگئے۔ شادی کا اعلان ہوگیا۔

•......•......•......•

قدآدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوئے ہاران بن ایش نے خود کو دیکھا' اس وجیہہ و شکیل سراپے میں' دھڑکتے ہوئے دل میں ازل سے صرف ایک صورت نقش تھی۔ بچپن' لڑکپن اور جوانی۔ ہر دور آیا' شخصیت بدلی' سراپا بدلا' وقت بدلا مگر یہ نقش وہی رہا۔ وہ جہاں جہاں بھی گیا' اسی کی پرستش کی' اسی سے محبت کی یہاں تک کہ جدائی کے بہت سے برس بھی اس نقش کو نہ مٹا سکے تھے مگر عجیب بات تھی' وہ اسے نہیں' لاثان کو مل گئی تھی۔ اس وقت اس کے لبوں پر غمگین سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے خود کو دیکھا اور بے آواز گلہ کیا۔ ''لاثان کی موجودگی میں تم حوا کو نہ پا سکے اور حوا نصیب ہوئی تو لاثان کھو گیا۔''

اپنی سوچوں میں' اپنے تصور میں باتیں کرتے ہوئے وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جسے تصور میں بارہا دیکھ چکا تھا اور یہاں وہی ساتھی اس کا

انتظار کر رہی تھی جس کے ساتھ اس نے بچپن گزارا تھا' جس سے محبت کی تھی اور محبت میں برسوں کی جدائی برداشت کی تھی۔ وہ آج اسی کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے والا تھا۔ اس نے دیکھا' حوا چپ چاپ بیٹھی تھی' نہ وہ دلہن بنی تھی' نہ مسرور تھی۔ چہرہ اداس اور ستورم آنکھیں رونے کی غماز تھیں۔ اس نے حالات کو محسوس کیا۔ اسے حوصلہ دینا بھی ضروری تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے قریب پہنچ گیا اور پکارا۔ ''حوا.....!'' اس لمحے اسے لگا' وہ کہیں نہیں' گھبرائی نہیں' بس سہم گئی اور وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اسے لگا' حوا کے رخ پر حجاب نہیں' تردد ہے' اضطراب ہے' اس اضطراب سے اسے تکلیف ہو رہی تھی مگر اس کیفیت کو حالات کا اثر گردانتے ہوئے ایک بار پھر اس نے محبت کا سہارا لیا اور بولا۔

''حوا.....! اسے وقت کا فیصلہ سمجھ کر حوصلے کے ساتھ قبول کرو۔ جو وقت میں نے ہاما اور لاتان سے دور رہ کر گزارا' اس کا ہر لمحہ تم ان کے ساتھ رہی ہو۔ میں سمجھ لوں گا' ان لمحوں کا ازالہ ہو گیا۔ ہاں! بس ایک بات یاد رکھنا' میں آج اور اس لمحے بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی پہلے کرتا تھا اور ان تمام برسوں میں' میں نے ایک ساعت بھی تمہیں بھلایا نہیں۔''

ہاران نے اپنی محبت کا یقین دلایا تھا۔ محبت کا جواب نہیں مانگا تھا لیکن پھر بھی اس کی نظریں اس کے رخ کے گرد گھوم رہی تھیں۔ اس وقت حوا نے اسے یوں دیکھا جیسے اب یہ عشق و محبت سب بے وقت کی بات ہو۔ ان آنکھوں میں نہ وہ حجاب تھا نہ رخ پر زندگی کا کوئی رنگ۔ ہاران کو لگا' مجبوری کے لیے وہ اس کمرے میں دھکیل دی گئی ہے مگر ایک بار پھر خود کو سمجھاتے ہوئے اس نے پیار سے ہاتھ بڑھائے اور دھیرے سے بولا۔

''حوا.....! آؤ' آج نئی زندگی شروع کرتے ہوئے ہم ماضی کی ہر بات کو بھول جائیں' ہم بھول جائیں کہ کتنے دکھوں سے گزرے ہیں۔ وہ دکھ جو ہم دونوں کے ہیں' انہیں قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔''

اس بار حوا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی کم ہو گئی اور اس نے تائیدی نظروں سے اسے دیکھا۔ ہاران نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے اور حوا کے نرم و نازک شانے تھام لیے۔ اس کا دل چاہا' اسے سینے سے لگا لے' اس کے غموں کو مٹا دے اور آج وصال کے ان لمحوں میں جدائی کے سب برسوں کو بھول جائے اور حوا بھی اس کے سینے سے یوں لگ گئی جیسے بہت تھک گئی ہو اور اب آرام چاہتی ہو۔ عین اسی وقت رونے کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ ہاران اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ حوا نے بے تابی سے خود کو اس کی گرفت سے نکالا اور گھبرا کر بولی۔

''صفورہ رو رہی ہے۔'' یہ آواز صفورہ کی تھی۔ زینب اسے بہلا رہی تھی۔ ''تم میرے ساتھ سو جاؤ منی!'' مگر وہ چلائی۔

''میں ماما سے لوری سنوں گی' میں ماما کے پاس سوؤں گی' مجھے ماما کے پاس جانے دو۔ ماما.....! ماما.....!'' چیخوں کی آواز سے گھر گونج رہا تھا۔ حوا بے چین ہو کر سب کچھ بھول گئی تھی اور ہاران اس ہارے ہوئے جواری کی طرح اسے دیکھ رہا تھا جو اپنی آخری پونجی بھی ہار گیا ہو۔ حوا نے اسے نہیں دیکھا' بس بڑی عجلت سے بستر سے اترتے ہوئے بولی۔

(جاری ہے)

موت کی چنگھاڑ

میرے کالر سے تیری آنکھ کا کاجل نہ گیا
تو بہت دور گیا ' پھر بھی مکمل نہ گیا

یہ کمرہ آسیب زدہ ہے سب نے منع کیا تھا اور پھر واقعی میں آسیب راجن کو نگل گیا..... مگر پشپا کماری کون تھی کوئی نہ جان سکا.....

محمد سلیم اختر

یہ منظر تھا بھارت کے صوبے مہاراشٹرا کے ایک شہر میں ایک محلے کا.....!

''ارے بیٹا! یہ کمرہ کرائے پر مت لینا..... یہ آسیب زدہ ہے۔'' یہ الفاظ محلے کا ہر فرد راجن کو کئی

بار اور مختلف انداز میں کہہ چکا تھا۔ اور جو اسے براہ راست نہ کہہ پایا۔ اُس نے اشاروں کنایوں میں یہ بات اس کے کان میں ڈال دی۔

''ہوش کے ناخن لو' موت کو مت آواز دو' کہیں اور ٹھکانہ کرلو' مگر اس ویران اور سنسان کمرے میں مت رہو۔'' راجن نے کسی کی بھی نہ سی' اور ہر ایک کو یہی جواب دیا۔

''میں خود بہت بڑا آسیب ہوں' یہاں کا آسیب میرا کیا بگاڑے گا۔'' یہ کہہ کر وہ ان لوگوں کی باتیں اُن سنی کر دیتا' وہ ان لوگوں کی نادانی پر مسکراتا اور کہتا۔

''آسیب اور بدروح بھلا' یہ کیوں مجھے تنگ کریں گے' میں تو پہلے ہی زمانے کا ستایا ہوا ایک مظلوم شخص ہوں۔''

ایسا کہتے اور سوچتے ہوئے نوید کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور وہ پرانی یادوں میں کھو جاتا' پرانی یادیں جو اس کی زندگی کا سرمایہ تھیں اور جن کے سہارے وہ آج تک زندہ تھا' وہ گزرے ہوئے دن کسی قیمت پر بھی واپس نہیں آسکتے تھے یہ سوچ کر وہ اپنی ہی نادانیوں پر نادم ہو جاتا' ماضی کا دکھ اس کی آنکھوں میں سمٹ آتا۔

☆.....☆.....☆

راجن کا شمار ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ اسکول اور کالج کی کتابیں پڑھنے کے علاوہ اسے رسائل اور میگزینز پڑھنے کا بہت شوق تھا' پشپا پاٹھے اس کی پسندیدہ لکھاری تھی۔ وہ اس کے افسانے اور کہانیاں شوق سے کئی کئی بار پڑھتا' اس نے رسائل کے ایڈیٹرز کی معرفت اسے کئی خطوط لکھے' مگر پشپا نے اس کے کسی بھی خط کا جواب نہ دیا' پشپا کے افسانے اور کہانیاں رسائل کی جان ہوتے تھے۔ اُس کا شمار بڑی رائٹرز میں ہونے لگا تھا۔ راجن اس سے ملا نہیں تھا' اُسے دیکھا نہیں تھا' مگر پھر بھی وہ اس کا پرستار تھا۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ اس سے عشق کرنے لگا تھا۔

ایک روز راجن ایک ماہنامہ میگزین کے دفتر جا پہنچا اور ایڈیٹر کو بتایا کہ وہ پشپا کا پرستار ہے اور وہ اُس سے ملنا چاہتا ہے' اُس لیے اسے پشپا کا ایڈریس دیا جائے' مگر ایڈیٹرز نے اسے ایڈریس نہ دیا اور اس سلسلے میں مکمل معذرت کرلی' اب ہوا یہ تھا کہ راجن جب واپس لوٹنا تو اُس کے من میں بھی لکھاری بننے کی خواہش نے جنم لے لیا تھا۔ راجن نے چند افسانے اور کہانیاں لکھیں اور مختلف رسائل کو روانہ کردیں' مگر کسی نے بھی اس کو لفٹ نہ کرائی تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو گیا اور تمام تر توجہ پڑھائی پر مرکوز کردی۔ اس نے شہر آ کر ایک کمرہ کرایہ پر لیا' لیکن یہاں بھی اسے چین نہ مل رہا تھا۔

وہ محلے کے لوگوں کی نظروں کا مرکز بن گیا۔ کچھ لوگوں نے بہت ہی سنجیدگی سے اسے کمرہ چھوڑنے کا مشورہ دیا' مگر چونکہ وہ جوان تھا اور تو ہمات پر یقین نہیں رکھتا تھا اس لیے اس نے یہاں کے آسیب کی پروا نہ کی۔ وہ کبھی کبھی سوچنے لگتا کہ یہاں کے لوگ سہمے کیوں گئے ہیں۔ اُس نے اب ایک فرم میں ملازمت کرلی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بی اے کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ اس کے بتانے کی تو خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر ہے' مگر خواہش کی تکمیل پیسے سے ہوتی ہے اور پیسہ اس کے پاس کہاں تھا۔

☆.....☆.....☆

راجن شام کو ساڑھے آٹھ بجے کمرے میں آتا' اس کا کمرہ کیا تھا' ایک اچھی خاصی کشادہ کوٹھڑی سی تھی۔ جس میں دو اونچے روشندان لگے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے روشنی اندر جھانکتی رہتی تھی' اور سامنے کی گلی کی طرف' کھلنے والی ایک کھڑکی تھی۔ نہ جانے اسے کھڑکی سے کیا چڑ تھی کہ وہ اسے ہر وقت بند ہی رکھا کرتا تھا جبکہ دوسرے طرف کھڑکی کا ہونا اور وہ بھی گلی کی طرف کھلنا عام نوجوانوں کے لیے تفریح کا باعث ہوتا تھا۔

وہ اس کھڑکی سے دوسرے گھروں میں نظر بازی بھی کرسکتے ہیں ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھ سکتے اور بقول اُن کے جب تقدیر ان پر مہربان ہوتی ہے تو وہ اس سے اور بھی بہت کام لیتے' مگر راجن وہ کھڑکی ہر وقت بند رکھتا تھا پڑھنے کی میز اس نے اسی کھڑکی کے سامنے لگائی تھی۔ مگر وہ کھڑکی کو پڑھتے وقت بھی بند ہی رکھتا تھا۔

راجن کو اُس کمرے میں آئے ایک ماہ گزر گیا۔ مگر کوئی ناخوشگوار واقع پیش نہ آیا۔ اس عرصہ میں راجیش جو اس محلہ کا ایک ہنس مکھ نوجوان تھا۔ راجن کا دوست بن گیا۔ اب جیسے ہی راجن کمرے میں آتا تو راجیش آ موجود ہوتا۔ پھر دونوں کمرے میں بیٹھے خوب گپیں مارتے رہتے' یا پھر تاش کی بازی جمتی تھی۔

ایک دن راجیش نے کہا۔

''راجن یار! یہ تم ہر وقت کھڑکی کیوں بند رکھتے ہو' کیا کھڑکی اس لیے لگائی گئی ہے کہ اسے بند رکھا جائے؟'' راجن مسکرا کر بولا۔

''میں جانتا ہوں دوست کہ تمہیں اس کے بند رہنے پر اعتراض کیوں ہے؟'' راجیش منہ بنا کر تاش پھینٹنے لگا۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی' راجن کو اس کمرے میں آئے دو ماہ گزر گئے مگر اُسے کوئی آسیب نظر نہ آیا۔ اب راجن کے امتحان بھی نزدیک آچکے تھے' اس لیے اب وہ راجیش سے بھی کم ہی ملا کرتا تھا۔ وہ دفتر سے آ کر کمرہ بند کرتا اور رات گئے تک پڑھائی میں مصروف رہتا۔ ایک روز اُس کے دفتر کی چھٹی ہوئی تو موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ وہ گھر جانے کے بجائے ایک پارک کی طرف چل پڑا۔ نرم نرم ہری گھاس پر لیٹے ہوئے اسے بہت سکون مل رہا تھا۔

مگر اچانک ہی راجن کا دل اُس ماحول سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ فوراً ہی اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

راجن گھر آنے کے بعد جب میز پر سر لگائے کچھ سوچ رہا تھا کہ دفعتاً ایک کھٹکے سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے اور سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا۔

اُس نے گھبرا کر سر اٹھایا اور آگے بڑھ کر کھڑکی کو دوبارہ بند کردیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے کھڑکی پھر کھل گئی اور اُس کے ساتھ ہی راجن نے اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کی۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے کوئی اُس کے اندر سما گیا ہو۔ مگر یہ کیا؟ اُس کا سیدھا ہاتھ خود بخود حرکت کرنے لگا۔ اُس نے بے ساختہ قلم اٹھایا اور پھر سامنے رکھے سفید خالی کاغذ پر لفظ بُننے چلے گئے۔ راجن نے اپنا ہاتھ روکنے میں پوری قوت صرف کردی تھی مگر انگلیاں بدستور کاغذ پر تیرتی پھر رہی تھیں لفظ بڑھتے گئے صفحے کالے ہوتے گئے راجن نے دوبارہ اپنے اوپر قابو پا کر قلم روکنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ اس کے لوٹس والی کاپی تھی۔ مگر کھڑکی کھلی رہی اور صفحات بڑھتے گئے اور پھر یکدم جیسے اُسے ہوش آیا تھا اس کا ہاتھ خود بخود رک گیا اور وہ عجیب سی کیفیت بھی ختم ہو گئی تھی۔

راجن نے فوراً صفحات کو پلٹا اور اُن لفظوں کو پڑھنے لگا جو خود بخود تحریر ہو گئے تھے۔ وہ تحریر پڑھتے ہی اچھل پڑا۔

''میرے خدا! اس قدر شاہکار کہانی' شاید اُس نے آج تک ایسی کہانی نہیں پڑھی تھی۔ کس قدر اچھوتا پلاٹ تھا' لیکن کہانی کے اختتام پر موجود دو الفاظ نے اسے خاصا پریشان کر ڈالا' کہانی کے آخر میں لکھا تھا۔

''چودہ سو لفظ...... چودہ سو دن۔''

راجن نے کہانی کے الفاظ گنے تو وہ چودہ سو ہی تھے۔ یہ معمہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا مگر' چودہ سو دن' وہ یہ سوچ سوچ کر تھک گیا کہ ان کا کیا مطلب ہے؟ آخر کار اس نے اس معمے کو سر سے جھٹک دیا اور کہانی کو صاف کاغذ پر منتقل کیا۔ کہانی مکمل کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اگلی صبح دفتر جاتے وقت راجن اُس کہانی کا مسودہ بھی ساتھ لے گیا اور ڈاکخانے جا کر اس نے وہ کہانی ملک کے ایک ایسے مقبول ماہنامے کو ارسال کر دی جس میں پشپا ملک کی کہانیاں بھی شائع ہوتی تھیں' اور پھر وہ بے صبری سے ایڈیٹر کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

آخر کار راجن کا انتظار رنگ لایا۔ اُسے ایڈیٹر کا خط ملا۔ وہ شاید ہی کبھی زندگی میں اتنا خوش ہوا ہو۔ جتنا خوش اُس خط کو پڑھ کر ہوا تھا نہ صرف منتخب ہو گئی تھی' ساتھ ہی پہلے انعام کی حقدار قرار پائی تھی۔ شہر کے اخباروں میں بھی اس کی کہانی کا چرچا ہوا۔

اور اس کی تصنیف کو بے حد سراہا گیا اور اسے ملک کی شاہکار کہانیوں میں شامل کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ اتنا جلدی ہوا کہ راجن کو کچھ نہ سمجھ پایا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ کہانی خود بخود لکھی گئی ہے تو...... لیکن پھر اُس نے اپنے اس خیال کو جھٹکتے ہوئے سوچا کہ لوگوں کو کیا معلوم؟ یہ خیال آتے ہی وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

راجن کی اِس کامیابی پر راجیش بھی بہت خوش تھا' مگر اُسے حیرت تھی کہ اُس نے کبھی راجن کی زبانی یہ نہیں سنا کہ وہ کہانیاں لکھتا ہے اور نہ ہی اُس نے اسے کبھی راجن کو لکھتے ہوئے دیکھا تھا' تو پھر اس نے اتنی زبردست کہانی کیسے لکھ لی ہے اور آخر وہ ایک دن راجیش اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا تھا۔

''یار راجن! شکل سے تو تم بالکل چغد نظر آتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ یہ کہانی تم نے لکھی ہے؟''

راجن نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو' یہ کہانی میں نے نہیں لکھی۔'' راجیش تو راجن کے اس جواب کو گہرا طنز سمجھتے ہوئے خاموش ہو گیا تھا' مگر دوسری طرف راجن اکثر یہ سوچتا اور پریشان ہو جاتا کہ آخر ان چودہ سو دنوں کا کیا مطلب ہے؟'' اور جب وہ یہ سوچ سوچ کر تھک جاتا تو اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہتا۔

''ہو گا...... کچھ مطلب اس کا بھی...... مجھے زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔''

☆......☆......☆

کئی ماہ گزر گئے مگر راجن پر دوبارہ وہ کیفیت طاری نہ ہوئی جو پہلی کہانی لکھتے وقت ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں وہ کئی ایک کہانیاں خود بھی لکھ چکا تھا مگر وہ اتنی کمزور تھیں وہ انہیں ایک بار پڑھ کر ضائع کر دیتا' پہلی کہانی والے واقعے کے تقریباً چار ماہ بعد جب وہ ایک کہانی لکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے اور راجن پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی انگلیاں خود بخود حرکت کرنے لگیں۔ لفظ بنتے چلے گئے' صفحے کالے ہوتے چلے گئے اور وہ اُن میں کھو گیا۔

جب راجن کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اُس کی انگلیاں رُک چکی ہیں اور پھر جب راجن نے وہ کہانی پڑھی تو وہ خوشی سے ناچ اٹھا۔ یہ کہانی پہلی کہانی سے بھی زیادہ موثر اور اچھوتی تھی' مگر آخری الفاظ پڑھ کر وہ پھر پریشان ہو گیا۔

''آٹھ سو پچیس لفظ...... آٹھ سو پچیس دن۔''

اس نے کہانی کے الفاظ گنے تو وہ 825 ہی تھے۔ مگر یہ 825 دن؟ اِن کا کیا مطلب ہے؟ بہرحال اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا اور کہانی کو صاف کاغذ پر منتقل کرنے لگا۔

☆......☆......☆

دوسری کہانی کا چھپنا تھا کہ ہر جگہ اخباروں' رسالوں اور ٹی وی تک اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ پرانے پرانے تجربہ کار ادیب اور مصنف چونکے۔ انہیں اپنی کشتی ڈوبتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ناقدوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس پر تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی کی جانے لگی' اس سلسلے میں راجن کا ٹی وی پر انٹرویو بھی نشر کیا گیا اور پھر تو اس کے گھر لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ اس کی ڈاک اتنی بڑھ گئی کہ وہ پڑھ ہی نہ پاتا تھا۔ راجیش بھی خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا کیونکہ وہ راجن کا اکلوتا دوست تھا۔ اس نے اپنے دوست کے کارنامے بڑھا چڑھا کر لوگوں کو سنائے۔ اب راجن وہ راجن نہ رہا۔ کیونکہ اب اس کا شمار ملک کے معروف ادیبوں میں ہونے لگا تھا۔ اب تو اس کے پاس دولت بھی آ گئی۔ کئی ماہناموں کے ایڈیٹروں نے اسے اپنے پرچے میں اچھے معاوضے کے عوض کہانی لکھنے کی دعوت دی۔ دولت ملتے ہی راجن نے ایک فیصلہ کیا۔ جو بقول اُس نے بہت ضروری تھا۔

چند روز بعد راجن شہر کی سب سے ماڈرن بستی میں ایک شاندار کوٹھی میں بیٹھا اپنی کہانی کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ راجیش کو اس بات کا بہت افسوس تھا کہ راجن اب اس سے دور چلا گیا ہے۔ مگر اس کے ذہن میں راجن کے الفاظ اب بھی گونجتے رہتے تھے۔

''راجیش تم آج بھی میرے دوست ہو اور آئندہ بھی رہو گے۔'' راجن کا ایڈریس تو ماہناموں میں نہ چھپتا تھا اس لیے اس کے نام کی تمام ڈاک رسائل کے ایڈریس پر آتی تھی۔ جو ایڈیٹر اکٹھی کر کے اسے بھیج دیتا تھا۔ ٹی وی پر انٹرویو آنے کے بعد تو اُس کی ڈاک اور بھی بڑھ گئی تھی۔ خطوط میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہوتی تھی جو اُس کی تحریر کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ محبت کرنے کی بھی دعویدار بن گئی تھیں' راجن بلاشبہ مردانہ حسن و جمال کا نادر نمونہ تھا۔ اس کا متناسب جسم' چہرے کے جاذب نظر خطوط' سیاہی مائل بھوری آنکھیں' دراز قد' کھلتا ہوا گندمی رنگ لڑکیوں کو دیوانہ بنا دینے کے لیے کافی تھا۔ مگر اس نے کبھی کسی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی اس نے کسی لڑکی کے خط کا جواب دیا کیونکہ اس کے من میں تو صرف پشپا بسی ہوئی تھی اب اُس کا شمار بھی ملک کے چوٹی کے رائٹر میں ہونے لگا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ آج تک پشپا کا نہ تو کوئی انٹرویو کہیں چھپا تھا اور نہ ہی اس کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ راجن نے ان ماہناموں کے

''اِدھر اُدھر کیا دیکھتا ہے میں نے تجھے آواز دی ہے اِدھر آ.....'' میں ڈرتے ہوئے اُس فقیر کے پاس پہنچا تو وہ فقیر بولا۔

''جا ہوٹل سے جا کر میرے لیے چائے اور بسکٹ لے کر آ۔'' (ہوٹل سڑک کے بالکل آخری کونے پر تھا وہاں جانے کے لیے دس منٹ لگتے تھے) میں اس فقیر سے پیسے لے کر ہوٹل سے چائے بسکٹ خرید کر لایا اور فقیر کو دے کر جلدی سے آگے بڑھنے لگا وہ فقیر بولا۔

''کہاں جا رہا ہے میرے ساتھ بیٹھ کر چائے بسکٹ کھا میرے منع کرنے پر فقیر بولا کھا لے ورنہ بہت پچھتائے گا مرتا کیا نہ کرتا بیٹھ کر چائے پینے لگا اس نے بسکٹ اُٹھا کر مجھے دیے کہ لے کھا مجھے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے گھن آ رہی تھی مگر میں نے خاموشی سے لے کر کھا لیے اب میرا خوف کافی حد تک کم ہو چکا تھا کھانے کے دوران اس نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ ٹفن لے کر کہاں جا رہا ہے میں نے کہا بھائی کو کھیتوں پر کھانا دینے جا رہا ہوں جب ہم لوگ چائے بسکٹ کھا چکے تو وہ مجھ سے بولا۔

''اب تو چلا جا اور پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔'' اجازت ملنے پر میں نے جلدی سے ہوٹل کے برتن اٹھائے اور ٹفن لے کر اپنی منزل کی طرف چلنے لگا میں ڈر رہا تھا کہ بھائی پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا کہ اس سارے کام میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو گیا تھا اور کھانے لے جانے میں کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے بھائی سے ڈانٹ پڑنا یقینی تھی جب میں کھیتوں پر پہنچا تو بھائی نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی میں نے کہا۔

''اسکول کا دوست مل گیا تھا اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔'' بھائی مطمئن ہو کر کھانا کھانے لگے میں نے بھی جان بچ جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا بھائی سے کھانے کے خالی برتن لے کر جب میں واپس اُسی راستے پر آیا تو حیرت سے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے جس فقیر کے ساتھ ایک گھنٹہ بیٹھ کر اور چائے بسکٹ کھا کر گیا تھا اس کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا روزانہ میں آتے جاتے اسے دیکھا کرتا تھا وہ اپنی اسی جگہ بیٹھا ہوتا تھا مگر آج غیر معمولی طور پر واپسی پر موجود نہیں تھا اتنی سی دیر میں وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ جہاں وہ بیٹھا ہوتا تھا وہاں چند سکے پڑے ہوئے تھے میں نے سوچا شاید اس فقیر کے رہ گئے ہوں گے میں نے یہ سوچ کر جیب میں رکھ لیے کہ کل واپس کر دوں گا اور گھر کی راہ لی دوسرے دن جب میں بھائی کو کھانا دینے گیا تو فقیر موجود نہیں تھا مگر کل کی طرح آج بھی وہاں چند سکے پڑے ہوئے تھے میں نے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیے مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اتنے راہ چلتے لوگوں کو یہ سکے کیوں نظر نہیں آ رہے ہیں نہ کسی نے اِس طرف دھیان دیا ایسا روزانہ ہونے لگا۔ مجھے وہ فقیر دوبارہ کبھی دکھائی نہیں دیا مگر اُس جگہ سے روزانہ سکے ملنے لگے گیارہ سال کا ایک چھٹی کلاس کا بچہ جسے جیب خرچ کے لیے روزانہ ایک پیسہ ملا کرتا تھا جب اُسے ہر روز اتنے پیسے ملنے لگیں تو اس کے لیے تو ہر دن عید اور ہر رات شب برأت ہونی ہی تھی میں نے اب تک گھر میں یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی میرے اسکول میں بھی وارے نیارے ہو گئے تھے میں ہاف ٹائم میں خوب مزے اڑاتا میرے دوست اتنے پیسوں کے بارے میں پوچھتے تو کہہ دیتا بھائی نے جیب خرچ بڑھا دیا ہے اس دوران میں نے اپنے لیے اچھے اچھے کپڑے بنائے اور جوتے وغیرہ خریدے بچے ہوئے پیسے میں اپنے

راجن نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ اب اس کی انگلیاں بہت تھک چکی تھیں اور گردن مسلسل جھکی رہنے کی وجہ سے درد بھی ہونے لگا تھا' جبکہ پہلے یہ حالت نہ تھی اور پھر جب راجن کی یہ کہانی شائع ہوئی تو ایک بار پھر پورے ملک میں اُس کی دھوم مچ گئی۔ اخباری نمائندے' ٹی وی کے فوٹو گرافرز اور نہ جانے کہاں کہاں کے لوگوں نے اس کے گھر پر ہلہ بول دیا۔ وہ تمام لوگوں کو اپنے کارنامے سنا رہا تھا۔

حالانکہ وہ تینوں کہانیاں خود بخود تحریر ہوئی تھیں اور اس وقت اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ جب اس کی کہانی کو ایک اعلیٰ ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ ایوارڈ کی تقریب ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد کی گئی۔ صوبے کا گورنر اس تقریب کا مہمان خصوصی تھا' اس تقریب میں ملک کے پائے کے تمام مصنفین مدعو تھے۔ اُن میں سے بھی کئی ایک کو ایوارڈ دیا جانا تھا۔ پشپا کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس کا ایوارڈ تو نہ تھا مگر وہ صرف راجن کے لیے پہلی بار کسی تقریب میں آئی تھی۔ پشپا کو جس نے بھی دیکھا پہلی بار ہی دیکھا اور دل تھام کر رہ گیا۔

پشپا بلا کی حسین اور لاکھوں میں ایک تھی۔ وہ تقریب میں موجود ہر فرد کے دل کی دھڑکن بن گئی۔ وہ اپنی تحریروں سے بڑھ کر بھی حسین تھی۔ تمام شرکاء کی نگاہیں اُسی پر مرکوز تھیں۔ لگتا تھا کوئی دیوی آسمان سے راستہ بھول کر زمین پر آ گئی ہو۔ اس نے ہلکا مگر بڑا ہی نفیس میک اپ کیا ہوا تھا۔ اُس کے بالوں کا جوڑا انتہائی ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں اس کا حسن و شباب دو آتشہ ہو گیا تھا۔ ساڑھی میں اس کے جسم کے نشیب و فراز قیامت ڈھا رہے تھے۔ اُس کا یہ حسین روپ راجن کے دل پر بھی قیامت ڈھانے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں۔ جسم جلنے لگا اور دہکتے جذبات کے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ پشپا کے حسین جسم کی تپش اور مہک اس کے وجود میں رچ بس گئی۔ وہ اس کے دل کے نہاں خانوں میں خراماں خراماں اترتی چلی گئی۔ یہی حال پشپا کا بھی ہوا۔ راجن اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔ وہ تو آئی ہی اسی کے لیے تھی۔ یونانی دیوتاؤں جیسا راجن کا رنگ و روپ اس کے دل میں بس گیا تھا۔ وہ اس کے سپنوں کی تعبیر کی صورت میں آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا۔ اور اس کے دل کے دروازے خود بخود بے سوچے سمجھے بغیر کسی آہٹ کے کھل گئے۔ راجن کی نظروں کی پیاس کا احساس اسے بھی ہو گیا تھا اور وہ دونوں مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آئے۔

☆.....☆.....☆

اب راجن اور پشپا دونوں کی زندگی میں محبت کے رنگ برنگے پھول کھل اٹھے۔ دونوں ایک دوسرے کو طویل محبت نامے لکھتے اور کہانیوں پر بھی بحث کرتے' یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ پھر یہی ہوتا کہ راجن کھڑکی کے سامنے بیٹھ جاتا۔ کھڑکی کھلتی اور وہ ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرتا اور اس کی انگلیاں حرکت کرنی شروع کر دیتیں۔ لیکن ایک بات جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتا تھا' وہی بات تھی کہ ہر کہانی کے آخر میں یہ ضرور لکھا ہوتا۔

''اتنے الفاظ..... اتنے دن.....!'' وہ دونوں کی تعداد کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ قطع نظر اس کے جوں جوں دن گزرتے گئے اس کی شہرت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ تقریب کے بعد پشپا اور راجن کے درمیان خطوط کا سلسلہ جاری تھا مگر راجن نے پشپا کو پھر نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے کئی بار اصرار بھی کیا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ مگر پشپا بڑی خوبصورتی سے ٹال دیتی تھی۔

☆.....☆.....☆

آخر کار ایک دن جب راجن پر دنوں کی تعداد والا عقدہ کھلا تو وہ کانپ کر رہ گیا تھا۔

''نہیں نہیں..... یہ بھی نہیں ہو سکتا۔'' وہ چلایا۔ اُس کی اگلی کہانی کے آخر میں چھوٹا سا نوٹ درج تھا..... لکھا تھا۔

''مسٹر راجن..... تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ یہ دنوں کا کیا چکر ہے؟ تو کہیں بتا دوں کہ ان کا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی کے اتنے دن کم ہو گئے ہیں۔ تم جتنے لفظوں کی کہانی لکھی ہوئی پاتے ہو اتنے ہی دن تمہاری زندگی سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اب تک تمہاری زندگی کے بارہ ہزار چار سو دن کم ہو چکے ہیں۔ مگر یہ شاہکار کہانیاں اُس کے مقابلے میں بہت ہی سستی ہیں۔''

دوسرے دن سے راجن' راجن نہ رہا وہ ہر وقت سوچتا رہتا اور خلاؤں میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا مگر کسی نتیجہ پر نہ پہنچتا۔ راجیش نے بھی اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو بھانپ لیا اور ایک دن اس سے پوچھ بیٹھا۔

''راجن تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں تم کافی دنوں سے کھوئے کھوئے رہنے لگے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟'' راجن نے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھیر کر کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں' میں ایک خاص کہانی کا پلاٹ سوچ رہا ہوں۔''

اب راجن نے کھڑکی کے سامنے بیٹھنا بھی کم کر دیا تھا۔ اُسے وہ نوٹ اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا' ایک دن وہ یوں ہی قلم ہاتھ میں لیے کھڑکی کے سامنے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ جھٹکے سے کھڑکی کھلی اور اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی' اُس کی انگلیاں خود بخود حرکت کرنے لگیں' تو وہ چیخنے لگا۔

''نہیں..... نہیں میں نہیں لکھوں گا.....'' مگر اُس کیفیت کی وجہ سے وہ اپنی بات کو مکمل جاری نہ رکھ سکا۔ وہ چلاتا رہا اور اس کی انگلیاں برابر صفحے بھرتی رہیں۔ راجیش نے اس کے چیخنے کی آواز سنی تو بھاگ بھاگ اُس کے کمرے میں جا پہنچا اور اس سے بگڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ ابھی مجھے تمہارے چیخنے کی آواز آئی تھی..... بتاؤ کیا ہوا؟''

راجن نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''نہیں یہ تمہارا وہم ہو گا..... میں تو یہاں بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا۔''

راجیش نے راجن کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا وہم نہیں ہو سکتا..... بولو راجن کیا بات ہے؟ کیا تم اپنے دوست سے بھی یہ بات چھپاؤ گے..... مجھے بتاؤ..... شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔ میں نے خود.....'' ایک دم اس کی نظر کھلی کھڑکی کی طرف گئی اور اس نے چونک کر پوچھا۔

''یہ کھڑکی کیوں کھلی ہوئی ہے..... تم تو ہمیشہ اسے بند رکھتے تھے؟''

راجن سے اب ضبط نہ ہو سکا اور راجیش سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگا۔ راجیش نے اسے تسلی دی اور کہا۔

''بتاؤ راجن میں تمہاری کیا مدد کروں' میں

تمہاری خاطر جان بھی دے سکتا ہوں۔"

راجن نے اسے سارا واقعہ سسکیوں کے درمیان سنایا کہ ان شاہکار کہانیوں کا وہ کتنا بڑا معاوضہ ادا کرنے والا ہے۔ یہ بات راجیش کے لیے بھی بڑی عجیب تھی مگر اس نے راجن کو تسلی دی اور کہا۔

"تم فوراً یہ کمرہ چھوڑ دو اور واپس اپنی کوٹھی پر چلے جاؤ' پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

راجن نے یہ بات سنی تو راجیش کو لپٹا کر بھینچ لیا۔ اسے تو یہ بات یاد ہی نہ رہی تھی۔

"مگر راجیش اس وقت تو جانا مشکل ہے کل صبح آ جانا ہم دونوں مل کر سامان وغیرہ سمیٹ لیں گے اور تب تک میں کھڑکی کے سامنے نہیں بیٹھوں گا اور آئندہ تم میرے ساتھ میرے بنگلے پر رہو گے تم آج سے میرے دوست ہی نہیں بھائی بھی ہو۔"

راجیش بڑھ کر راجن سے لپٹ گیا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد راجیش نے راجن کو کھڑکی کے پاس نہ بیٹھنے کی تاکید کی اور صبح آنے کا کہہ کر چلا آیا۔

رات بہت ہی اُداس تھی۔ چاند کی روشنی بھی سوگوار معلوم ہو رہی تھی۔ راجن سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا آخر تنگ آ کر اس نے اس بات کو دماغ سے جھٹک دیا اور کوٹھی کے متعلق سوچنے لگا اور وہاں جانے کا پلان بنانے لگا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ راجن جاگ رہا تھا اور صبح ہونے کا منتظر تھا ایک دم اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ میں اس وقت خود کوئی ایسی شاہکار کہانی لکھوں جسے تمام لوگ پسند کریں اور اگر میں اپنی زندگی کی داستان قلمبند کروں تو کیسا رہے گا؟

اس کے دماغ میں ایسے ہی خیالات آتے رہے...... یہی داستان...... کھڑکی کا کھلنا...... ایک عجیب سی کیفیت کا طاری ہونا...... انگلیوں کا خود بخود حرکت کرنا اور پھر اتنے الفاظ ...... اتنے دن...... اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ یقیناً میری یہ تحریر شاہکار کہانی ہوگی...... اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ انجام سے بے خبر کھڑکی کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ ابھی اس نے ایک لفظ ہی لکھا تھا کہ فوراً کھڑکی کھلی اور اس پر وہی کیفیت طاری ہوگئی۔ مگر چونکہ وہ اپنی ہی دھن میں کہانی شروع کر رہا تھا اس لیے اسے اس بات کا بالکل احساس نہ ہوا......

ایک تو اس کی انگلیوں کی تیزی اور دوسرے اس کیفیت کی وجہ...... اس کی انگلیوں نے منٹوں میں کئی صفحے بھر دیے...... وہ لکھتا رہا...... لکھتا رہا...... مگر جب کہانی کا خاص موڑ آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ اپنی انگلیاں چلانے کی کوشش کر رہا ہے مگر وہ ٹھہر چکی ہیں اور دوسرے ہی لمحے وہ ساری بات سمجھ گیا...... اُس کے سامنے کے صفحے پر تحریر تھا۔

"افسوس راجن! تمہاری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں...... شاید تمہیں معلوم نہیں...... جیسے ہی تم نے کہانی شروع کی' میں تمہیں سمجھا چکی تھی تم اب تک 16050 الفاظ لکھ چکے ہو یعنی ان شاہکار کہانیوں کے معاوضے کے طور پر تمہاری زندگی کے 33 سال ختم ہو چکے ہیں مجھے افسوس ہے اور رہے گا۔"

'پشپا کماری'

صبح ہوئی تو راجن اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا اور اس کے بعد پشپا کماری کی بھی کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تھی۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ...... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے' جس کا گزشتہ پینتالیس برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- ...... اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ...... پوری دنیا میں پھیلے' اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ...... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ...... اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں' جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ...... آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ...... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: دوشیزہ

C-88 II - فرسٹ فلور - خیابانِ جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز - 7 - کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

پُراسرار فقیر

حوادث سے بچ کر نکلنا جو چاہوں
تو اپنی طرف امتحان کھینچتے ہیں

وہ معمولی فقیر نہ تھا تبھی تو اس کی جیبیں پیسوں سے بھری رہنے لگیں تھیں آپ بھی اپنے آس پاس نظر ڈالیں کہیں جس کو آپ عام سا فقیر سمجھ رہے ہوں وہ کوئی پُر اسرار فقیر نہ ہو......

اُم منال

یہ دنیا اسرار سے بھری ہوئی ہے کب کہاں راہ چلتے کیا پُر اسرار حالات رونما ہو جائیں کچھ کہہ نہیں سکتے ہاں یہ اپنی تقدیر پر منحصر ہے کہ حالات ہمارے حق میں ہوں یا ہمارے خلاف ہو جائیں

یہ اپنا اپنا نصیب ہے ایسا ہی ایک واقعہ مجھے ایک شخص نے سنایا تھا اس واقعے کے بعد اُن کی ایسی کایا پلٹی کہ وہ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولنے لگے مگر جب خوشیوں کا طوفان تھما تو سب کچھ الٹ ہو گیا۔

اُن کا نام اسرار احمد تھا اور نام کی طرح ہی اسرار سے بھری اُن کی زندگی تھی یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے ان دنوں اسرار احمد کا خاندان انڈیا کے شہر احمد آباد کے کسی ایسے گاؤں میں رہتا تھا جہاں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی اسرار احمد ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے سر سے ماں باپ جیسی شفیق ہستیوں کا سایہ اٹھ گیا بہن بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے بڑے سب بہن بھائی مختلف شہروں میں اپنی خوشحال زندگی گزار رہے تھے ایسے مشکلات حالات میں ان کے ساتھ رہنے والے بڑے بھائی بھابی نے انہیں سنبھالا' آگے کی کہانی اسرار احمد کی زبانی سنیے۔

ان دنوں میں چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا کیونکہ بھائی تو گھر کے حالات کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکے تھے مگر چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر کامیاب انسان کی زندگی بسر کروں لہٰذا انہوں نے میرا داخلہ گاؤں کے اسکول میں کرا دیا تھا میرا روزانہ کا کام یہ تھا کہ اسکول سے آ کر بھائی کے لیے کھانا لے کر کھیتوں پر جاتا تھا بھائی کسی کی زمین پر کھیتوں میں کام کرتے تھے کھیتوں پر جانے کے لیے دو راستے استعمال ہوتے تھے ایک طرف سے گھنا جنگل تھا جو کہ کافی طویل راستہ تھا اور جانوروں کے خوف کی وجہ سے اُدھر سے لوگ کم ہی سفر کرتے تھے دوسری طرف والے راستے پر ایک قبرستان تھا جو شارٹ کٹ پڑتا تھا لوگ سفر کے لیے زیادہ تر یہی راستہ اختیار کرتے تھے اس وجہ سے اُدھر چہل پہل رہتی تھی میں بھی کھیتوں پر جانے کے لیے یہی راستہ استعمال کرتا تھا اس راستے پر سڑک کے کنارے ایک فقیر بیٹھا ہوتا تھا اس کی حالت انتہائی گندی سی ہوتی تھی اس کے قریب سے کوئی گزرنا پسند نہیں کرتا تھا وہ کسی سے کچھ کہتا نہیں تھا اور نہ ہی مانگتا تھا اگر کوئی راہ گیر دور سے ہی اس کی طرف سکہ اچھال دیتا تو رکھ لیتا تھا مجھے اس فقیر کو دیکھ کر بہت ڈر لگتا تھا لہٰذا جب میں بھائی کو کھانا دینے کے لیے جاتا تو وہ راہ چلتے لوگوں کی آڑ لے کر بھاگتے ہوئے روڈ کراس کر جاتا اور کھیتوں سے واپسی پر بھی یہی طریقہ اختیار کرتا ایک دن میں حسبِ معمول بھائی کے لیے کھانا لے کر جا رہا تھا جون کی تپتی ہوئی دوپہر تھی اور غالباً دوپہر دو بجے کا ٹائم تھا سڑک معمول سے ہٹ کر سنسان تھی کوئی آدمی تھا نہ آدم زاد آج چند ایک لوگ بھی نظر نہیں آ رہے تھے اور پرندے بھی گرمی کی شدت سے بلبلا کر اپنے گھونسلوں میں آرام کر رہے تھے ہوا میں ہلکا سا بھی ارتعاش پیدا ہوتا تو درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ پر اپنے پیچھے کسی ذی روح کا احساس ہوتا ایسا سوہان روح منظر تھا کہ اپنے ہی قدموں کی آہٹ سے دل دہل جاتا جب میں ایسے ہولناک سناٹے سے ڈرتے ہوئے اس سڑک پر پہنچا تو دور سے ہی وہ فقیر سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا نظر آیا میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا یہ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ کیسے سڑک پار کروں آج تو کوئی بھی نظر نہیں آتا تب میں نے سوچا سڑک آتے ہی جلدی سے بھاگ کر گزر جاؤں گا جیسے ہی سڑک کا کنارہ آیا میں نے اپنی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے دوڑ لگا دی جب میں بھاگتے ہوئے اس کے قریب سے گزرا تو اُس فقیر نے مجھے آواز دی۔

''اے لڑکے اِدھر......'' میں نے خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا وہ چلا کر بولا۔

''اِدھر اُدھر کیا دیکھتا ہے میں نے تجھے آواز دی ہے اِدھر آ.....'' میں ڈرتے ہوئے اُس فقیر کے پاس پہنچا تو وہ فقیر بولا۔

''جا ہوٹل سے جا کر میرے لیے چائے اور بسکٹ لے کر آ۔'' (ہوٹل سڑک کے بالکل آخری کونے پر تھا وہاں جانے کے لیے دس منٹ لگتے تھے) میں اس فقیر سے پیسے لے کر ہوٹل سے چائے بسکٹ خرید کر لایا اور فقیر کو دے کر جلدی سے آگے بڑھنے لگا وہ فقیر بولا۔

''کہاں جا رہا ہے میرے ساتھ بیٹھ کر چائے بسکٹ کھا میرے منع کرنے پر فقیر بولا کھا لے ورنہ بہت پچھتائے گا مرتا کیا نہ کرتا بیٹھ کر چائے پینے لگا اس نے بسکٹ اُٹھا کر مجھے دیے کہ لے کھا مجھے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے گھن آ رہی تھی مگر میں نے خاموشی سے لے کر کھا لیے اب میرا خوف کافی حد تک کم ہو چکا تھا کھانے کے دوران اس نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ ٹفن لے کر کہاں جا رہا ہے میں نے کہا بھائی کو کھیتوں پر کھانا دینے جا رہا ہوں جب ہم لوگ چائے بسکٹ کھا چکے تو وہ مجھ سے بولا۔

''اب تو چلا جا اور پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔'' اجازت ملنے پر میں نے جلدی سے ہوٹل کے برتن اٹھائے اور ٹفن لے کر اپنی منزل کی طرف چلنے لگا میں ڈر رہا تھا کہ بھائی پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا کہ اس سارے کام میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو گیا تھا اور کھانے لے جانے میں کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے بھائی سے ڈانٹ پڑنا یقینی تھی جب میں کھیتوں پر پہنچا تو بھائی نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی میں نے کہا۔

''اسکول کا دوست مل گیا تھا اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔'' بھائی مطمئن ہو کر کھانا کھانے لگے میں نے بھی جان بچ جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا بھائی سے کھانے کے خالی برتن لے کر جب میں واپس اُسی راستے پر آیا تو حیرت سے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے جس فقیر کے ساتھ ایک گھنٹہ بیٹھ کر اور چائے بسکٹ کھا کر گیا تھا اس کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا روزانہ میں آتے جاتے اسے دیکھا کرتا تھا وہ اپنی اسی جگہ بیٹھا ہوتا تھا مگر آج غیر معمولی طور پر واپسی پر موجود نہیں تھا اتنی سی دیر میں وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ جہاں وہ بیٹھا ہوتا تھا وہاں چند سکے پڑے ہوئے تھے میں نے سوچا شاید اس فقیر کے رہ گئے ہوں گے میں نے یہ سوچ کر جیب میں رکھ لیے کہ کل واپس کر دوں گا اور گھر کی راہ لی دوسرے دن جب میں بھائی کو کھانا دینے گیا تو فقیر موجود نہیں تھا مگر کل کی طرح آج بھی وہاں چند سکے پڑے ہوئے تھے میں نے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیے مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اتنے راہ چلتے لوگوں کو یہ سکے کیوں نظر نہیں آ رہے ہیں نہ کسی نے اِس طرف دھیان دیا ایسا روزانہ ہونے لگا۔ مجھے وہ فقیر دوبارہ کبھی دکھائی نہیں دیا مگر اُس جگہ سے روزانہ سکے ملنے لگے گیارہ سال کا ایک چھٹی کلاس کا بچہ جسے جیب خرچ کے لیے روزانہ ایک پیسہ ملا کرتا تھا جب اُسے ہر روز اتنے پیسے ملنے لگیں تو اس کے لیے تو ہر دن عید اور ہر رات شب برأت ہونی ہی تھی میں نے اب تک گھر میں یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی میرے اسکول میں بھی وارے نیارے ہو گئے تھے میں ہاف ٹائم میں خوب مزے اڑاتا میرے دوست اتنے پیسوں کے بارے میں پوچھتے تو کہہ دیتا بھائی نے جیب خرچ بڑھا دیا ہے اس دوران میں نے اپنے لیے اچھے اچھے کپڑے بنائے اور جوتے وغیرہ خریدے بچے ہوئے پیسے میں اپنے

بکس میں کپڑوں کے نیچے بڑی احتیاط کے ساتھ چھپا دیتا پیسوں کا عمل کچھ عرصے تک چلتا رہا اُس وقت تک میرے پاس بہت سارا پیسہ جمع ہوگیا تھا اِدھر مجھے اس پیسے کو چھپانا مشکل ہوگیا تھا آخر خرچ بھی میں کہاں تک کرتا خرچ کرنا اور نہیں کرنا دونوں ہی باتیں کسی عذاب سے کم نہیں تھیں میری بدلی ہوئی حالت دیکھ کر بھائی کا مجھ پر شک میں مبتلا ہونا ایک فطرتی عمل تھا وہ مجھے کپڑے جوتے پہنے دیکھ کر سمجھتے شاید میں کہیں چوری کرنے لگا ہوں انہوں نے خاموشی سے میرے دوستوں سے پوچھا دوستوں نے کہا اسرار نے تو ہمیں بتایا ہے کہ بھائی نے میرا جیب خرچ بڑھا دیا ہے اور فصل اچھی ہونے پر بھائی نے کپڑے اور جوتے خرید کر دیے ہیں (کیونکہ اُس زمانے میں آج کل کی طرح اتنے کپڑے وغیرہ بنانے کا رواج نہیں تھا) یہ بات سن کر بھائی کا شک مزید بڑھ گیا وہ ہر وقت میری تاک میں لگے رہتے پھر ایک دن جب میں اسکول گیا ہوا تھا بھابی نے میرا بکس صاف کیا تو وہ میرے بکس میں اتنے پیسے دیکھ کر دنگ رہ گئیں وہ سمجھیں شاید میں نے کہیں لوٹ مار کی ہے کیونکہ ان دنوں تحریک پاکستان کی شروعات تھی انہوں نے اس بات کا ذکر بھائی سے کیا بھابی کے انکشاف کے بعد بھائی نے پہلے تو مجھ سے پیار سے باز پرس کی لیکن میرے مسلسل انکار کرنے پر کہ مجھے نہیں معلوم یہ پیسے کہاں سے آئے مجھے خوب مارا پیٹا اور دوستوں والی بات بتائی تو مار کی تکلیف کو برداشت نہ کرتے ہوئے میں نے ساری حقیقت بھائی کو بتا دی بھائی مجھے لے کر اسی وقت اُس جگہ گئے لوگوں سے فقیر کے بارے میں پوچھا کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا لیکن بھائی کو یہ علم ہوگیا تھا کہ مجھ سے سچ اگلوا کر وہ کتنی بڑی غلطی کر چکے ہیں کیونکہ وہ بھی کافی دن سے اُس فقیر کو وہاں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ رہے تھے اس کے بعد کی مختصر کہانی یہ ہے کہ بھائی پر اس پُراسرار فقیر اور پیسے کا راز کھلنے کے بعد پھر کبھی اس جگہ سے مجھے پیسے نہیں ملے مگر وہ پیسہ ہمارے بہت کام آیا بھائی نے سب سے پہلے گھر کی مرمت کروائی اور اپنی تھوڑی زمین خرید کر اس پر کاشتکاری کرنے لگے ہر قدم پر کامیابی ہمارے قدم چومنے لگی ہر طرف سکون ہوگیا میں تعلیم کی منزلیں طے کرتا ہوا میٹرک تک آ گیا اگر ان ہی دنوں 1947ء میں نئی مملکت پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ابھری غدر جو اٹھا تو ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جانے لگی اسی ہولی میں ایک دن بلوائیوں نے ہمارے گھر پر بھی حملہ کر دیا جس میں بھائی بھابی اور بچے شہید ہوگئے اس وقت میں اسکول میں تھا اس لیے بچ گیا دوسرے بہن بھائیوں کا کچھ پتہ نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا تنہا رہ جانے کے بعد میں نے محلے کے قافلے کے ساتھ پاکستان ہجرت کی یہاں آ کر کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزری پیٹ کا ایندھن پالنے کے لیے لوگوں کے آگے ہاتھ بھی پھیلایا شادی کی تو بیوی نے وفا نہ کی اور چند عرصے کے مختصر ساتھ کے بعد دنیا میں تنہا چھوڑ گئی پاکستان میں بھی بہت سے پُراسرار واقعات پیش آئے جن کی کہانی ایک الگ ہے یہاں آ کر میں نے ایک مل میں نوکری کی وہاں کا مالک بہت رحم دل تھا اس نے میرے جذبہ حج کو دیکھتے ہوئے اپنے باپ کے لیے مجھے حج بدل بھی کروایا مگر میں آج تک اس فقیر کو نہیں بھولا کاش بھائی میرے ساتھ زبردستی نہ کرتے تو شاید آج بھی میں خوشحال زندگی گزار رہا ہوتا۔

☆☆......☆☆

عشق!!! کوئی ہے

ہزار چاہا تباہی سے دور دور رہیں
پر کیا کریں کہ ہے روٹھا ہوا مقدر بھی

اچانک ہی ایک روح اس کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی
اور پلوشہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تنہا رہ گئی......

فرح انیس

Pakistanipoint
Waqar Azeem

آج پلوشہ کا اس کے اسکول میں پہلا دن تھا۔ پلوشہ کے والد ابراہیم صاحب فوج میں تعینات تھے۔ اُن کا ٹرانسفر ابھی کچھ دنوں پہلے ہی اس چھوٹے سے شہر میں ہوا تھا۔ پلوشہ نویں

جماعت کی طالبہ تھی درمیانے قد کی لمبے سیاہ گھنے بال' ذہانت سے چمکتی بڑی بڑی آنکھوں نے اُسے اور حسین بنا دیا تھا۔

وہ صبح سویرے آنکھوں میں نئی صبح کی امید لیے اردگرد کا نظارہ کرتی ہوئی اپنے نئے اسکول کی جانب جا رہی تھی یہ چھوٹا سا اسکول بالکل شہر کے بیچ بنا تھا' اس کے دائیں طرف کافی پرانا قبرستان تھا' قبرستان کے دائیں طرف ایک جگہ بنی تھی جہاں لوگ اپنے گھر کا کچرا اور مردہ جانور وغیرہ لاکر پھینک دیتے تھے' جبکہ اسکول کے بائیں طرف ایک میدان تھا جو پہلے سکھوں کی رہائش گاہ تھا' مگر تقسیم کے وقت جو فسادات ہوئے اس میں کافی سکھوں کا قتل ہوا اُس کے بعد سے یہ ایک خالی میدان تھا۔

پلوشہ نے اپنی ذہانت اور خوبصورتی کی بنا پر جلد ہی اسکول کے استادوں کے دلوں میں جگہ بنالی' بلکہ کلاس میں بھی سب کی بہت اچھی دوست بن گئی۔ ہر کوئی اس کے اچھے اخلاق کی وجہ سے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتا تھا۔ ٹیچر نے بھی اسے مانیٹر بنا دیا تھا' کلاس کی مانیٹر ہونے کی حیثیت سے بہت ساری ذمہ داریاں اُس پر آگئی تھیں جنہیں وہ باخوبی ادا کرتی۔

''اماں آپ کو پتا ہے مجھے مس نے کلاس کی مانیٹر بنا دیا ہے اور سب استاد میری تعریف کرتے ہیں کہ پلوشہ ابراہیم بہت اچھی اور ذہین بچی ہے۔'' وہ صحن میں بیٹھی کھانا کھاتے ہوئے خوشی خوشی ماں کو بتا رہی تھی۔

''ماشاءاللہ میری بچی ہے ہی اتنی قابل کہ ہر کوئی اس کی تعریف کرتا ہے۔'' زرینہ بیگم بیٹی کے خوبصورت چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

زرینہ بیگم اور ابراہیم صاحب کے اور بھی بچے تھے مگر جو پیار محبت اُن دونوں کو پلوشہ سے تھا' وہ کسی اور اولاد سے نہ تھا۔ پلوشہ اُن کی اور اولادوں سے بہت الگ تھی' وہ اخلاق کی اتنی اچھی تھی کہ بہت جلد دوسرے کے دل میں اپنے لیے جگہ بنا لیتی تھی' مگر ہر کسی سے ہنس کر محبت سے ملنے والی لڑکی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اُس کی ہنستی مسکراتی زندگی کو کیا گرہن لگنے والا تھا۔

اُس روز بھی چھٹی ہونے کے بعد پلوشہ ٹیچر کو سب اسٹوڈنٹس کی ٹیسٹ کاپیز اسٹاف روم میں دے کر آنے کے بعد کلاس میں اپنا بیگ پیک کرنے لگی' بیگ پیک کرتے ہوئے اُس کو یوں لگا کہ کلاس میں کوئی آیا ہے' اُس نے مڑ کر دیکھا تو کوئی بھی نہ تھا' اس بات کو وہ اپنا وہم سمجھ کر بیگ اُٹھا کر کلاس کے دروازے کی جانب بڑھی کہ اچانک اسے کوئی سایہ سا کلاس کے دروازے کے سامنے سے تیزی سے گزرتا نظر آیا۔

''یہ کون تھا اور وہ بھی اتنی تیزی سے گزرا؟'' پلوشہ یہ سوچتے ہوئے کلاس سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی' مگر اُسے کوئی نظر نہ آیا۔

اب یہ روز کا معمول بن گیا کہ چھٹی کے بعد کبھی اُسے کوئی سفید لباس میں تیزی سے گزرتا نظر آتا کبھی خالی کلاس میں کرسی کھسکانے کی آواز پر وہ چونک جاتی' کبھی کلاس کا دروازہ کوئی زور سے بند کرتا کہ وہ ڈر کر اچھل جاتی اور یہ سب اُس کے ساتھ تب ہوتا جب چھٹی ہو جاتی یعنی وہ اکیلی ہوتی' اب پلوشہ کو ڈر لگنے لگا تھا۔

''بابا پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے' ایسا لگتا ہے کوئی ہے اسکول میں جو مجھے اکیلا دیکھ کر ڈرانے کی اور تنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''

پلوشہ رات ابراہیم صاحب کے پاس بیٹھی اپنے ساتھ ہونے والی باتوں کا ذکر کر رہی تھی۔

''بیٹا یہ تمہارا وہم ہے ورنہ دیکھو لوکتنا پرانا اسکول ہے اور نہ کبھی کوئی ایسی شکایت آئی بلکہ لوگ تو بہت تعریف کرتے ہیں اِس اسکول کی۔'' ابراہیم صاحب بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے بولے۔

''بابا اسکول بہت اچھا ہے میں اسکول کو نہیں بول رہی پر جو میرے ساتھ سب ہو رہا ہے' میں آپ کو وہ بتا رہی ہوں۔''

''دیکھو بیٹا' اچھی بری چیزیں تو ہر جگہ ہوتی ہیں ان سے تو انکار نہیں کہ یہ موجود نہیں' بعض دفعہ یہ اپنا آپ ظاہر کر جاتی ہیں' مگر ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تم اشرف المخلوقات میں سے ہو' اور انسان کو اللہ نے کتنے میں اپنا کلام پاک عطا کیا ہے' جو ہر ڈر ہر پریشانی میں ہمارا معاون ساتھی ہے۔'' ابراہیم صاحب بیٹی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے' اُسے سمجھاتے ہوئے بولے تھے۔

موسم صبح سے ہی خراب تھا لگ رہا تھا بہت طوفانی بارش ہونے والی تھی اُس روز پلوشہ کا بہت ضروری ٹیسٹ تھا ورنہ موسم کے تیور دیکھ کر اس کا دل نہیں تھا کہ وہ اسکول جائے۔

آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی پلوشہ سوچتی ہے کہ کاش وہ اُس دن اسکول نہ گئی ہوتی نہ اُس کی زندگی میں اتنا بھونچال آتا' بس یہیں سے پلوشہ کی زندگی بدلی تھی۔

''یار کیا فائدہ ہوا آج آنے کا' مس تو آئی نہیں۔'' سیما بیزار لہجے میں پلوشہ سے بولی۔

''ٹھیک بول رہی ہو آج تو دل میرا بھی نہ تھا آنے کا' اوپر سے دیکھو بچے بھی کتنے کم آئے' ہم ہی پاگل تھے جو آگئے اپنے موسم میں۔'' پلوشہ کھڑکی سے باہر برستی طوفانی بارش کو فکرمندی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے تو فکر ہو رہی ہے پلوشہ' ہم گھر کیسے جائیں گے کیونکہ جس راستے سے ہم گھر جاتے ہیں اُدھر سے تو گزر بھی نہیں سکتے اتنا پانی ہے وہاں۔''

''اچھا چلو تو دیکھتے ہیں نکل کر۔'' پلوشہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسکول سے باہر لے آئی۔

''آج ہم ایسا کرتے ہیں میدان کی طرف سے چلے جاتے ہیں گھر کے لیے' اُدھر سے ہم پھر بھی آسانی سے گھر جا سکتے ہیں۔'' پلوشہ سوچتے ہوئے بولی۔

''مگر پلوشہ اُدھر سے تو کوئی بھی نہیں گزرتا۔'' سیما خوفزدہ لہجے میں پلوشہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ارے یار کچھ نہیں ہوتا' چلو نا۔'' وہ سیما کا ہاتھ پکڑ کے اتنی تیز بارش میں میدان کی طرف چل دی۔

میدان سے گزرتے ہوئے ایک سردی لہر تھی جو پلوشہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہوئی۔

''کیسی ہو پلوشہ؟'' کی سرگوشی اُسے اپنے کانوں میں صاف سنائی دی' اُس نے گھبرا کر اپنے اطراف میں دیکھا مگر وہاں اُن دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

اب پلوشہ پر گھبراہٹ طاری ہوگئی وہ سیما کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز قدموں سے اس میدان سے نکل کر گھر کی جانب بڑھ گئی۔

گھر آنے کے بعد پلوشہ پر ایک عجیب کیفیت تھی جس کو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی تو اُس کو سردی کا احساس ہونے لگا وہ ابھی یہ ہی سوچ رہی تھی کہ ابھی اٹھ کر چادر لیتی ہوں کہ اس کی آنکھ لگ گئی مگر اچانک

ایک عجیب سے احساس پر اس کی آنکھ کھلی تو اپنے اوپر تنی سفید چادر کو دیکھ کر ڈر گئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''یہ کس نے اوڑھائی مجھے' اور یہ تو ہمارے گھر کی چادر بھی نہیں۔'' وہ چادر کو بغور دیکھتے ہوئے بولی اور ڈر کر وہ چادر دور پھینک دی' پھر اس کو نیند آ گئی تھی اور جب صبح بیدار ہوئی تھی تو وہ چادر کمرے سے غائب تھی۔

اُس روز کلاس میں پلوشہ کو اپنی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی' نہ پڑھنے کو اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسکول میں سارا وقت غائب دماغی سے رہی' چھٹی کے وقت کلاس بند کرتے ہوئے اُس کی نظر اندر کلاس میں پڑی' تو دہشت سے اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اندر کلاس میں تین عورتیں سفید لباس میں کھڑی پلوشہ کی جانب مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ اُن تین عورتوں میں سے ایک عورت جوان دو عورتوں کے درمیان کھڑی تھی' بے تحاشہ حسین تھی۔

''آ جاؤ پلوشہ!'' وہ عورت پلوشہ کو دیکھتے ہوئے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

پلوشہ چیخ مار کر وہاں سے بھاگی تھی۔ گھر پہنچ کر اُسے سردی لگتی رہی تھی اور رات تک اُس کو کافی تیز بخار چڑھ گیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری۔'' نیند کے انتظار میں آنکھیں بند کیے لیٹی پلوشہ کو لگا کوئی اُس پر جھکا ہوا ہے۔ اُس نے بے ساختہ آنکھیں کھولی تھیں تو اُسی اسکول والی عورت کو دیکھ کر پلوشہ کی جیسے سانس رک گئی۔

''کون ہو تم کیا چاہتی ہو؟'' پلوشہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے لرزتے لہجے میں بولی اُس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''میرا نام ماہ زیب ہے' میں مصر کی رہنے والی ہوں' تم نے مجھے آج جن دو عورتوں کے ساتھ دیکھا تھا وہ میری سہیلیاں ہیں' گیتا اور سریتا' جو پہلے اِس میدان میں جو سکھوں کی رہائش گاہ تھی وہاں رہا کرتی تھیں' مگر فسادات کے دوران اُن کے گلے کاٹ کر قتل کر دیا گیا تھا۔''

پلوشہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے' خوف سے اپنے سامنے بیٹھی عورت کو سن رہی تھی۔

''اور تم؟'' پلوشہ نے اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے لرزتے لہجے میں پوچھا۔

''میں رل کی جادوگرنی تھی وہاں پر جادو کی استاد مانی جاتی تھی' دو سو سال پہلے میں بھی زندہ لوگوں میں شمار ہوتی تھی۔'' ماہ زیب کی اس بات پر پلوشہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

''کیا ہو گیا میری بچی کو' بار بار بے ہوش ہو جاتی ہے۔'' زرینہ بیگم روتے ہوئے بیٹی کا ماتھا چومتے ہوئے فکرمند لہجے میں بولی تھیں۔

''ڈاکٹر بول تو رہا ہے اُس دن بارش میں زیادہ بھیگنے کی وجہ سے شدید ہو گیا ہے تم زیادہ فکر نہ کرو۔'' ابراہیم صاحب بیوی کو تسلی دیتے ہوئے بولے تھے۔

☆ ☆....☆

گزشتہ دو ہفتوں سے پلوشہ اسکول نہیں گئی تھی اب جو وہ اسکول گئی تو سب ہی اساتذہ اور دوست اس کی خیریت پوچھ رہے تھے مگر وہ چپ سی تھی بلکہ سیمانے جو چیز اس کے علاوہ محسوس کی وہ اس کے انداز میں سرد مہری تھی۔

ماہ زیب اُس رات ایک بار پھر پلوشہ کے پاس آ گئی تھی۔ پلوشہ اس کو دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ تھی ہی اِس قدر حسین' شفاف سفید رنگت' جن پر گلابیاں بکھری ہوئی تھیں' کانچ کی طرح کی نیلی چمکتی آنکھیں' گڑیا جیسے بال' مصری لباس لمبی سی خوبصورت میکسی' بازو میں بازو بند باندھی ہوئی جس پر خوبصورت پتھر نصب تھا۔ اس پتھر پر سانپ کی شبیہ بنی ہوئی تھی اور ایسا ہی اُس کے گلے میں دل کے شیپ کا لاکٹ تھا اور اس لاکٹ میں بھی سانپ کی شبیہ بنی ہوئی تھی۔ پلوشہ کو اُس سے خوف محسوس نہ ہوا تھا وہ اُس کے حسن کے سحر میں کھو سی گئی تھی۔

''پلوشہ کیا یہ اچھا نہیں کہ تم مجھ سے دوستی کر لو' تم میرے اس ساتھ کو قبول کر لو۔'' ماہ زیب اُس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے عجیب سرد لہجے میں بولی۔

''تم مجھ سے دوستی کرنا کیوں چاہتی ہو؟'' پلوشہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''میں یہاں گیتا اور سریتا سے ملنے آئی تھی مگر جب سے تم کو دیکھا تم بہت اچھی لگی ہو' تمہارے لمبے گھنے بال اور پھر تمہاری ذہانت کہ میرا دل واپس پلٹنے کو ہی نہیں چاہا۔''

اور پھر اُس رات کے بعد ایک عجیب بات دیکھی گئی کہ جو کام گھنٹوں میں کرنے کے ہوتے ہیں پلوشہ وہ منٹوں میں کر دیتی' اب اسکول میں وہ گم صم ہی رہتی' کسی سے پہلے جیسی زیادہ بات چیت نہ رہی تھی' اُس کے رویے کی بناء پر سب آہستہ آہستہ اس سے دور ہو گئے تھے' گھر میں بھی یہ عالم ہو گیا تھا کہ اگر وہ کمرے میں بیٹھی ہے تو دن سے رات ہو جاتی تھی' ایسا لگتا جیسے پلوشہ کو اندھیرے سے محبت ہو گئی تھی' وہ اب ہر وقت کمرے میں اندھیرا کیے رکھتی' پلوشہ کی ان حرکات اور معاملات کو سب سے پہلے ابراہیم صاحب نے نوٹ کیا' اور وہ پہلی بار اپنی بیٹی کی اِن حرکات و سکنات کو لے کر فکرمند ہوئے' ورنہ وہ ابھی تک اُس کی طبیعت کی خرابی ہی سمجھ رہے تھے' مگر اب اُن کو کوئی اور ہی بات لگ رہی تھی۔

''پلوشہ بیٹی تم اِس طرح سے کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ اُس کے کمرے میں آ کر لائٹیں جلاتے ہوئے بولے تھے۔

''اِس طرح سے کیوں اندھیرے میں بیٹھی رہتی ہو؟'' ابراہیم صاحب بیٹی کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اُس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

پلوشہ خالی خالی آنکھوں سے باپ کو دیکھنے لگی' وہ اُس کی آنکھوں میں پھیلی ویرانی کو دیکھ کر دھک سے رہ گئے اُن کو کچھ اور ہی معاملہ لگنے لگا وہ کچھ سوچتے ہوئے اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

''پلوشہ! میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی' یہ بات یاد رکھنا تم۔'' ابراہیم صاحب کے جاتے ہی ماہ زیب آ گئی اور پلوشہ کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آج رات میں تمہیں کہیں لے کر جاؤں گی۔''

''تم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتی ہو' میری زندگی عذاب کر دی ہے تم نے۔'' پلوشہ چیخ کر بولی۔

''چھوڑوں گی تو اب میں تمہیں کبھی نہیں' تمہارا ساتھ تو میرا عشق ہے' شوق ہے اور میرا ساتھ تمہاری مجبوری' تم کچھ بھی کر لو میرا ساتھ نہیں چھوڑ پاؤ گی۔'' یہ کہہ کر ماہ زیب نے قہقہہ لگایا تھا۔

''اب چلو میرے ساتھ۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے بولی۔

''کہاں لے کر جا رہی ہو مجھے؟'' پلوشہ خوفزدہ ہو کر بولی۔ اُس کی بات پر ماہ زیب نے اُسے گھور کر یوں دیکھا کہ پلوشہ کو لگا جیسے اُس کی آنکھوں سے شعاعیں سی نکل رہی ہیں اور اُسے

محسوس ہوا کہ اُس کی زبان بند کردی گئی ہے۔

ماہ زیب پلوشہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے قبرستان لے آئی تھی' پلوشہ کو یوں لگا تھا کہ ماہ زیب اُس کا ہاتھ پکڑ کر چل نہیں رہی تھی' بلکہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اب وہ دونوں بہت سی قبروں کے درمیان کھڑی تھیں۔

''تم اب آنکھیں بند کرلو۔'' ماہ زیب کے کہتے ہی پلوشہ نے اپنی آنکھوں کو بند کرلیا اور ذرا دیر بعد اُس نے ماہ زیب کے کہنے پر اپنی آنکھوں کو کھولا تو' خود کو احرام مصر کے اطراف میں پایا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اُسے لے کر ایک مقبرے کی سیڑھیاں اترنے لگی اندر نیچے جاکر پلوشہ کو یوں لگا' جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں چلی آئی ہو جہاں پر مرد و خواتین مصری لباس زیب تن کیے اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔

''میں تم لوگوں سے اپنی دوست کو ملانے آئی ہوں۔'' ماہ زیب وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہوئی تھی۔ اُس کے مخاطب کرنے پر وہ سب پلوشہ کی جانب متوجہ ہوکر اُسے خوش آمدید کہنے لگے تھے۔

''تم اپنی اس دوست کو بھی ہمیشہ کے لیے یہاں لے آؤ۔'' ایک مصری عورت پلوشہ کو دیکھتے ہوئے ماہ زیب سے بولی۔

''ہاں بہت جلد لاؤں گی۔'' ماہ زیب پلوشہ کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے بولی' اور پھر واپس پلٹ گئی' تھوڑی ہی دیر بعد پلوشہ نے پہلے خود کو قبرستان میں پایا تھا اور پھر گھر پر۔

''کیسے لگے تمہیں میرے لوگ؟'' ماہ زیب نے پلوشہ کو لٹا کر اُس کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا تھا۔

پلوشہ بے بسی سے بس سر ہلا کر رہ گئی تھی اُس کو لگتا تھا کہ اس کا اپنا آپ اب اپنا نہیں رہا' بلکہ ماہ زیب کا ہے' اس کی ہر چیز پر وہ قابض ہوگئی تھی۔ پلوشہ اپنی زبان سے کسی کو اپنے اوپر ہنسنے والی باتیں نہیں بتا پاتی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیند کی گہری وادیوں میں اترگئی تھی۔

رات کے کسی پہر ابراہیم صاحب کی پیاس کی شدت سے آنکھ کھلی تھی وہ کچن میں پانی پی کر واپس پلٹ رہے تھے کہ کچن کے دروازے میں کھڑی عورت کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔

''کون ہو تم؟'' انہوں نے کانپتی آواز میں پوچھا تھا۔

''میں ماہ زیب ہوں' پلوشہ کی دوست' آپ کو یہ خبردار کرنے آئی ہوں کہ آپ اگر مجھے اُس سے دور کریں گے تو نتائج کے خود ذمے دار ہوں گے۔'' وہ ان کو دھمکی دے کر غائب ہوگئی تھی۔

ابراہیم وہیں کھڑے کھڑے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ وہ آج ہی تو عشاء کی نماز کے بعد مولوی صاحب سے ملے تھے اور پلوشہ کی کیفیت بتا کر انہیں گھر آنے کو کہا تھا۔ وہ پوری رات ابراہیم صاحب کی آنکھوں میں کٹی تھی۔ انہیں خود سے زیادہ اپنی بیٹی کی فکر تھی کہ اس کو کچھ نہ ہوجائے' فجر کے وقت جاکر آنکھ لگی تو صبح عجیب سے شور سے اُن کی آنکھ کھلی تھی۔

''یہ شور کیسا ہے؟'' کمرے سے باہر آکر انہوں نے پوچھا تھا۔

''آپ خود چل کر دیکھیے۔'' زرینہ بیگم کے چہرے پر گھبراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے وہ اُن کو لے کر گھر کے پچھلے حصے میں لے آئی جہاں پرندے پال رکھے تھے۔ اُن پرندوں کو کسی نے بری طرح سے کاٹ پیٹ کر' نہایت درندگی کے ساتھ ڈالا ہوا تھا۔

ابراہیم صاحب سمجھ گئے یہ سب ماہ زیب کا کیا دھرا ہے اور اُس کی دھمکی صرف دھمکی نہ تھی اس نے ان کو یہ سب کر کے دکھایا تھا۔

ابراہیم صاحب فوراً ہی مسجد گئے تھے اور مولوی صاحب کو ساری تفصیل بتائی تھی۔ مولوی صاحب نے ظہر کی نماز کے بعد اُن کے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

مولوی صاحب کے گھر میں آتے ہی پلوشہ جو اپنے کمرے میں تھی' بری طرح سے چیخنے اور چلانے لگی تھی' اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں' جیسے کوئی جانور ذبح کررہا ہو۔ اُس کے سب بہن بھائی خوف سے اس کو دیکھ رہے تھے' زرینہ بیگم کا بیٹی کی حالت دیکھ کر رو رو کر برا حال تھا۔

مولوی صاحب کلام پاک پڑھتے ہوئے پلوشہ کے کمرے میں داخل ہوئے تھے کہ اچانک پلوشہ نے اُن پر حملہ کر کے اُن کو زخمی کردیا تھا۔

''بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنی بیٹی کا کسی اور سے علاج کرائیں' کیونکہ وہ مخلوق بہت طاقتور ہے' میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔'' مولوی صاحب یہ کہہ کر چلے گئے تھے۔

ابراہیم صاحب بہت مایوسی سے بیٹی کی حالت دیکھ رہے تھے۔ بکھرے بال' مرجھائی ہوئی رنگت' آنکھوں کے گرد حلقے' یہ وہ پلوشہ نہیں تھی۔ زرینہ بیگم نے آگے بڑھ کر پلوشہ کو بیڈ پر لٹایا' دونوں ماں باپ' اُس کے پاس بیٹھے رہے' کبھی اُس کا سر دباتے کبھی ہاتھ پکڑتے' اُن کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں' کافی دیر بعد جب پلوشہ پُرسکون ہوکر سوگئی تو دونوں اُس کے کمرے سے اٹھ کر چلے آئے تھے۔

نیند کے عالم میں بھی پلوشہ کو یوں محسوس ہوا تھا کہ کوئی اُس کے پیروں کو کسی چیز سے جکڑ رہا ہے۔ اُس کی آنکھ کھلی تو ماہ زیب اس کے پیروں میں گھنگھرو باندھ رہی تھی۔

''یہ کیا کررہی ہو ماہ زیب؟'' پلوشہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

اب پلوشہ کو ماہ زیب سے ڈر نہیں لگتا تھا اُسے بھی اس کے ساتھ کی عادت ہوگئی تھی' پلوشہ اب روشنی سے گھبراتی تھی' کیونکہ ماہ زیب کو بھی روشنی سے وحشت ہوتی تھی۔

''تمہارے باپ نے میری بات سنی نہیں' تو اب میں اس کو سزا دوں گی' کھڑی ہوجاؤ اور ناچو۔'' ماہ زیب پلوشہ کو بیڈ سے اُتارنے کے لیے گھمبیرتے ہوئے بولی تھی۔

پلوشہ نے بیڈ سے اترتے ہی ناچنا شروع کردیا تھا۔ گھنگروں کی آواز پر ابراہیم صاحب اور زرینہ بیگم سب کمرے میں آگئے تھے۔ جہاں پلوشہ دیوانہ وار بال کھولے ناچ رہی تھی۔

''یہ کیا کررہی ہو؟'' ابراہیم صاحب نے آگے بڑھ کر بیٹی کو پکڑنا چاہا تھا مگر پلوشہ کے دھکے پر وہ اچھلتے ہوئے دور جاکر گرے تھے۔ زرینہ بیگم بیٹی کے زخمی پیر دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

''تمہیں خدا کا واسطہ' چھوڑ دو میری بیٹی کو۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر اُس نادیدہ وجود سے مخاطب ہوئی تھیں۔

''میں نے بولا تھا اس کے باپ کو' پلوشہ کو اس کے حال پر چھوڑ دے' مگر اس نے میری بات نہیں مانی۔'' پلوشہ کے اندر سے کسی اور عورت کی آواز ابھری۔

''اچھا ٹھیک ہے' مجھے تمہاری بات منظور ہے' مگر تم میری بیٹی کو تو اذیت نہ دو۔'' ابراہیم

صاحب کے بولتے ہی پلوشہ وہیں زمین پر غش کھا کر گر گئی۔ زرینہ بیگم نے آگے بڑھ کر تیزی سے اُسے تھاما ابراہیم صاحب بھی بیٹی کی جانب بڑھے تھے' پلوشہ کے بہن بھائی خوفزدہ سے اپنی بہن کو دیکھ رہے تھے۔

''مجھے معاف کردو پلوشہ میں نے تمہیں اتنی اذیت دی پر میں کیا کروں تمہارے باپ کو بھی تو سبق دینا تھا۔'' ماہ زیب پلوشہ کو نڈھال دیکھ کر روتی ہوئی بولی تھی۔

''یہ تمہاری کیسی محبت ہے ماہ زیب' جس میں سوائے میرے لیے تکلیف کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔'' انوشہ بے بسی سے رونے لگی تھی۔

ابراہیم صاحب بیٹی کو اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتے تھے مگر جب وہ علاج کا ارادہ کرتے تو پلوشہ جس اذیت سے گزرتی وہ اُن سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

وقت اور حالات کے ساتھ پلوشہ اب بہت بدل سی گئی تھی وہ اب کالج میں آ گئی تھی' ماہ زیب پڑھائی میں اُس کی بہت مدد کرتی تھی۔ وہ بھی ماہ زیب کے ساتھ کی عادی ہو گئی تھی۔ یا یوں کہا جائے اُس نے ماہ زیب کے اِس ساتھ کو اپنی مجبوری سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

خاندان میں اب کوئی پلوشہ سے نہ ملتا تھا سب دور دور رہتے تھے' اور تو اور اُس کے اپنے بہن بھائی بھی اُس سے دور ہو گئے تھے شروع شروع میں ان باتوں نے پلوشہ کو بہت دکھی کیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ ان کی عادی ہو گئی۔

اُن دنوں کالج میں مبین نامی ایک لڑکا پلوشہ میں کافی دلچسپی لے رہا تھا' اُسے پلوشہ کی ذہانت اور اُس کی خاموشی اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ وہ خود ہی اُس سے باتیں کرنے کے موقع تلاشتا' پلوشہ بھی اُس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

اب وہ دوبارہ سے ہنسنے اور بولنے بھی لگی تھی' مگر یہ سب ماہ زیب کو بہت ناگوار لگ رہا تھا اور پھر کچھ دنوں سے پلوشہ یہ دیکھنے لگی کہ مبین اُس کو دیکھ کر راستہ بدل لیتا' یا اُسے دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتا۔

''مبین تمہیں کیا ہو گیا ہے' کہاں مصروف ہو؟'' اُس روز پلوشہ خود ہی اُس سے پوچھ بیٹھی تھی۔

''پلوشہ پلیز مجھ سے بات مت کیا کرو۔'' مبین کے روکھے انداز پر پلوشہ حیرت زدہ ہو گئی تھی۔

''تم ایسا کیوں بول رہے ہو؟''

''پتا نہیں' پر تمہارا ساتھ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہو گیا ہے' جب سے تم سے دوستی ہوئی ہے مجھے کوئی نہ کوئی نقصان ہو رہا تھا جسے میں اپنا وہم سمجھ رہا تھا مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ تمہارے ساتھ بیٹھوں یا بات کروں تو میرے جسم میں ایک درد اٹھتا ہے' مجھے اب سمجھ آئی کہ کوئی تو بات ہے جو تم سے کوئی بات نہیں کرتا۔'' مبین کی یہ باتیں سننے کے بعد پلوشہ آنکھوں میں آنسو لیے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

''کیوں کر رہی ہو تم میرے ساتھ ایسا؟'' رات ماہ زیب کو اپنے پاس دیکھ کر پلوشہ چیخی تھی۔

''تم کیا مجھے جینے نہیں دو گی' مجھے کوئی حق نہیں کسی خوشی کا۔'' پلوشہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔

''تم صرف میری ہو پلوشہ' اور کسی کی نہیں تمہاری زندگی میں ایک وقت ایسا آئے گا جب تمہیں زندوں سے نفرت ہو جائے گی' تم کو مرے ہوئے لوگ اچھے لگنے لگیں گے' تم کو مرے ہوئے لوگ دیکھنا اچھا لگے گا۔''

ماہ زیب دھیرے سے اُس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی تھی۔

''ادھر آ جاؤ وہاں نہیں جاؤ۔'' عمر پلوشہ کو دیکھ کر اُس کی طرف بڑھا تو خالہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے بولیں۔

''کیوں اماں میں کیوں نہ جاؤں' پلوشہ آپی کی طرف؟'' آٹھ سالہ عمر ماں سے پوچھنے لگا۔

''کیونکہ یہ پاگل ہے' سب کو مارتی ہے۔'' دس سالہ ہانیہ پلوشہ کو دیکھ کر بولی' یہ باتیں سن کر پلوشہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

''تم اتنی اُداس کیوں بیٹھی ہو؟'' ماہ زیب نے بہت محبت بھرے لہجے میں پلوشہ سے پوچھا تھا۔

''دور ہو جاؤ تم یہاں سے' یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے' سب نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔''

''پر میں تو تمہارے ساتھ ہوں نا' اور میں نہیں چاہتی کہ میرے علاوہ اور کوئی تمہارے ساتھ ہو' اچھا تم ناراض نہ ہو' میں تمہیں ناراض نہیں دیکھ سکتی' چلو تم آنکھیں بند کرو۔''

ماہ زیب کے کہنے پر پلوشہ نے آنکھیں بند کر لیں اور جب کھولیں تو خود کو ماہ زیب کے ساتھ ایک حسین باغ میں پایا جہاں ہر طرف رنگ برنگ کے خوبصورت خوشبودار پھول تھے۔

پلوشہ محسور کن انداز میں اپنے اردگرد دیکھنے لگی تھی۔

''بس پلوشہ تم ناراض مت ہوا کرو اور رویا بھی نہ کرو' میں ایک بات تم کو بتاؤں' انسانوں کی محبت ہمیشہ خسارہ دیتی ہے' یہ محبت کی قدر نہیں کرتے' اِن کا خود غرضی میں کوئی ثانی نہیں ہوتا۔''

ماہ زیب نے ٹھیک کہا تھا پلوشہ کو اب انسانوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔

پلوشہ کے برابر والے گھر میں ثانیہ نامی ایک لڑکی رہتی تھی' اُس کی کرنٹ لگنے سے موت ہو گئی تھی' ثانیہ کی موت کے دو روز بعد ایک رات پلوشہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی کہ برابر والوں کی چھت پر اسے کوئی کھڑا نظر آیا' اُس نے غور کیا تو وہ ثانیہ تھی جو اپنے گھر کی چھت پر کھڑی تھی اور پھر اِس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا پلوشہ کو وہ لوگ نظر آنے لگے جو اب اس دنیا میں نہیں تھے۔

اُس رات ماہ زیب پلوشہ سے کہہ رہی تھی۔

''پلوشہ تم میرا عشق ہو میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی' تم میرے ساتھ میری دنیا میں جانے پر راضی نہیں اور میں تمہیں چھوڑنے پر راضی نہیں مگر بہت جلد تم میری دنیا کی طلب کرنے کرو گی۔''

پلوشہ کو اب وہ لوگ اپنے پاس نظر آتے جو اس دنیا سے چلے گئے تھے وہ آ کر اُس سے بات کرتے وہ بھی اُن سے باتیں کرتی' اب وہ بڑے آرام سے آدھی رات میں قبرستان چلی جاتی ماہ زیب جہاں کہتی اس کے ساتھ وہ چل دیتی تھی۔

اُس روز ابراہیم صاحب گھر میں سورۃ البقرۃ کی تلاوت کرنے لگے تھے جس پر پلوشہ کی حالت کافی بگڑنے لگی تھی وہ اپنی بیٹی کو یوں نہیں چھوڑ سکتے تھے' انہوں نے گھر میں سورۃ البقرۃ روزانہ پڑھنا شروع کر دی تھی جس پر ماہ زیب شدید ناراض تھی' اب پلوشہ آدھی آدھی رات کو قبرستان میں پڑی ملتی' کبھی وہ اتنا ہنستی کہ ناچتے ناچتے بے ہوش ہو جاتی' مگر ابراہیم صاحب نے سورۃ البقرۃ کی تلاوت نہیں چھوڑی تھی۔

اُن کو اپنے گھر میں سانپ نظر آنے لگے تھے'

مگر وہ پڑھتے رہتے تھے اُن کو خواب میں کسی نے کہا تھا کہ یہ گھر میں پڑھو اؤ اور خود بھی پڑھو' وہ پلوشہ کو زبردستی اپنے پاس بٹھا کر تلاوت کرتے' جس پر وہ پیپنے میں شرابور ہو کر بری طرح سے چیختی کہ اُسے زنجیروں سے باندھنا پڑتا۔

''پڑھو پلوشہ تم بھی میرے ساتھ پڑھو۔''

ابراہیم صاحب تلاوت کرتے ہوئے روتے ہوئے بولے وہ اپنی بیٹی کی ایسی حالت پر ٹوٹ گئے تھے مگر انہوں نے کسی صورت بھی اُس ماہ زیب سے اپنی بیٹی کا پیچھا چھڑانا تھا۔ بہت مشکلوں سے پلوشہ نے اُن کے ساتھ تلاوت کرنا شروع کی' آہستہ آہستہ وہ نارمل زندگی کی طرف واپس آنے لگی تھی اور پھر ابراہیم صاحب نے ایک بڑے عامل کے مشورے پر پلوشہ کو ملک سے باہر اپنی ایک عزیزہ کے پاس بھیج دیا تھا۔

☆.....☆

پلوشہ اب امریکہ میں رہتی ہے اور وہاں تعلیم بھی حاصل کر رہی ہے۔ میری اس سے کچھ دنوں پہلے ہی موبائل پر بات ہوئی تھی رُک رُک کر بولنے والی پلوشہ کو مجھے بار بار مخاطب کرنا پڑا تھا' ایسا لگتا تھا کہ وہ بات کرتے کرتے کہیں کھو سی جاتی ہے۔

''کیا ماہ زیب نے تمہیں اب چھوڑ دیا ہے؟'' میرے پوچھنے پر وہ چپ سی ہو گئی تھی' مگر جب بولی تھی تو اس کے لہجے کی نمی کو صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''نہیں فرح! اُس نے مجھے نہیں چھوڑا' وہ آج تک میرے ساتھ ہے' ہاں پر اب وہ مجھے نظر نہیں آتی' مگر اب بھی میں' اُس کو اپنے پاس محسوس کرتی ہوں۔ وہ مجھے بولتی ہے کہ میں نے اُس کی محبت کا یہ صلہ دیا وہ بولتی ہے پلوشہ تم خوشیوں کے لیے ترسو گی' تمہیں نہ کسی کا ساتھ نصیب ہو گا نہ کوئی خوشی ملے گی' کیونکہ تم نے مجھے اذیت دی۔ اُس کی سرگوشیاں میں اکثر سنتی رہی ہوں اور اس نے ٹھیک کہا ہے میں یہاں امریکہ میں ایک قابل اسٹوڈنٹ ہوں مجھے استاد پسند کرتے ہیں پر مجھ سے کوئی دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاتا' کیونکہ میرے ساتھ سے لوگوں کے نقصان ہوتے ہیں' اُن کو جسمانی اذیت ہوتی ہے۔

مجھے اب بھی روحیں نظر آتی ہیں۔ کوئی حادثہ کہیں ہونے والا ہو' مجھے بعض اوقات پہلے ہی محسوس ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی اب زندہ لوگوں سے وہ محبت نہیں رہی سچ بتاؤں تو مجھے اب اچھا لگتا ہے روحوں کے درمیان رہنا۔

بس میں تم سے ایک بات بولوں گی جو تم سب کو بتانا کہ کتنی بھی مشکل گھڑی ہو قرآن پاک کی تلاوت کرو' کیونکہ یہ ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

بس تم دعا کیا کرو' اللہ مجھے سکون دے' میں بہت بے سکون رہتی ہوں' آج بھی اتنے سال گزرنے کے بعد جب چاند کی تیرہ چودہ تاریخ آتی ہے تو ماہ زیب مجھے وہ اذیت دیتی ہے کہ میری دردناک چیخیں نہیں تھمتیں' اُس کی اس محبت نے مجھے زندگی بھر کا کرب اور اذیت دی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں دیا۔

آج میں بالکل تنہا اور سب سے دور اس وقت کو روتی ہوں جب میں اس میدان سے گزری تھی۔

میری سب پڑھنے والوں سے التجا ہے کہ وہ پلوشہ کے حق میں دعا کریں کہ اللہ اُسے سکون دے آمین۔

☆☆.....☆☆

قبر کے مکین

جو آنگن میں دیا اک جل رہا ہے
تیرے آنے کا شاید آسرا ہے

اُس لڑکی نے حرام موت کا انتخاب کیا اور قبر میں جا سوئی مگر مرنے کے بعد بھی اُسے چین نہ ملا' اُس کی چیخیں قبرستان کے باسی روز سنا کرتے.....

رضوانہ آفتاب

صارم اور وصی آج کافی دنوں کے بعد کہیں اسٹڈی کے بہانے اکٹھے ہوئے تھے۔ ورنہ دونوں ہی اپنے دھندوں میں خاصے مصروف تھے۔ یہ اُن دونوں کا فائنل ایئر تھا امتحان قریب

تھے یہی وجہ تھی کہ گھر والوں سے کمبائن اسٹڈی کا بہانہ بنا کر صارم وصی کے گھر میں آ موجود ہوا تھا۔ مگر پڑھنا تو نہیں تھا نہیں، وصی LED میں انگریزی ہارر مووی لگائے مونگ پھلی کھانے میں مگن تھا جبکہ صارم بے تاثر چہرے کے ساتھ اسکرین میں آتے سنسنی خیز مناظر ملاحظہ کر رہا تھا۔

"وصی یار چینل چینج کر۔" بہت ہی اندوہناک منظر دیکھ کر صارم کو خوف محسوس ہوا تھا۔

"کیوں تجھے ڈر لگ رہا ہے؟" وصی ہنسا تھا۔

"مجھے کیوں ڈر لگے گا چلو تھوڑا پڑھتے ہیں۔" اسکرین سے نظریں ہٹاتے صارم نے وصی سے اپنے خوف کو چھپانے کی سعی کی۔

"تو کون سا پڑھنے آیا ہے پوری پکچر تو دیکھنے دے۔" وصی کی نظریں ہنوز ایل ای ڈی کی اسکرین پہ مرکوز تھیں۔ اسکرین پر نظر آتے منظر نے صارم کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے قبر سے نکلتی آوازوں نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ صارم نے وصی سے ریموٹ جھپٹ کر ایل ای ڈی بند کر دیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے تیرے ساتھ دیکھنے تو دے۔" وصی جھلایا تھا۔

"مجھ سے باتیں کر کون سا میں روز تیرے گھر آ دھمکتا ہوں۔" صارم نے منہ پھلا لیا تھا اس کے پھولے منہ کو دیکھ کر وصی بے اختیار ہنسا تھا۔

"بول میری روٹھی لیلا کیا بات کروں تجھ سے۔" کشن کو گود میں رکھتے پاؤں میں کمبل ڈالتے وصی گویا ہوا تھا۔ جبکہ صارم اُسے ہی دیکھ رہا تھا رات کے تین بج رہے تھے اور دونوں نے اب تک کتابوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔

"اور سنا بھابی کیسی ہے؟" مونگ پھلی کا دانہ منہ میں ڈالتے وصی گویا تھا اس کے فربہ جسم اس کی خوش خوراکی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

"کون بھابی؟" اب صارم نے بھی مونگ پھلی چھیلتے استفسار کیا تھا۔

"ابے منتہا کی بات کر رہا ہوں 10 سال سے گرل فرینڈ ہے، اب تو اسے بھابی ہی کہنا چاہیے، بے چاری کب سے تیرا انتظار کر رہی ہے۔" وصی نے اسے دیکھتے آنکھ دبا کر کہا تھا۔

"کوئی بھابی وابی نہیں ہے وہ تیری، پچھلے ہی ہفتے میرا اس سے بریک اپ ہو چکا ہے، شکر ہے اس بلا سے جان تو چھوٹی آپی نے جب سے وہاں سے گھر منتقل کیا ہے اس ایریا میں جانے کا جواز بھی ختم ہو گیا ورنہ اکثر گلی میں کھڑی ہی دکھ جاتی تھی۔" صارم قدرے منہ بنائے گویا ہوا تھا۔

"سب پتا ہے تو نے ہی اپنے پیار میں پھنسا کر اُسے پاگل بنایا تھا اور اب اس بریک اپ کی کیا تک بنتی ہے بتا ذرا؟" وصی نے خفگی سے کہا تھا۔

"چپ کر جا اس کے لگتے سلگتے تجھے اس کا کچھ زیادہ ہی درد نہیں ہوتا اتنا درد ہے تو، تو ہی اس سے بیاہ رچا لے میں تو اس سے شادی کر نہیں سکتا، مجھے تو ایک ایسی لڑکی کی تلاش ہے جو ان خرافات سے دور ہو۔" صارم نے موبائل فون اور لیپ ٹاپ کی جانب اشارہ کیا تھا۔

"تو ان خرافات سے دور کیوں نہیں ہو جاتا خود پہلے پاکباز بن جا پھر ہی کوئی پارسا ملے گی نہ۔" وصی نے گہرا طنز کیا تھا۔

"تو بے نا پارسا مولوی ٹائپ سڑیل انسان اب مجھے درس دینا بند کر دے۔" صارم نے وصی کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"بریک اپ کی وجہ بتانا پسند کریں گے آپ؟" وصی نے مزید وضاحت طلب کرنا ضروری خیال کیا تھا۔

"اس سردرد سے بندہ بریک اپ نہ کرے تو کیا کرے ہر وقت ایک ہی سوال گھر والوں کو کب بھیجو گے؟ ہر وقت ٹالا کہ کچھ دن صبر کر لو مگر ڈھاک کے تین پات۔" صارم چڑا ہوا تھا۔

"تو تجھے بچپن میں عشق فرمانے کا مشورہ کس عقل مند نے دیا تھا اسے تیرے ساتھ عشق کرتے 10 سالوں کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ شادی کا مطالبہ نہیں کرے گی تو بیچاری کیا کرے گی۔" وصی کے لہجے میں تلخی گھلی تھی۔

"خاموش ہو جا حمایتی بھائی، میں نے اسے کہہ دیا ہے اگر اب اس نے مجھے کال کی تو میں اسے جان سے مار دوں گا، پھر اپنی تصویروں اور ویڈیوز لیک ہونے کی ذمہ دار تم خود ہو گی، شرافت سے میری زندگی سے دفع ہو جاؤ، ابھی تو زندگی کی چوبیس بہاریں ہی تو دیکھی ہیں میں نے، ابراڈ جا کر خود کو منوانا ہے، اس دو ٹکے کی لڑکی سے شادی کر کے لائف مرڈر کرنے کا شوق نہیں ہے مجھے۔" بھینچے سے لیتے ہوئے صارم کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

"تو نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا چاچی کو کہہ کر بات پکی کر لے پھر بھلے سے ابراڈ چلا جا۔" وصی نے مفت مشورے سے نوازا تھا۔

"یار میں اس کے ساتھ سیریس کب تھا مجھے اس سے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔" صارم کا فیصلہ حتمی تھا۔

"پھر اس نے رابطہ کیا؟" وصی نے استفسار کیا تھا۔

"نہیں ہمیشہ تو بے شرموں کی طرح رابطہ کر لیتی ہے، دس باتیں اور گالیاں بھی سناؤ تو کوئی اثر نہیں ہوتا، اک ہفتہ ہو گیا ہے مگر اب تک اس کا کوئی میسج بھی نہیں آیا۔" چینل تبدیل کرتے صارم کے لہجے میں لاپرواہی تھی۔

"کہیں صدمے سے بیمار تو نہیں ہو گئی؟" وصی کے لہجے میں تشویش تھی اسے منتہا سے بڑی ہمدردی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ صارم سے اس کی حمایت میں اکثر بول جاتا تھا۔

"اسے اتنا مت یاد کر، رات کے اس پہر موصوفہ کی ہچکیاں بندھ جائیں گی۔" صارم کے انداز میں خفگی تھی اس کے لب و لہجے میں سرد مہری کا عنصر خاصا نمایاں تھا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اس موضوع کا اختتام صارم کے غصے پر ہی ہوا تھا۔ اسی لمحے صارم کا موبائل فون گنگنا اٹھا۔

"اب کس کی کال آ گئی؟" وصی نے دیوار گھڑی پر نظر ڈالتے تعجب سے استفسار کیا تھا۔

"تیری لگتی سگتی کی عمر بے حد لمبی پائی ہے محترمہ نے سوتیلے بھائی نے یاد کیا اور بہنا حاضر ہو گئی۔" صارم نے نخوت سے ناک سکیڑ کے کہا۔

"ریسیو کر لے پتا نہیں کیا کہہ رہی ہو گی۔" صارم کی باتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وصی ہاتھ جھاڑتے کمبل میں دبک گیا تھا۔

"تمہیں میں نے کال کرنے سے منع کیا تھا نا؟ پھر کس خوشی میں کال کر کے میرا دماغ خراب کر رہی ہو؟" کال پک کرتے ہی صارم منتہا پر بری طرح دھاڑا تھا۔ جبکہ وصی نے اشارے سے اس کے کول ڈاؤن رہنے کا مشورہ دیا تھا جس پر صارم مسلسل اسے گھور رہا تھا۔

"منتہا تم پاگل تو نہیں ہو گئی، رات کے 3 بج رہے ہیں یہ مذاق کا وقت نہیں ہے سمجھی تم۔" صارم کے ماتھے پر پسینے کے قطرے منجمد ہوئے تھے، وہ

ملتجا پر غرایا تھا۔

''میں قبرستان کیوں آؤں یہ کیسی عجیب سی آوازیں آ رہی ہیں تم کہاں سے بات کر رہی ہو؟'' وصی ان کی گفتگو سن کر کمبل ہٹائے صارم کے دائیں جانب بیٹھا تھا صارم کو پاگلوں کی طرح چیختے دیکھ کر اس نے اس کا شانہ ہلایا تھا۔

''یاپوش نگر قبرستان کے دائیں طرف کی تازہ قبر کیا ہوگیا ہے آر یو میڈ؟'' صارم دھاڑا تھا اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وصی نے جیسے ہی اس کے ہاتھ سے فون جھپٹا کال بند ہوچکی تھی۔ وصی نے میز سے جگ اٹھائے گلاس میں پانی انڈیل کر صارم کو تھمایا تھا۔

اس نے ایک ہی گھونٹ میں پانی سے بھرے گلاس کو خالی کردیا تھا۔ اس کے لبوں پر پاپڑی سی جم گئی تھی آنکھوں میں وحشت کے سائے تھے اس کا چہرا لٹھے کی مانند سپید ہورہا تھا۔ اس کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وصی نے سختی سے اس کا شانہ تھام رکھا تھا۔

''صارم کچھ تو بتاؤ' آخر ہوا کیا ہے؟'' وصی تفکر سے گویا تھا اس نے صارم کی یہ حالت پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

''یار وہ ملتجا۔'' صارم خاموش ہوگیا۔

''کیا ہوگیا سب خیریت ہے نہ؟ تو کیسی فضول قسم کی باتیں کر رہا تھا۔'' وصی نے گھبرا کر استفسار کیا تھا۔

''میں فضول باتیں کر رہا تھا' وہ فضول باتیں کر رہی تھی۔ صارم نے ہکلا کر جواب دیا وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

''کہہ کیا رہی تھی؟'' وصی نے پوچھا۔

''مجھے قبرستان بلا رہی تھی۔''

''پر کیوں؟'' اب وصی کے ہاتھ سرد ہوئے تھے۔

''کہہ رہی تھی مجھے تم نے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی نہ اب آ کر مار لو میں تو پہلے ہی مر چکی ہوں۔'' صارم سخت خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

''چل تجھے ڈرا رہی ہوگی سب کو پتا ہے تجھے ہارر موویز سے کس قدر خوف آتا ہے' مذاق کر رہی ہوگی۔'' اس کا شانہ تھپکتے وصی نے اسے سمجھانے کی سعی کی تھی۔ وصی کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے وہ فقط صارم کا خوف کم کرنے کو یہ سب کہہ رہا تھا ورنہ خوفزدہ تو وہ بھی ہوگیا تھا۔

''یار اس نے قبر کا ایڈریس بھی بتایا ہے' اور اس کے آس پاس نہایت ہی بھیانک قسم کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کئی بدروحیں آپس میں بغلگیر ہوکر کورس میں رو رہی ہوں۔'' صارم کا خوف کے مارے برا حال ہورہا تھا جبکہ وصی کی حالت بھی غیر ہوتی جا رہی تھی۔

''چل تو پریشان نہ ہو' ایسا کچھ نہیں ہوگا' تو ہارر فلم دیکھ کر ڈر گیا ہے' اب تجھے اس قسم کی فلمیں میں نہیں دکھاؤں گا۔ اب خواہ مخواہ ذہن پر زور مت ڈال' اب سونے کی کوشش کرو' صبح دیکھیں گے پھر کال کر کے میری اس سے بات کروانا میں اسے کہوں گا پیار محبت اپنی جگہ پر تیری کمزوری پا کر تجھے اتنا ڈرا رہی ہے حیرت ہے۔'' وصی سخت متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ صارم پر کمبل ڈالے وہ دوسرے بیڈ پر سونے کی غرض سے لیٹا تھا مگر نیند کی دیوی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ صارم کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا جو سونے کی اداکاری کرنے میں ہلکان ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

''صارم اب جاگ بھی جاؤ۔ باہر ناشتہ کرتے ہیں پھر قبرستان چلیں گے۔'' وصی کھڑکی کے پردے ہٹاتے گویا تھا گھڑی صبح کے دس بجا رہی تھی سردیوں کے اوائل دن تھے۔ ماحول کافی خنک تھا کمرا مقفل ہونے کے باوجود بھی بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا صارم نے کسلمندی سے آنکھ کھولی تھی۔

''کیا یار تھوڑی دیر پہلے ہی تو آنکھ لگی تھی۔'' صارم زچ نظر آ رہا تھا۔

''کل دیر تک سو جانا' آج اس سلسلے کو ختم کر ڈالتے ہیں۔'' کمرے میں بلب جلاتے وصی جیکٹ پہنتے ہوئے ہم کلام تھا۔ وہ دونوں ساڑھے دس بجے ڈھابے پر موجود تھے۔ صارم نے صرف چائے لی تھی وہ خاصا ڈسٹرب تھا جبکہ وصی بھی چائے ہی پی رہا تھا۔ اسے ملتجا سے ایسی حماقت کی ہرگز بھی توقع نہ تھی وہ تو اسے خاصا سمجھدار سمجھتا تھا۔

''چلو چلیں۔'' چائے کا مگ خالی کرتے صارم کو سوچوں کے گرداب سے نکالنے کے لیے وصی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

بائیک کی چابی میز سے اٹھائے اس نے صارم کو اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ صارم نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے اس کی تقلید کی تھی امتحان قریب تھے۔ وصی کو علم تھا صارم ان چیزوں سے سخت خوفزدہ ہو جاتا ہے۔

وہ اس کا خوف زائل کرنے کے لیے اسے قبرستان لے جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا یہ ملتجا کی شرارت ہے کیونکہ کال کٹنے کے بعد اس نے اپنے نمبر سے بھی ٹرائی کیا تھا۔ مگر ملتجا کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔

اسی اثناء میں وصی کا موبائل فون بج اٹھا بائیک سائیڈ پر روکے اس نے کال ریسیو کی تھی۔

''کیا ہوا سب خیریت تو ہے؟'' وصی کو پریشان دیکھ کر صارم نے استفسار کیا تھا۔

''نہیں یار فرحان بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے' آپی نے اسپتال بلایا ہے' چلو وہیں چلیں۔'' اپنے بہنوئی کے بابت بتاتے وصی نے دوبارہ بائیک اسٹارٹ کی تھی۔

اسپتال کا راستہ وصی نے نہایت تیزی میں طے کیا تھا۔ فرحان صاحب کی حالت بہت سیریس تھی۔ وصی کی بہن اور اس کے سسرالی بھی خاصے پریشان تھے۔ صارم اور وصی نے بھی بلڈ بینک میں جا کر خون دیا تھا۔ ان ساری پریشانیوں میں صارم اور وصی فون کال کے بابت بھول چکے تھے۔ مغرب کے بعد ان کی حالت سنبھلی تھی اب وہ خطرے سے باہر تھے۔

سب نے ہی سکھ کا سانس لیا تھا۔ وصی کے امی' بابا بھی اسپتال پہنچ چکے تھے۔ بھائی کے ہونے سے ایقہ کو بہت حوصلہ ملا تھا ورنہ وہ بالکل پریشان ہوگئی تھیں بھائی چھوٹا ہو یا بڑا وہ بہنوں کا مان ہوتا ہے بہنوں کے دکھ درد انہیں تکلیف میں مبتلا کر دیا کرتے ہیں' بہنوں کو تنگ کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہوتا اور اگر کوئی اور ان کی بہنوں کو تنگ کرے یہ ان سے برداشت بھی نہیں ہوتا' بھائیوں کا ساتھ بہنوں کے لیے ایک چھت کی سی حیثیت رکھتا ہے اور اس چھت کے سائے تلے بہنیں خود کو محفوظ تصور کرتی ہیں۔

اس کڑے وقت میں وصی نے ایقہ کا خوب ساتھ دیا تھا۔ ایقہ صارم اور وصی کی ممنون نظر آ رہی تھیں۔

''وصی بیٹا جاؤ آرام کرلو۔ صارم بھی تھک گیا ہوگا۔'' شوہر کی طبیعت سنبھلتے ہی ایقہ خاصی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

''نہیں آپی میں یہیں ہوں۔'' وصی ویٹنگ

ایریا میں موجود تھا انیقہ کو چائے بسکٹ تھماتے وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''میرا پیارا بھائی' اللہ تمہیں سدا سلامت رکھیں' اچانک ایسی خبر نے دہلا دیا تھا مجھے' اگر تم نہ آتے تو پتا نہیں میں کیسے سب سنبھالتی۔'' انیقہ آبدیدہ ہوئی تھیں جبکہ صارم خاموشی سے دونوں بھائی بہنوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

''ارے آپی آپ اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہیں جب تک آپ کا بھائی سلامت ہے آپ کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔'' وصی نے انیقہ کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر تسلی دی تھی۔

''یہ کس کا فون ہے؟ چار چنگ پر لگا بج رہا ہے۔'' انیقہ کی نند ہاتھ میں موبائل تھامے ڈینگ ایریا میں آئی تھی۔

''میرا ہے۔'' صارم نے آگے بڑھ کر سیل فون تھاما تھا جبکہ وصی کی نظریں صارم پر ہی مرکوز تھیں اسکرین پر جگمگاتے نمبر کو دیکھ کر صارم پریشان ہوا تھا وصی کو جانتے میں لمحہ بھی نہیں لگا تھا کہ کس کی کال ہو سکتی ہے۔

''چلو صارم باہر چلیں' آپی ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں' صارم کو تھوڑا کام ہے۔'' وصی یہ کہتے ہوئے اٹھا تھا۔

''ہاں جاؤ' آرام سے فریش ہو کر آنا۔'' وصی کے سر پر ہاتھ پھیرتے انیقہ مسکرائی تھیں سفید دوپٹے کے ہالے میں مقید چہرا نہایت پاکیزہ لگ رہی تھی۔

''ہیلو کیوں کال کر رہی ہو مجھے؟'' صارم چلایا تھا۔

''تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟'' منتہا کی ہنسی میں ٹوٹے کانچ کی کرچیاں تھیں۔

''مجھے تم سے ملنے کا شوق نہیں' آئندہ کال مت کرنا۔'' صارم نے ڈانٹ کر کہا تھا۔ عین اسی وقت وصی اس کے پشت پر کھڑا ہوا تھا۔

''بی کول.....'' اس کا شانہ ہلاتے وصی نے اسے سمجھایا تھا۔

''میں نے جہاں بلایا تھا وہاں آ کے ملو' میں تمہارا کب سے انتظار کر رہی ہوں' مجھے جان سے کب مارو گے میری جان۔'' منتہا پھر سے ہنس کر گویا ہوئی تھی اس کی ہنسی میں گہرا طنز تھا۔ صارم نے اس کی ایسی ہنسی پہلی بار سنی تھی۔

''تم پاگل تو نہیں ہو گئی؟ یا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟'' صارم غضبناک ہوا تھا۔

''نہ میں پاگل ہوئی ہوں اور نہ ہی میرا دماغ خراب ہوا ہے' تم آؤ تو سہی۔'' اس نے اصرار سے کہہ کر لائن منقطع کر دیا تھا۔

''اب اس نے کیا کہا؟'' وصی نے اس کے سامنے آ کر استفسار کیا۔

''وہیں بلا رہی ہے' تھی تو بلا کی ڈرپوک' قبرستان بلا کر پتا نہیں کون سا تماشہ بنانا چاہ رہی ہے۔'' صارم سخت چڑا ہوا تھا۔

''تو پریشان نہ ہو' وہ جان بوجھ کر تجھے خوفزدہ کر رہی ہے' وہ سمجھ رہی ہے تو وہاں جائے گا ہی نہیں اور وہ تجھے ہمہ وقت خوف میں مبتلا کرتی رہا کرے گی' ہم ابھی چل کر اس قصے کو یہیں ختم کر دیتے ہیں۔'' وصی کا انداز وضاحتی تھا۔

''یار رات ہو رہی ہے' صبح چلیں گے۔'' صارم نے اسے سمجھانے کی سعی کی تھی۔

''تو گھبرا مت میں ہوں نہ تیرے ساتھ' خود ہی اصلیت سامنے آ جائے گی پھر میں خود اسے فون کروں گا کہ ایسا مذاق آئندہ نہ کرے' فی الحال مطلوبہ جگہ چلتے ہیں۔'' وصی نے اسے حوصلہ فراہم کیا تھا۔

''آج ہی اس سلسلے کو ختم کرو۔'' وصی نے یہ کہتے ہوئے بائیک اسٹارٹ کی تھی صارم اس کے عقب میں بیٹھے کسی گہری سوچ میں غرق ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

صارم اور وصی جب قبرستان کے احاطے میں پہنچے تو مساجد سے مغرب کی نمازیں ادا کی جانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''وصی میں آگے نہیں جا رہا۔'' وصی کو قبرستان میں چلتے دیکھ کر صارم سخت خوفزدہ ہوا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے صارم؟ تم تو ایسی حرکتیں کر رہے ہو جیسے پہلی مرتبہ قبرستان آئے ہو' مر کے ہمیں یہیں آنا ہے' یہی ہمارا اصلی گھر ہو گا۔'' وصی نے یہ کہتے ہوئے صارم کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''اب بتا اس نے کس جگہ بلایا تھا؟'' آگے بڑھتے وصی نے سوال کیا تھا۔

''کہہ رہی تھی قبرستان کے دائیں جانب نیم کے پودے کے نیچے ملے گی۔'' صارم کے لفظوں میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔

وصی کچھ کہے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دور چل کر ہی انہیں نیم کا پودا دکھائی دیا تھا اور اک تازہ قبر پر گلاب کے پھول کی تر و تازہ پتیاں بکھری پڑی نظر آ رہی تھیں۔ قبر پر نام کی تختی لگی ہوئی تھی جس پر منتہا حسن ولد رحمن فاروقی درج تھا۔ صارم تو اس واقعے کے ابتداء سے ہی بے تحاشہ خوفزدہ تھا۔

مگر یہ دیکھ کر وصی کے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ وہ دونوں قبر کے بائیں جانب ایستادہ تھے۔ وصی کے ہاتھ میں چھوٹا سا ٹارچ تھا جس کی مدد سے وہ قبر کو دیکھ رہا تھا۔ عین اسی سے قبر سے اک نسوانی ہاتھ برآمد ہوا تھا جسے نا صارم اور نہ ہی وصی دیکھ پایا تھا۔

''وصی چلو نکلو یہاں سے۔'' صارم کی گھبراہٹ نمایاں تھی جھینگروں کی بے ہنگم آواز نے ماحول کو مزید بھیانک بنا دیا تھا۔ رات کی تاریکی مکمل طور پر اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ وصی بھی صارم کا ہاتھ تھامے پیچھے ہٹا تھا۔ مگر یہ کیا صارم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ وصی نے اندھیرے میں صارم کو اپنی جانب کھینچنے کی بہت کوشش کی تھی مگر صارم وہیں جم سا گیا تھا۔ وصی کے ہاتھوں سے ٹارچ گرا تھا وہ ٹارچ اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ اس کی نظر صارم کے پیروں پر ٹھہر گئی تھی۔

صارم کے دونوں پاؤں قبر سے نکلے نسوانی ہاتھوں نے بے انتہا بری طرح سے جکڑ رکھے تھے۔ جبکہ صارم آنکھیں پھاڑے گلے سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکال رہا تھا۔

''تو آخر تم آ ہی گئے' صارم اب اس قبر میں' میں تنہا نہیں رہوں گی' مجھے یہاں کے اندھیرے سے خوف آتا ہے' اب تم بھی یہاں میرے ساتھ ہی رہو گے' زندگی میں تو تم نے مجھے دھتکار دیا تمہارے لیے میں جان سے گزر گئی' اب ہم دونوں اس قبر کے مکین بن کر رہیں گے۔''

منتہا کی زہر خند آواز نے وصی کا سحر توڑا تھا صارم قبر کی جانب کھنچا جا رہا تھا اور منتہا کی درد ناک ہنسی پورے قبرستان میں گونج کر ماحول کو مزید پُراسرار بنا رہی تھی۔ جھینگر اولوں کی آوازاور منتہا کی خطرناک ہنسی پورے قبرستان میں گونج کر ان دونوں کا دل دہلا رہی تھی۔

وصی نے فوراً صارم کا ہاتھ چھوڑا تھا وہ تیزی سے اس قبر سے دور نکل رہا تھا تاکہ مدد کے لیے کسی کو بلا سکے۔

غزل

بچپن کی تصویر کو پاکر روئی تھی
نینوں سے میں نیر بہا کر روئی تھی

کتنا ظلم کیا تھا مجھ پہ حاکم نے
عدل کی زنجیر ہلا کر روئی تھی

صحراؤں میں سسی بن کر آئی تھی
پنوں کے کچھ خواب سجا کر روئی تھی

میرے عشق کا صدمہ کتنا گہرا تھا
ہر اک کو میں حال سنا کر روئی تھی

کل شب لوٹ کر گھر کو آنا تھا
کمرے میں کچھ پھول سجا کر روئی تھی

لوٹ کر آنے کا تو صرف بہانہ تھا
گھر کا ہر اک دیپ بجھا کر روئی تھی

فریدہ فری۔ لاہور

صارم بے حس و حرکت قبر کی جانب کھنچتا جارہا تھا۔ وصی بدحواسی کے عالم میں سرپٹ بھاگتے کسی سے بری طرح ٹکرایا تھا۔

"کیا ہوا بیٹے ایسے کیوں بھاگ رہے ہو؟" گھپ اندھیرے کے باعث وہ کسی شخص کو دیکھ تو نہیں پایا تھا مگر وصی کی گھبراہٹ میں تھوڑی کمی ضرور واقع ہوئی تھی۔

"انکل وہ میرا دوست وہ قبر میں جارہا ہے' آپ جلدی چلیں میرے ساتھ۔" وہ ان کا ہاتھ تھامے بھاگتا ہوا اس قبر تک آیا تھا۔ صارم کے دونوں پیر قبر کے اندر دھنس چکے تھے اب اس کا گھٹنوں تک جسم مٹی کے اوپری سطح پر دکھائی دے رہا تھا۔ وصی نے فوراً صارم کو شانوں سے تھام لیا تھا۔

باباجی نے یہ منظر دیکھ کر کچھ کہا نہیں تھا وہ آنکھیں بند کیے کوئی ورد کرنے میں مشغول تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود پانی کی بوتل میں کچھ آیتیں پڑھ کے دم کیں اور قبر کے اطراف میں چھڑکنا شروع کردیا۔ قبر سے نکلے ہاتھ میں وہ جیسے جیسے پانی ڈالتے جارہے تھے ہاتھ قبر کے اندر جارہا تھا۔ ملتجا کی ناگوار چیخوں کی آواز پورے قبرستان میں چھارہی تھی۔

باباجی بھی مستقل پڑھتے جارہے تھے انہوں نے صارم کا دایاں ہاتھ تھام کر اسے قبر سے اٹھایا تھا باباجی کے ہاتھ تھامنے سے صارم اٹھا تھا مگر جتنا حصہ اس کا قبر میں مدفون ہوا تھا وہ ملتجا کے ہاتھوں سمیت قبر میں غائب ہوچکا تھا اور قبر دوبارہ سے اپنی اصلی حالت میں واپس آگئی تھی۔

وصی باباجی کی مدد سے بے ہوش صارم کو کاندھے پر لادے اسپتال لے آیا تھا۔ صارم ICU میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا جبکہ باباجی مسلسل

ورد کررہے تھے۔

وصی نے صارم کے گھر والوں کو بھی اطلاع کردی تھی۔ سب بھاگے چلے آئے تھے جب سب کو حقیقت کا ادراک ہوا تو کسی سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

صارم کی امی اور بہن مسلسل روتی جارہی تھیں۔ جبکہ وصی باباجی کے ساتھ بینچ پر بیٹھے غم سے نڈھال تھا۔

"باباجی آپ پلیز گھر چلے جائیں' کافی وقت سے آپ میرے ساتھ ہیں۔"

وصی سفید کپڑوں میں ملبوس نورانی چہرے والے شخص سے مخاطب تھا۔ انہی کی وجہ سے صارم کی جان بچ پائی تھی۔ اس حادثے میں صارم کا ایک پاؤں گھٹنوں اور دوسرا ٹخنوں سے ختم ہوگیا تھا۔ اگر باباجی بروقت نہ آسکتے تو صارم کا مکمل وجود قبر کی گہرائیوں میں جاچھپتا۔

"بیٹا میں تو تمہیں اکیلا پاکر رک گیا کہ وہ لڑکی تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچادے کیونکہ میرے لیے تو اس کا ہر حربہ ناکام رہے گا مگر وہ تمہیں اور تمہارے دوست کو فجر ہونے تک نقصان پہنچا سکتی تھی اسی لیے میں یہاں رُکا رہا۔"

انہوں نے کینٹین سے پانی کی بوتل منگوا کر اس میں دم کردیا تھا اور وہ پانی وصی کو پلادیا تھا۔

"تم اب اس سے محفوظ رہو گے میں کچھ آیتیں تمہیں لکھ کر دے رہا ہوں جو تم مستقل پڑھتے رہنا اور اپنے دوست کو بھی پڑھنے کی تلقین کرنا انشاءاللہ اب تم دونوں اس بلا سے محفوظ رہو گے۔"

وہ صارم کے سر پر ہاتھ پھیرتے اس پر دم کرکے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ صارم کے گھر والے ان کے بے حد مشکور تھے۔ وہ انہیں اپنی خوشی سے کچھ پیسے دینا چاہتے تھے۔ جس کے لیے باباجی نے انہیں سختی سے منع کردیا تھا۔ وہ گھر جانے کے لیے اسپتال سے نکل ہی رہے تھے وصی انہیں گاڑی میں بٹھانے آیا تھا۔

باباجی وصی کا شانہ تھپک رہے تھے۔

"بیٹا تم ایک بہت اچھے دوست ہو جس نے برے وقت میں بھی اپنے دوست کا ساتھ نہ چھوڑا اللہ تمہیں بہت کامیاب کرے گا' اس لڑکی نے حرام موت کا انتخاب کرکے غلط کیا اپنی آخرت خراب کرلی۔ مگر صارم بیٹے نے بھی اس لڑکی کے ساتھ غلط کیا اگر وہ اسے آسرے میں نہ رکھتا تو ایسا نہ ہوتا مگر اسے اپنے کیے کی سزا مل گئی اللہ سے بڑا کوئی منصف نہیں یہ اس کے لیے سبق ہے اللہ بچے ہدایت دے' اگر کبھی دوبارہ میری ضرورت ہو تو مجھے یاد کرلینا۔" انہوں نے کارڈ وصی کی جانب بڑھایا تھا۔

وصی نے ان کا کارڈ تھام کر فوراً باباجی کا ہاتھ تھام لیا تھا وصی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"باباجی آپ نے نہایت کٹھن وقت میں میری مدد کی میں آپ کا بے انتہا مشکور ہوں' آپ سے شکریہ کہنے کے لیے بھی میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔" وصی کی آنکھوں سے آنسو چھلکا تھا۔

"بیٹے میں وہاں اپنی اہلیہ کی قبر میں فاتحہ پڑھنے آیا تھا قبرستان سے عجیب وغریب وحشت ناک سی آوازیں مجھے بھی آرہی تھیں میں اسی جانب آرہا تھا جو تم مجھ سے ٹکرا گئے' بیٹا انسان ہی انسان کی مدد کرتا ہے میں نے جو بھی کیا انسانیت کے ناطے کیا اللہ نے جو مجھے تھوڑا بہت علم دے رکھا ہے اگر میں اس علم سے انسانوں کی بے غرض مدد نہ کروں تو میرا علم بے کار ہے بیٹا اب مجھے اجازت دو۔" وصی کا شانہ تھپکتے باباجی رکشے میں

سوار ہوئے تھے۔ وصی رکشے کو دور تک جاتا دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

صارم دوا دودھ کے ساتھ کھاؤ۔'' وصی نے دودھ کا گلاس آگے بڑھایا تھا۔ صارم ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوچکا تھا۔ وہ وہیل چیئر کے سہارے کہیں آجاسکتا تھا۔

وصی روز اس سے ملنے آتا تھا۔ مگر صارم کے لب سل گئے تھے۔

وہ کسی سے کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ وصی ہمیشہ اس سے بات کرنے کی سعی کرتا تھا مگر صارم کے لب خاموش ہی رہتے تھے۔

''کیا ہوگیا ہے تجھے صارم تو کوئی بات ہی نہیں کرتا۔'' وصی خفگی سے گویا تھا۔

''کیا بولوں' کہنے کے لیے باقی کچھ بچا ہی نہیں ہے۔'' صارم آبدیدہ تھا۔ وصی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کچھ بھی بولو اپنے دل کا بوجھ ہی کم کرلو' کچھ بھی ختم نہیں ہوا میرے یار۔'' وصی نے اس کے ہاتھوں میں دباؤ ڈالا تھا۔

''کیا کہوں' زندگی نے یکدم الگ ہی رخ اختیار کرلیا ہے' ایسا تو کبھی خیالوں میں بھی سوچا نہ تھا جیسا میرے ساتھ ہوا ہے۔'' صارم غمگین تھا وصی نے اسے ٹوکا نہیں۔

''میں نے ملتجا کے ساتھ غلط کیا میری وجہ سے اس نے حرام موت کا انتخاب کیا۔ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی عمر بھر کے لیے ایک گہرے اذیت کے پاتال میں دھکیل دیا میں چاہ کر بھی اس حادثے کو فراموش نہیں کرسکتا۔ اسی حادثے نے مجھے معذور کردیا۔ مجھے جو اپنے فٹنس باڈی پر بڑا ناز تھا اپنی باڈی کو خوبصورت بنانے کے لیے میں جم میں گھنٹوں گزارتا تھا۔ بہترین ڈائٹ لیتا تھا۔ کلب میں میری واہ واہ تھی۔

ایک ہی جھٹکے میں میرا وقار اور زعم خاک کی نذر ہوگیا۔ میں کیا سے کیا ہوگیا۔ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ میرے ساتھ زندگی نے بھی کیا عجیب مذاق کیا ہے۔'' صارم کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی تھی۔

وصی بھی خاصا افسردہ تھا۔ اس حادثے نے اس کی رات کی نیندیں اڑادی تھیں دونوں میں گہرا تغیر رونما ہوا تھا۔ دونوں کے اندر جو شوخی پائی جاتی تھی مفقود ہوگئی تھی۔ وہ دونوں ہی سنجیدہ اور بردبار ہوگئے تھے۔ آخر کار زندگی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی بہت سے حادثات ہوتے ہیں۔ جو ہمیں یکدم بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ کچھ حادثات ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیں سمندر کی گہرائیوں میں ڈبو دیتے ہیں۔

وہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا متحرک زندگی ساکت ہوجاتی ہے۔ زندہ دل انسان مردے سے بدتر ہوجاتا ہے۔ سنجیدگی انسان میں عمر سے نہیں حادثات اور تجربوں سے آتی ہے اور یہ حادثہ صارم اور وصی کے ساتھ ہوچکا تھا اس حادثے نے ان دونوں پر عمر بھر کے لیے سوچ کے نئے در وا کردیے تھے۔ وصی تو خیر اس حادثے کا چشم دید گواہ تھا۔

مگر صارم تو اس حادثے کا شکار ہوا تھا اور اسی حادثے نے صارم کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں رونما کی تھیں۔ صارم کی زندگی دوسروں کے لیے ایک سبق بن کر رہ گئی تھی اور صارم کی زندگی کا یہ سبق صرف دوسروں کے لیے نہیں بلکہ خود اس کے لیے بھی تھا۔

☆☆......☆☆

پھوپو کی روح

یہ کرب تیرگی بس رات بھر نہیں ہے کیا ؟
پھر اس کے بعد عذاب سحر نہیں ہے کیا ؟

وہ ہاتھ میں کفن لیے اُس کو لینے آتی تھی' سوتے' جاگتے اگر آپ کو بھی مردہ نظر آنے لگے تو کیا کیفیت ہوگی......

نازیہ بتول رضا

انسانی زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی رونما ہوتے ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسے آسانی سے تسلیم نہیں کرپاتی لیکن ہمارے تسلیم نہ کرنے سے یا آنکھیں چرانے سے حالات بدل تو

نہیں جاتے بلکہ حقیقت اپنے تمام تر وجود کے ساتھ ہماری زندگی سے جونک کی طرح چمٹ جاتی ہے اور پھر اسے تسلیم کئے بنا چارہ بھی نہیں رہتا ایسا ہی ایک ناقابل یقین اور پُراسرار قصہ میں آپ کو سنانے جارہی ہوں۔

جس پر یقین کرنا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے لیکن سچائی تو سچائی ہے اس پر بالآخر یقین کرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ انسانی زندگی ایسے پُراسرار واقعات سے بھری پڑی ہے ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوا ہوتا ہے جس کو عقل تسلیم نہیں کرتی لیکن بہرحال ایسا ہوتا ہے۔

یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی اور آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے آنکھیں بند کروں تو سب کچھ ایک ڈراؤنی فلم کی طرح چلنے لگتا ہے اس واقعے کی پُراسراریت میرے رونگٹے کھڑے کردیتی ہے۔ میں اس دن اسکول سے گھر لوٹی تو امی کہیں جانے کی تیاری کررہی تھیں۔

''امی کہاں جارہی ہیں؟''

''ارے بیٹا میں بلقیس خالہ کی بہو کو دیکھنے جارہی ہوں بے چاری کی حالت بہت خراب ہے۔'' امی عبایا پہنتے ہوئے بولیں تو میں چونک گئی اور میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''کیوں امی کیا ہوا ہے انہیں؟ ابھی تھوڑے دنوں پہلے انہیں دیکھا تھا تو اچھی بھلی تھیں یوں اچانک کیا ہوگیا؟''

''ہاں بیٹا یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ اسے اچانک کیا ہوا ہے۔ تو جاکر ہی معلوم ہوگا۔'' اتنی دیر میں امی عبایا پہن کر نکلنے لگیں تو مجھ سے بولیں۔

''اچھا میں چلتی ہوں تم کھانا وغیرہ کھا کر سو جانا۔''

''جی امی خدا حافظ۔'' میں نے کہا اور امی کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے اندر آگئی ذہن میں یہی سوچ تھی کہ اتنی صحت مند نورین بھابی کو اچانک کیا ہوگیا کہ اُن کی حالت بگڑ گئی بہت سوچنے کے بعد بھی جب عقل سمجھنے کا م نہ کیا تو میں نے ذہن جھٹک کر کھانا کھایا اور سوگئی ظاہر ہے کہ امی سے ہی تفصیل پتہ چلتی اور اس کے لیے امی کا انتظار کرنا ضروری تھا۔

میں شام میں اٹھ کر ابھی نماز عصر ادا کررہی تھی کہ امی آگئیں باجی نے امی کو چائے بنا کر دی اور میں مجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر امی کے پاس جا بیٹھی باجی بھی شاید صورت حال جاننے کو بے تاب تھیں سو کام کاج چھوڑ کر وہیں آ بیٹھیں اور بات کا آغاز کیا۔

''اب کیسی طبیعت ہے امی نورین بھابی کی۔'' میرے کان کھڑے ہوگئے۔

''ارے بیٹا مت پوچھو بہت بری حالت ہے بے چاری کی..... کتنی صحت مند تھیں ناں..... اور اب دیکھو دبلی بھی ہورہی ہے چہرہ زرد پڑ گیا ہے اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں' نظر کھا گئی ہے اُسے تو۔'' امی تاسف سے بولیں۔

''لیکن ایسا کیا ہوگیا امی انہیں کہ ایک ہفتے میں اُن کا یہ حال ہوگیا؟'' میں نے پوچھا میں دراصل پوری بات جاننا چاہ رہی تھی اڑتی اڑتی میرے کانوں میں خبر آئی تھی کہ آج کل وہ ڈر رہی ہیں خوفزدہ ہیں کوئی انہیں دکھائی دے رہا ہے لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ امی ہمیں بتانا نہیں چاہ رہی تھیں کہ اصل صورت حال کیا ہے کہ کہیں ہم خوفزدہ نہ ہوجائیں لیکن ہمیں تو خبر مل ہی چکی تھی اس لیے اصل بات پوچھ بیٹھی۔

''میں نے سنا ہے کہ انہیں کوئی دکھائی دے رہا ہے جس سے وہ خوفزدہ ہیں اور خوف سے ان کا یہ حال ہوگیا ہے پوری بات بتائیں امی۔'' میرے منہ سے سن کر امی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر باجی کو دیکھا وہ سمجھ گئیں کہ ہم سب جانتی ہیں تعجب سے بولیں۔

''مگر تم دونوں کو کیسے پتہ یہ سب؟ کس نے بتایا تمہیں؟''

''بس امی پتہ چل گیا یہ باتیں کب چھپتی ہیں پلیز آپ بتائیں ناں۔'' میں نے اصرار کیا تو امی بولیں۔

''دراصل اسے اپنی پھوپو نظر آرہی ہیں جو اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں اس کی ان پھوپو کا انتقال ابھی دس دن پہلے ہوا ہے۔'' امی کے منہ سے سچائی سن کر حیرت وخوف سے باجی اور میں دھک سے رہ گئے۔

''یعنی انہیں اپنی پھوپو کی روح نظر آرہی ہے؟'' میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''ہاں.....'' امی نے تصدیق کردی اب اس سے آگے کی کہانی نورین بھابی کی زبانی سنیے۔

☆.....☆.....☆

میں ایک صحت منداور جوان شادی شدہ عورت ہوں تین بچے ہیں بھرے سسرال میں رہتی ہوں اور ایک بھرپور خوشحال زندگی گزار رہی ہوں۔ یہ سب اس لیے بتارہی ہوں کہ میری کہانی سن کر کوئی شاید ہی یقین کرے' اکثر لوگ مجھے نفسیاتی مریضہ سمجھیں گے کیونکہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے وہ ناقابل یقین ہے یقین کرنا نہ کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے بس اتنا کہوں گی کہ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے یہ سب مجھ پر گزری ہے اس لیے اس کی کٹی میرے حلق میں میری زندگی میں مجھے آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

میری ایک ہی پھوپو تھیں ہم تو ان سے بہت پیار کرتے تھے بظاہر وہ بھی کرتی تھیں اب ان کے دل کا اللہ ہی جانے کہ ان کے دل میں ہمارے لیے کیسے احساسات تھے بہرحال میری شادی کے بعد ان کا انتقال ہوگیا میں نے بھی شرکت کی فطرتاً آنسو بھی بہائے دکھ بھی ہوا اور میں اپنے گھر لوٹ آئی۔

ابھی سوئم ہی ہوا تھا کہ ایک رات میں نے پھوپو کو خواب میں دیکھا وہ کہہ رہی تھیں۔

''چل نورین میرے ساتھ چل میں بہت اکیلی ہوں تجھے لینے آئی ہوں۔'' ان کے ہاتھ میں کفن تھا یہ سن کر میں خوفزدہ ہوگئی خوف سے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا اور ڈرتے ڈرتے میں نے کہا۔

''لیکن پھوپو آپ تو مرچکی ہیں آپ قبرستان میں رہتی ہیں میں وہاں کیسے رہ سکتی ہوں میں تو زندہ ہوں' میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

''نہیں دیکھ میں تیرے لیے کفن لائی ہوں یہ پہن کر میرے ساتھ چل۔'' وہ بضد تھیں وہ آگے بڑھیں اور میرا ہاتھ پکڑ لیا ان کی گرفت بہت سخت تھی۔ وہ مجھے کھینچنے لگیں وہ ساتھ لے جانے پر بضد تھیں اور میں خوفزدہ ہوکر مسلسل انکار کررہی تھی۔

''نہیں پھوپو میں نہیں جاؤں گی' مجھے چھوڑ دیں۔'' اور میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھی میرے چیخنے سے میرے شوہر بھی اٹھ بیٹھے میں خوف سے کانپ رہی تھی پسینے میں شرابور تھی اور مسلسل کہہ رہی تھی۔

''مجھے چھوڑ دیں پھوپو۔'' میرے شوہر نے مجھے جھنجھوڑا۔

''کیا ہوا ہے نورین اٹھو ہوش کرو۔'' ان کے جھنجھوڑنے پر میں اس خواب سے باہر آئی تھی یعنی میں خواب دیکھ رہی تھی میں نے خوف کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا میرے شوہر سامنے بیٹھے مجھے حیرت

و پریشانی سے دیکھ رہے تھے وہ سمجھ گئے تھے کہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے کہنے لگے۔

''کیا ہوا خواب میں ڈر گئی ہو؟''

''جی وہ پھوپو...... وہ کہہ رہی تھیں کہ میرے ساتھ چلو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور مجھے کھینچ رہی تھیں ان کے ہاتھ میں...... کفن بھی تھا جو وہ میرے لیے لائی تھیں میں...... میں بہت ڈر گئی تھی۔'' میں کہہ کر رونے لگی میرے شوہر نے مجھے تسلی دی کہ وہ محض ایک خواب تھا ایسا کچھ نہیں ہے پھر انہوں نے مجھے پانی پلا کر سلانے لٹا دیا میں خاموشی سے لیٹ گئی لیکن پھر ساری رات سو نہیں سکی ایسا لگتا تھا کہ آنکھیں بند کروں گی تو پھوپو کفن لے کر آ جائیں گی میں ساری رات جاگتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اس کے بعد تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا میں جیسے ہی سونے لیٹتی دن ہو یا رات مجھے پھوپو کفن لیے نظر آتیں اور مجھے ساتھ لے جانے کی ضد کرتیں میں منع کرتی، روتی چیختی چلاتی لیکن وہ سب نظر انداز کر کے مجھے گھسیٹنے لگتیں اور میں خوف سے چیختی ہوئی بیدار ہو جاتی لیکن اٹھنے کے بعد بھی میں روتی رہتی میرے ذہن و دل میں شدید خوف بیٹھ گیا میں رات تو کیا دن میں بھی سونے سے گریز کرنے لگی۔

میں نے سونا ترک کیا تو پھوپو مجھے جاگتے میں دکھائی دینے لگیں۔

ہوا یوں کہ میں اپنی ساس کے ساتھ بیٹھی تھی وہ مجھے سمجھا رہی تھیں۔

''بیٹا یہ تمہارا وہم ہے وہ صرف ایک خواب تھا ایسا کچھ حقیقت میں نہیں ہو سکتا تم اس طرح جاگ جاگ کر بیمار پڑ جاؤ گی تم خوف کی وجہ سے تین راتوں سے سوئی نہیں ہو دیکھو آنکھوں کے گرد کیسے حلقے پڑ گئے ہیں کتنی کمزور ہو گئی ہو۔'' وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بول رہی تھیں اور میں شرمندہ ہو رہی تھی کہ میں نے سب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا لیا تب میری آنکھوں سے دو آنسو لڑھک گئے تو انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور ہلکے ہلکے میری کمر تھپتھپانے لگیں۔

مجھے محبت بھرا شانہ کیا ملا میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی میری ساس نے مجھے رونے دیا ماں تو سر پر تھی نہیں جو تسلی یا دلاسہ دیتی لیکن اس کڑے وقت میں میری ساس نے بجائے مجھ پر طنز و تنقید کرنے کے مجھے تسلی دی محبت دی جسے پا کر میں نہال ہو گئی انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھاما اور بولیں۔

''بس اب رونا مت' اور مجھ سے وعدہ کرو کہ آج چاہے تمہیں نیند کی دوا کھانی پڑے تم سوؤ گی ضرور۔'' اُن کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا انہوں نے اپنے ہی تخت پر مجھے لٹا دیا اور خود نماز پڑھنے لگیں میں نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی جھپاک سے پھوپو کفن لیے آ دھمکیں اور بولیں۔

''میرے ساتھ چلو۔'' میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھی ساس نماز پڑھ رہی تھیں مجھے لگا پھوپو دروازے میں کھڑی ہیں میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف جو دیکھا تو میری جان ہی نکل گئی پھوپو سامنے ہی کھڑی تھیں اور معمول کے مطابق کفن اُن کے ہاتھ میں تھا ان کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور وہ بڑی پُراسرار مسکراہٹ سجائے مجھے ہی دیکھ رہی تھیں مجھے خیال گزرا کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی پھوپو تو مر چکی ہیں پر مجھے کیوں نظر آ رہی ہیں۔

لیکن نہیں میں جاگ رہی تھی پھوپو کی نظروں میں میری نظریں ٹکرائیں تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی خوف سے زبان گنگ ہو گئی اور مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا میں چیخنا چاہ رہی تھی لیکن میری آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی پھوپو کفن لیے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھیں میں اُٹھ کر بھاگنا چاہتی تھی یا اپنی ساس کو آواز دینا چاہتی تھی لیکن اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔

وہ میرے بہت نزدیک آ گئیں ان کے کفن سے اُٹھتی کافور کی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اُف کتنی مضبوط گرفت تھی ان کی' اور تبھی میرے حلق سے دلدوز چیخ برآمد ہوئی اسی وقت میری ساس نے سلام پھیرا میں پھوپو سے اپنا ہاتھ چھڑا رہی تھی اور روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''مجھے چھوڑ دیں پھوپو مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔'' اور پھوپو بضد تھیں۔

''نہیں میں تیرے لیے کفن لائی ہوں تجھے میرے ساتھ چلنا ہی ہوگا چل میرے ساتھ۔''

میری ساس کو تو ظاہر ہے پھوپو دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ ساری صورت حال سمجھ گئیں وہ آگے بڑھ کر مجھ پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگیں یکدم پھوپو نے جھٹکے سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں اپنی ساس سے لپٹ کر رونے لگی انہوں نے کچھ دیر مجھے رونے دیا پھر پوچھا۔

''کیا ہوا تھا؟''

''وہ...... پھوپو...... پھوپو مجھے ساتھ لے جانے آئی تھیں ان کے ہاتھ میں کفن بھی تھا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھیں۔'' میں روتے روتے بتانے لگی۔

''مجھے بچا لیں امی میں مر جاؤں گی۔'' میری ہچکیاں بندھ گئیں میری ساس نے مجھے تسلی دے کر پانی پلایا۔

''نہیں بیٹا تمہیں کچھ نہیں ہوگا میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' پھر بولیں۔

''واقعی تمہیں پھوپو جاگتے میں دکھائی دیں؟ یا یہ ایک خواب تھا؟'' ان کے لہجے میں اب بھی بے یقینی تھی انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی ابھی میں نے اپنی مری ہوئی پھوپو کو اپنے سامنے دیکھا وہ بھی جاگتے ہوئے پورے ہوش و حواس میں' ظاہر ہے کہ کوئی بھی یقین نہیں کرتا کیونکہ پھوپو صرف مجھے نظر آ رہی تھیں میں بے بسی سے روتے ہوئے بولی۔

''امی میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتی ہوں میں نے پھوپو کو حقیقت میں دیکھا۔'' اچانک میری نظر میرے ہاتھ پر پڑی وہاں پھوپو کی انگلیوں کے نشان تھے میں نے فوراً اپنی ساس کو دکھایا۔

''یہ دیکھیں امی میرے ہاتھ پر پھوپو کی گرفت کتنی سخت تھی۔'' میرا ہاتھ دیکھ کر میری ساس کو یقین آ گیا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں وہ بولیں۔

''اگر ایسا ہے تو پھر خطرناک صورت حال ہے ہمیں فوراً کچھ کرنا پڑے گا ورنہ......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی اور میرے شوہر کو فون کر کے فوراً گھر آنے کو کہا میرے شوہر جاب پر تھے لیکن میری طرف سے فکر مند تھے فوراً ہی آ پہنچے میری ساس نے ساری بات میرے شوہر کو بتائی سن کر میرے شوہر بھی پریشان ہو گئے اور بولے۔

''اب ہم کیا کریں امی؟''

''بیٹا تم کسی اچھے عامل کو ڈھونڈ کر لاؤ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔''

''لیکن اچھا عامل ایک دم ملنا بہت مشکل ہے پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں آپ بے فکر رہیں۔'' پھر میرے شوہر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''نورین سب ٹھیک ہو جائے گا تم پریشان

مت ہو میں ابھی اسی کام کے لیے نکل رہا ہوں اللہ پر بھروسہ رکھو۔“

”خالد پلیز کچھ کریں مجھے لگتا ہے کہ میں مرجاؤں گی۔“ میں رو دی۔

”خدا نہ کرے کچھ نہیں ہوگا تمہیں میں کچھ کرتا ہوں حوصلہ رکھو۔“ میرے شوہر مجھے تسلی دیتے باہر نکل گئے۔ اور میری ساس مجھ پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگیں میں آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہی تھی۔ خوف سے آنکھیں بند نہیں کر رہی تھی بچے میری حالت کی وجہ سے الگ سہمے سہمے سے تھے پچھلے دو دنوں سے میں ساس کے کمرے میں ہی تھی اب تو صورت حال قابو میں تھی کہ پھوپو صرف مجھے خواب میں ہی نظر آ رہی تھیں لیکن اب اس وقت جب وہ مجسم خود سامنے کفن لے کر آ گئیں تو میرے ساتھ ساتھ میری ساس اور شوہر بھی پریشان ہو گئے کیونکہ بہر حال پھوپو مر چکی تھیں اور ایک مرے ہوئے انسان کا اس دنیا میں زندہ انسانوں کے پاس آنے کا کیا مقصد؟ صورت حال کافی گھمبیر تھی۔

خیر جیسے تیسے دو گھنٹے گزرے اور میرے شوہر واپس آئے میری ساس اور میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔

”میرے ایک دوست نے ایک عامل کے بارے میں بتایا ہے لیکن ابھی وہ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں کسی کا مسئلہ حل کرنے‘ کل تک انشاءاللہ آ جائیں گے ہمیں بہر حال تب تک اُن کا انتظار کرنا ہی ہوگا۔“ وہ سنجیدگی سے بولے میں کچھ نہ بولی بس ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی اس وقت میں شدید بخار میں تپ رہی تھی اور انتظار کے سوا چارہ نہ تھا میرے شوہر میری کیفیت سمجھ رہے تھے کچھ دیر خاموشی سے کھڑے مجھے دیکھتے رہے پھر میرا ہاتھ تھام کر بولے۔

”تم پریشان مت ہو حوصلہ رکھو میں ہوں ناں

غزل

خواہشوں کی رنگ برنگ تتلیاں
ہاتھ میں آتے ہی‘ ہوئیں بے رنگ تتلیاں

گھنگھور بادلوں کا اٹھالے چلیں جو بوجھ
کس دیس میں برسیں نکلیں جاکر وہ بدلیاں

اک ذرہ قسمت کو اشارے کی دیر ہے
گرنے کو بیتاب ہیں نشیمن پہ بجلیاں

گہنا دیا ہے جذبوں کو وقت کی دھول نے
بس ہیں اپنے اندر آج بھی وہ بڑی بوڑھیاں

تھیں سہیلیاں بھی جو باہم رضا سے
ایسی بچھڑی کہ مل نہ پائیں وہ ہمجولیاں

حوصلہ پھر سے پکارے عہد ساز
ہے عزم سے کھڑی ہیں شکستہ حویلیاں

مومینہ بتول

دُنیا میں کس جگہ

سچّی کہانیاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ ”سچی کہانیاں“ کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے‘ دیکھتے‘ محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں ”سچی کہانیاں“ کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ ”سچی کہانیاں“ پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے ”سچی کہانیاں“ میں آپ بیتیاں‘ جگ بیتیاں‘ اعترافات‘ جرم و سزا کی کہانیاں‘ ناقابل یقین کہانیاں‘ دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ ”سچی کہانیاں“ میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121-35893122

ای میل : pearlpublications@hotmail.com

تمہارے ساتھ، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' ان کے ان جملوں نے میری بہت ہمت بندھائی وہ رات میرے لیے بہت بھاری تھی مجھے تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھوپو دکھائی دے رہی تھیں سونے کا تو تصور ہی نہیں تھا میں جاگتی رہی بلکہ میرے ساتھ ساتھ میری ساس اور شوہر بھی جاگتے رہے انہوں نے ایک پل کے لیے بھی مجھے تنہا نہیں چھوڑا جیسے تیسے کر کے رات گزری اور صبح نمودار ہوئی بچے اسکول چلے گئے۔

دوپہر کے وقت میرے شوہر اپنے دوست کے ساتھ عاقل صاحب کو لینے چلے گئے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا پھوپو کی روح تو میرے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی تھی خوف کی وجہ سے میں بہت کمزور اور لاغر ہو چکی تھی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی ایک ہی ہفتے میں برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

تقریباً شام پانچ بجے میرے شوہر عاقل صاحب کو لے کر آگئے عاقل صاحب کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی وہ ایک نورانی صورت باریش بزرگ تھے میں دوپٹہ سر پر اوڑھ کر ایک طرف بیٹھ گئی انہوں نے آتے ہی پانی پر دم کر کے مجھے پلایا ایک تعویذ موم جامہ کر کے میرے گلے میں ڈالا اس کے بعد ایک تعویذ اور رائی کے کچھ دانے پڑھ کر میرے شوہر کو دیتے ہوئے بولے۔

''یہ تعویذ اپنے گھر کے داخلی دروازے میں زمین کھود کے دبا دو اور یہ رائی کے دانے اپنی گلی میں اور اپنے دروازے کے باہر ڈال دو انشاء اللہ کرم ہوگا۔'' میرے شوہر نے ان کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے کر ان کی ہدایت کے مطابق عمل کیا پھر بابا جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر میرے اوپر دم کیا جس سے مجھے بے حد سکون ملا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹی آج سے بے فکر ہو کر سونا کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا رہی بات تمہاری پھوپو کی تو ہو سکتا ہے وہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں یا تم سے کوئی اٹکا ہوا کام کروانا چاہتی ہوں اسی لیے صرف تمہیں ہی دکھائی دیں لیکن فطری عمل ہے کہ تم ڈر گئیں بہرحال تم ان کے لیے ایصال ثواب کرو کچھ نیک کام کر کے ان کے لیے صدقہ جاریہ کر دو انشاء اللہ وہ آئندہ تمہیں تنگ نہیں کریں گی میں نے ان کے راستے بند کر دیے ہیں اب وہ حقیقت میں تو کیا بھی خواب میں بھی نہیں تنگ کریں گی بس تم نماز کی پابندی کرو اور درود پاک کا ورد رکھو اللہ حامی و ناصر ہو خوش رہو۔'' وہ میرے سر پر ہاتھ رکھتے اٹھ کھڑے ہوئے میرے شوہر فوراً آگے بڑھے۔

''بابا جی کچھ ہدیہ نذرانہ پیش کروں۔''

''نہیں بیٹا ہم فی سبیل اللہ مخلوق خدا کی خدمت کرتے ہیں بس کسی غریب کی مدد کر دینا سمجھنا کہ ہمارا ہدیہ ہمیں مل گیا اب ہم چلتے ہیں ہمیں چھوڑ آؤ۔'' وہ کمرے سے نکل گئے اور میرے شوہر ان کے پیچھے ان کو چھوڑنے چل دیے۔

اس رات میں بہت دن بعد سکون کی نیند سوئی صبح اٹھی تو ایک روشن صبح میری منتظر تھی میں بشاش بشاش تھی میں نے نماز فجر ادا کی اور شکر کے نوافل ادا کیے میرے پروردگار نے مجھے نئی زندگی بخشی تھی۔

بے شک میرا پروردگار بے حد رحمن و رحیم ہے ہم ہی ناشکرے بندے ہیں۔ مجھے مطمئن دیکھ کر میرے بچے بھی خوش تھے میں نے بچوں کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ کروا کر اسکول روانہ کیا اس دن کے بعد مجھے پھوپو کی روح کبھی نظر نہیں آئی لیکن آج بھی جب میں وہ دن یاد کرتی ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

☆☆.....☆☆

میں انتقام لوں گی

کبھی تو چوٹ کے خود پر بھی رو دل تنہا
تو زخم زخم ہے، تجھ کو خبر نہیں ہے کیا ؟

حیدر نے بابا اور نور کو زندہ جلا دیا تھا مگر پھر وہ دونوں بدروح بن کر لوٹ آئیں اور اپنا انتقام لے لیا.....

مریم شاہ بخاری

سردیوں کی طویل سیاہ رات تھی ہر شے پر ایک جامد خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر سو ایک ہُو کا عالم تھا۔ ساری دنیا میٹھی اور گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی ایسے میں حیدر خان کی انجانے خوف سے

آنکھ کھلی' اُس کا سارا وجود پسینے سے تر بتر تھا اور اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور پھر یکا یک اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی' اپنے بستر میں کسی غیر مرئی مخلوق کی موجودگی کے احساس نے اُس کے حواس کھو دیے تھے۔ حیدر خان کے حلق سے زوردار چیخ نکلی تھی' دوسرے کمرے میں بچوں کے ساتھ سوئی اُس کی بیوی دوڑی دوڑی آئی' اُس کے پیچھے ہی بچے بھی سہمے سہمے چلے آئے تھے۔

''کک..... کیا ہوا؟'' بیوی تیزی سے اپنے شوہر کی طرف لپکی تھی۔ حیدر خان نے اپنے بچوں کی جانب دیکھا اور سنبھل گیا بچوں کے خوف سے زرد پڑتے رنگ اُس کو تڑپا گئے تھے۔

''کچھ نہیں' ڈراؤنا خواب دیکھا تھا نیند میں چیخ نکل گئی۔

وہ اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا' اُسے پتہ تھا اگر میں نے اپنے اندر کا خوف ظاہر کر دیا تو میرے بیوی بچے جو پہلے ہی گھر میں غیر انسانی حرکتوں سے ڈرے اور پریشان ہیں مزید خوفزدہ ہو جائیں گے۔

''آؤ بچو میرے پاس آ جاؤ۔'' اُس نے اپنے بچوں جو کہ دونوں لڑکے تھے اپنے قریب بلایا اور اپنے ساتھ بستر میں لٹا لیا۔

''جاؤ نگینہ تم بھی لیٹ جاؤ۔''

اُس کی بیوی پریشان نظروں سے اُسے تکتی ہوئی ساتھ والی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی' کچھ ہی دیر میں اُس کے بیوی اور بچے نیند کی وادی میں اُتر چکے تھے۔ جبکہ حیدر خان کی نیند اڑ چکی تھی' جانے کیوں اُسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ کچھ غلط ہونے جا رہا ہے۔ اُس کی نظروں کے سامنے بار بار ماضی کی فلم ریوائنڈ ہو کر آ جاتی تھی۔ منیر کی چبھن تیز سے تیز تر ہو چکی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں یادوں کے رنگ لہو رنگ ہو گئے تھے۔ اسے اپنا انجام نظر آنے لگا تھا۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح نور کی کرنیں پوری طرح بیدار ہو کر دیوار و در کو روشن کر رہی تھیں' آج بہت دنوں بعد سورج نے اپنی صورت دکھائی تھی' حیدر خان جاگ چکا تھا' لیکن اس کا دل بستر سے نکلنے کو نہیں چاہ رہا تھا' اس کی بیوی نگینہ اسے کئی مرتبہ پکار چکی تھی کہ ناشتہ کر لے..... بچے اسکول جا چکے تھے۔

''اٹھ جاؤ' حیدر' کب تک یونہی پڑے رہو گے؟'' وہ جو رات پیش آنے والے واقعے میں کھویا ہوا تھا چونک پڑا۔ نگینہ ایک بار پھر اس کے سرہانے آن کھڑی ہوئی تھی۔

''آتا ہوں چلو تم.....'' وہ انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا رخ غسل خانے کی جانب تھا۔ ابھی اُس نے غسل خانے میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ نگینہ کی چیخوں نے حیدر خان کو ہلا کے رکھ دیا۔ وہ الٹے قدموں دوڑا اور باورچی خانے میں آ گیا جہاں نگینہ اپنے آنچل سے لپٹی آگ کے شعلوں کو ہاتھوں سے بجھا رہی تھی۔ جو بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ حیدر خان نے جلدی سے اس کا آنچل گردن اور کمر سے الگ کر کے فرش پر پھینکا تھا۔ نگینہ خوف سے کانپتی ہوئی حیدر سے لپٹ گئی تھی۔ حیدر نے فرش پر پڑے آنچل کو دیکھا تھا جس کی آگ حیرت انگیز طور پر خود بہ خود بجھ چکی تھی' اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے نگینہ کو خود سے مزید قریب کر لیا اور اسے باہر صحن میں بچھی چارپائی پر لا کے بٹھا دیا۔ اُس کے ہاتھوں کو دیکھا جو آگ بجھانے کی کوشش میں خاصے جل چکے تھے اور آبلے ابھر آئے تھے۔ نگینہ بہت ڈری اور سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ حیدر نے اس کے ہاتھوں پر دوا لگائی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''آگ کیسے لگی تھی؟ کدھر دھیان تھا تمہارا؟''

''مجھے نہیں پتہ حیدر' مجھے کچھ خبر نہیں..... میں تو چائے کی دھیمی چولہے پر رکھ کر دودھ نکالنے کے لیے مڑی تھی کہ اچانک ایک عجیب سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔''

''آواز..... کیسی آواز؟'' حیدر چونکا تھا۔

''ہاں آواز..... شاید کوئی پکار رہا تھا..... آگ لگے گی' ہاں آگ لگے گی..... بس اتنی سی آواز میرے کانوں میں پڑی اور اس کے بعد میرے دوپٹے نے آگ پکڑ لی۔'' حیدر کو تفصیل بتاتے ہوئے نگینہ کا رنگ ایک بار پھر زرد پڑ چکا تھا۔

حیدر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے میرے خدا.....!'' اُس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ ایک جھما کا سا ہوا تھا اُس کی نظروں کے سامنے شعلوں میں گھرا ایک مکان کا منظر اُس کی بند آنکھوں میں در آیا تھا۔ اُس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''اوہ میرا ماضی.....!'' اُس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

☆.....☆.....☆

حیدر نے ہوش سنبھالا تھا تو اس نے خود کو اپنی بیوہ خالہ کے گھر پایا تھا۔ وہ چند ماہ کا ہی تھا کہ اُس کے والدین ایک ناگہانی سوزی مرض کا شکار ہو کر چل بسے۔ ددھیال والوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اُس کو پروان چڑھاتا۔ اُس کی ماں کی ایک ہی بہن تھی جو عین جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی' اُس کی واحد اولاد ایک لڑکی تھی جب اُس کی خالہ نے اپنے بھانجے کو بے یار و مددگار پایا تو وہ اُسے ساتھ لے کر اپنے گھر چلی آئی یوں حیدر اپنی خالہ کی گود میں پرورش پانے لگا۔ اُس کی خالہ کی لڑکی 'بانو' اُس سے پانچ سال بڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ تو حیدر کی صورت میں کھلونا آ گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں جوان ہوتے گئے۔

حیدر کب بانو کے دل میں اترا اُسے کوئی خبر نہ ہوئی۔ بانو عام سے نقوش والی سنہری رنگت کی مالک لڑکی تھی' جبکہ حیدر بہت خوبصورت تھا۔ سفید رنگت اور تیکھے تیکھے سے نقوش' اُس کی خالہ بہت امیر نہ تھی' لیکن پھر بھی اُن کا ہاتھ خاصا کھلا تھا ایک خوبصورت سا گھر تھا جو مرتے وقت اُن کا مرحوم شوہر اُن کے نام کر گیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی لاکھوں کا قرضہ بھی تھا جو بیوی نے ہی ادا کرنا تھا۔ خالہ خاصی جی دار خاتون تھیں۔ دکانوں سے حاصل ہونے والا کرایہ اس مہنگائی کے دور میں ناکافی تھا۔ سو انہوں نے کپڑے سینے شروع کر دیے تھے۔ ساتھ ہی بانو کو بھی سلائی میں طاق کر دیا' مگر اُس کے شوہر پر لاکھوں کا جو قرضہ تھا وہ کسی صورت اترتا نہ دکھائی دیا تو مجبوراً دونوں دکانیں بیچ کر قرضہ اُتارنا پڑا۔ باقی کی رقم تین لاکھ انہوں نے بانو کے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھلوا کر رکھ دی تھی۔ حیدر اُس وقت آٹھویں کا طالب علم تھا۔ بانو کو پڑھائی سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی' اُس نے ساتویں کے بعد ہی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ خالہ بیٹی کی طرف سے خاصی فکر مند رہنے لگی تھیں کیونکہ بانو پر ٹوٹ

کر جوانی آئی تھی۔ وہ اُس کے رشتے کے لیے کوششیں کرنے لگی تھیں حیدر دس جماعتیں پاس کر کے ایک قریبی میڈیکل اسٹور پر سیلز مین لگ چکا تھا' اُس وقت حیدر کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال تھی' لیکن اچھی صحت اور قد کاٹھ کی وجہ سے وہ بیس بائیس کا نظر آتا تھا۔ یہاں اُس کی دوستی ایسے لڑکوں سے ہوگئی جو صرف عیاشیاں کرنے کے لیے پارٹ ٹائم جاب کرتے ہیں۔ حیدر کے رنگ ڈھنگ بھی بدلنے لگے' اُس نے خود پر توجہ دینی شروع کردی' کسرتی بدن اس کی کمزوری تھا اس نے جم جانا شروع کردیا' چند ہی ماہ میں اُس کا بدن ایک ہاڈی بلڈر کے بدن کی طرح نظر آنے لگا۔ ٹائٹ جینز اور ہاف بازوؤں والی شرٹ پہن کر جب وہ گھر سے نکلتا تو بہت سی لڑکیاں آہیں بھرنے لگتیں' ایسے میں بائیس سالہ بانو اپنے خالہ زاد کے پیچھے آنکھوں میں سجانے لگی' بہانے بہانے سے اس کے آگے پیچھے پھرنے لگی' اُس کی اودیتی ہوئی سیاہ آنکھیں حیدر کو پریشان کردیتی' وہ جیسا بھی تھا مگر اُس نے آج تک کسی لڑکی کے بارے میں غلط انداز میں نہ سوچا تھا حالانکہ اُس کے دوست لڑکیوں کے قصے مزے لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ وہ تو لڑکیوں کو دیکھ کر نظریں جھکانے والا تھا مگر ایک رات اُس سے وہ کچھ ہوگیا جو اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اُس رات وہ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کر کے خاصی دیر سے گھر لوٹا تھا' خالہ سو چکی تھیں اس نے سمجھا کہ بانو بھی سوگئی ہوگی وہ نہایت خاموشی سے آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا' ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا کہ کون ہے؟ بانو دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔

''تم اِس وقت؟ سب خیریت تو ہے؟'' وہ پریشان ہوگیا تھا جواب میں بانو نے ہچکیوں لے کر رونا شروع کردیا تھا' وہ گڑبڑا کر اٹھ کے پاس آن کھڑا ہوا۔

''بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟'' بانو نے ہچکیوں پر قابو پایا اور حیدر سے مخاطب ہوئی۔

''حیدر پتہ نہیں تم میرے بارے میں کیا سوچو اور کیا نہیں' مگر یہ حقیقت ہے کہ میں تمہیں بے پناہ پیار کرنے لگی ہوں تمہارے علاوہ کسی اور کی ہونا میرے لیے سوہانِ روح ہے۔ میں کب تمہاری محبت میں گرفتار ہوئی مجھے خود خبر نہیں' لیکن میں اتنا جانتی ہوں حیدر میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

بانو کے کھلے اقرار پر وہ حق دق سا رہ گیا تھا۔ ابھی وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہ ہوا تھا کہ بانو نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اپنی کلائی پر رکھ لیا۔

''حیدر اگر تم نے مجھے اور میری محبت کو ٹھکرایا تو میں اپنی جان لے لوں گی۔'' حیدر نے بوکھلا کر چاقو اُس سے پکڑنا چاہا وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔

''نہیں حیدر ایسے نہیں' پہلے یہ بتاؤ تم مجھ سے پیار کرتے ہو کہ نہیں؟'' چاقو بدستور بانو کی کلائی پر تھا۔

حیدر بری طرح پھنس چکا تھا' اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''ہاں کرتا ہوں۔''

بانو کا چہرہ کھل اٹھا تھا وہ دوڑ کر حیدر کے سینے سے لگ گئی۔ حیدر کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ بانو کا نازک بدن اُس کے جسم کو بیکار بنا رہا تھا۔ وہ حیدر کے اندر کمٹی جارہی تھی۔ حیدر نے اُس کے گرد بانہوں کا حلقہ کس لیا اور اسے بستر پر لے آیا' بانو

خود سپردگی کے عالم میں اُس کے ساتھ کھنچی چلی آئی۔

دونوں جوان تھے تنہائی تھی' ایک ریلہ آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔ باقی رہ جانے والے کچھ اقرار تھے اور ہمیشہ کے لیے ایک دوجے کا بن کے رہنے کا قول.....

تقریباً ایک ماہ کے بعد بانو نے شادی پر زور دیا تو حیدر نے خالہ سے بات کرنے کا کہہ دیا اور اُس رات کا کھانا کھانے کے بعد حیدر نے خالہ کے سامنے یہ مدعا رکھ بھی دیا۔

خالہ خوشی سے جھوم اٹھیں انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ یوں بانو اور حیدر جھٹ پٹ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے تھے۔

☆.....☆.....☆

بانو بے حد محنت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی حیدر بھی جیسے اُس پر جان ہی دیتا تھا مگر پھر ہوا یوں کہ ایک رات اچانک خالہ کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ اس دنیا سے رخصت بھی ہوگئیں اور اُن کے جاتے ہی گھر کے حالات یکا یک بگڑنے لگے۔ حیدر جو ہر دم بانو کی محبت کے گن گاتا تھا بدلنے لگا' اُس کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرنے لگا۔ بانو سے لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ روز کا معمول بن گیا آہستہ آہستہ بات مار پیٹ تک آ پہنچی۔ مار پیٹ کے دوران دو دفعہ حمل ضائع ہوا' بانو کی صحت خراب رہنے لگی وہ چڑچڑی اور بدمزاج ہوگئی تھی۔

اور پھر یہ بھی ہوا کہ حیدر کو نشے کی لت لگ گئی۔ اب وہ ہر وقت نشے میں دھت پڑا رہتا اور نشہ پورا کرنے کے لیے گھر کا ساز و سامان تک بیچ آتا۔ بانو اُسے کبھی روکتی یا کچھ کہتی تو اُسے روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیتا تھا۔ ایک روز حیدر کو کوکو کی پرانا شرابی' کبابی عیاش دوست مل گیا اور اُسے عیاشی کی ایک نئی راہ سوجھائی۔

''کیوں نشے میں خود کو ضائع کررہے ہو' چار دن زندگی ہے عیش کرو عیش۔''

''کہاں سے عیش کروں کچھ پلے نہیں۔'' حیدر نے بیزاری سے کہا تو اُس کا دوست ہنس پڑا پھر جو کچھ اُس نے حیدر کے کان میں کہا اُسے سن کر حیدر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اُس روز حیدر گھر لوٹا تو بانو کو اُس میں خاصی تبدیلی محسوس ہوئی حیدر پہلے کی طرح ہوگیا تھا۔ نشہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

حیدر نے اس پر اپنی محبت کا ایسا جال پھینکا کہ وہ اُس سے نکل نہ سکی جو کچھ کہتا آنکھیں بند کر کے اعتبار کر بیٹھتی۔ وہ ایک بار پھر سے امید سے ہوگئی۔

بیٹی کی پیدائش پر حیدر نے خود کو بہت خوش ظاہر کیا تھا اُس کے لیے ڈھیروں شاپنگ کی۔ بانو کے لیے بھی بہت سی چیزیں خرید کر لایا تھا۔

☆.....☆.....☆

بیٹی پیدا ہونے کے ٹھیک ایک سال بعد حیدر بانو کے دونوں ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ اب بانو خاصی کمزور ہوگئی تھی۔ اُس کے سر میں سفید بال بھی آ چکے تھے وہ بوڑھی دکھنے لگی تھی' لیکن بوڑھی نہیں ہوئی تھی پچیس سالہ حیدر کی محبت کی جوت جو ہر دم اُس کی آنکھوں میں جلتی بھی جبکہ حیدر کی نظریں تو صرف اُس رقم پر تھی جو بانو کے اکاؤنٹ میں تھی۔

''بانو میں کاروبار کرنا چاہتا ہوں مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے مجھے ایک دوست نے اپنے بزنس میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے۔ ففٹی ففٹی شیئرز' یار میرے پاس تو اتنی رقم نہیں ہے' لیکن اگر تم چاہو تو میں بزنس کی دنیا میں اپنا نام چمکا سکتا ہوں' امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے' فائدہ ہی فائدہ..... سوچو بانو' ہماری بڑی سی کوٹھی ہوگی' کار..... نوکر چاکر۔ ہماری بیٹی مہنگے سے مہنگے اسکولوں میں پڑھے گی۔''

وہ بانو کو سبز باغ دکھانے لگا۔

بانو نے حیدر پر بھروسہ کیا، اور بینک سے اپنی جمع پونجی میں سے دو لاکھ کی صورت میں اُس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ جب تک رقم چلی حیدر نے خوب عیاشی کی بانو کو دکھانے کے لیے گھر سے غائب رہتا کہ وہ بزنس میں مصروف ہے، جب رقم ختم ہوئی تو ایک بار پھر روتا ہوا بانو کے سامنے آن کھڑا ہوا، بزنس میں گھاٹے کا رونا رویا، تو اُس بار بانو اسے رقم دیتے ہچکچائی کیونکہ بس ایک لاکھ رقم تھی جو اُس کے پاس رہ گئی تھی، حیدر بھی چالاک تھا، کسی نہ کسی صورت بانو سے یہ رقم نکلوا ہی لی تھی، اور خوب سوچ سمجھ کر اِس لاکھ کے ساتھ مزید اپنے دوست سے اُدھار لے کر ایک جنرل اسٹور کھول لیا۔ مگر جلد ہی اُس کی آمدنی والی رقم بھی عیاشی میں اڑا دی۔ سپر اسٹور میں مال ڈالنا تھا، مگر دوستوں نے ادھار دینے سے انکار کر دیا بلکہ پہلے سے دیے گئے ادھار کا مطالبہ بھی شروع کر دیا۔ حیدر کی پریشانی بڑھتی گئی اسٹور کو تالا لگ گیا۔ گھر میں دو وقت کی روٹی مشکل ہو گئی اسی دوران میں بچی بیمار ہو گئی دوائی تک کے پیسے نہ تھے بانو نے کپڑے سی کر گھر کی دال ہانڈی چلا رکھی تھی۔ اس صابر عورت کی زبان سے کبھی کوئی شکوہ یا شکایت نہ نکلی تھی۔ وہ واقعتاً حیدر سے محبت کرتی تھی، حیدر کی حالت بہت بری تھی، تبھی حیدر کے شیطانی دماغ میں کوندا سا لپکا تھا۔

اُس نے بانو سے کہا۔

"ہم یہ گھر بیچ دیتے ہیں قرضہ اتار کر باقی جو رقم بچے گی اُس سے چھوٹا موٹا گھر خرید لیں گے، یا پھر کرایہ پر کوئی فلیٹ لے لیں گے۔" بانو نے جب یہ بات سنی تو تڑپ اٹھی اُس سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ اس کے ماں باپ کی خون پسینے کی کمائی سے بنا تھا۔ بانو جان گئی تھی کہ

آئینہ نہیں ہوں میں

میرے جسم پر ہر جا تہمتوں کے نشتر سے
حاشیہ بناؤ گے......!
جی میں جب بھی آئے گا
اپنے گھر کے کمروں میں جا بہ جا سجاؤ گے
روشنی اُگاؤ گے... !
کرچیوں میں بانٹو گے تم وجود کو میرے
تلخیوں کے پتھر سے صد ہزار حصوں میں رکھ کے
اپنے قدموں میں
یوں ہی جیت جاؤ گے... !
میل اپنے ہاتھوں کا تن پر میرے رکھ دو گے
اور دماغ کے سارے مکر اور فریبی گر مجھ پہ مثل کیچڑ کے
رکھ کے پھر یہ چاہو گے .. !
جب بھی مجھ میں دیکھو تو میں تمہیں دکھاؤں گی عکس
پارسائی کا
ایسا ہو نہیں سکتا......!
میں بھی سانس لیتی ہوں، اک وجود رکھتی ہوں
کیسے طنز و طعنہ کے بے لگام پتھر سے مجھ کو توڑ پاؤ گے
ہاں میں بنتِ آدم ہوں......!
آئینہ نہیں ہوں میں، آئینہ نہیں ہوں میں

حجاب فاطمہ حجاب

حیدر ایک خود غرض، لالچی اور احسان فراموش انسان ہے۔

اُس نے آج تک بانو کو کوئی سکھ نہ دیا تھا۔ اُس کی بیٹی نور دو سال کی ہونے والی تھی۔ بانو سمجھ چکی تھی یہ شخص کبھی بھی اُن کے حقوق پورے نہیں کر سکتا نہ ہی اس کو احساسِ ذمہ داری ہے۔ اگر اس نے گھر بیچ دیا تو ہم تو فٹ پاتھ پر آ جائیں گے۔

بانو نے زندگی میں پہلی دفعہ حیدر کو انکار کر دیا نہ صرف انکار کیا بلکہ اسے کھری کھری سنا کر گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا۔

حیدر حیرت سے بانو کو دیکھتا رہا، پھر غصے سے اس گھر سے نکل گیا۔ بانو اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر بہت روئی تھی، اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے آئندہ زندگی کس طرح گزارنی ہے اور اپنی بیٹی کی زندگی کو کس طرح بہتر بنانا ہے اُسے آئندہ آنے والی صبح کا انتظار تھا، لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ رات اُس کی زندگی میں صبح کا اجالا نہیں بکھیرنے دے گی۔

حیدر گھر سے نکل کر ایک دوست کی طرف آ گیا۔ وہ شعلوں پر لوٹ رہا تھا۔ اِس عورت کی یہ مجال کہ وہ مجھے 'حیدر خان' کو انکار کرے، وہ غصے سے کھول رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ وہ بستر پر پڑا کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ آخرکار وہ اٹھا اس کا دماغ بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ وہ دوست کے گھر سے چپکے سے نکلا اور بانو کے گھر آ گیا۔ اُس کے ساتھ پیٹرول کین تھا۔ یہ سردیوں کی رات تھی سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے پڑے تھے۔ حیدر بانو کے گھر کے سامنے کھڑا تھا اس نے دروازہ بجایا، بانو نے دروازہ کھولا تو وہ اس کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا ذرا دیر میں بانو کو چارپائی کے ساتھ باندھ دیا۔ اُس کی معصوم بچی نور بانو کے پہلو میں سو رہی تھی۔ بانو نے حیدر کو بہت واسطے دیے اپنا اور اس کا رشتہ یاد دلایا، اپنے ماں کے احسانات یاد دلائے، مگر حیدر کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی اور سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔ اُس نے چارپائی کے طرف پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ بانو بے حس و حرکت پھٹی پھٹی آنکھوں سے حیدر کو باہر سے دروازہ بند کر کے جاتے ہوئے محسوس کرتی رہی، تبھی وہ چیخی تھی۔ حیدر کے کانوں میں اُس کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔

"یاد رکھنا حیدر میں تمہیں کبھی چین نہیں لینے دوں گی، میں آؤں گی تم سے انتقام لینے...... جلا دوں گی تمہیں جلا دوں گی۔"

بانو کی یہ باتیں سن کر حیدر ہنس پڑا تھا۔

"مرنے کے بعد کون واپس آیا ہے؟" کہتا ہوا وہ واپس اپنے دوست کے گھر پہنچ گیا تھا وہ جس خاموشی سے گیا تھا اسی خاموشی سے واپس آ گیا تھا اور پھر اگلے روز اُن کی جلی ہوئی لاشوں پر بیٹھا وہ ماتم کر رہا تھا، محلے اور آس پاس کے افراد خاموش اور افسردہ کھڑے تھے، ہر کوئی اس کو پرسہ دے رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں خود کو مبارکباد دے رہا تھا۔ اُس ناپسندیدہ وجود سے چھٹکارا ملنے پر جو زبردستی اُس پر مسلط ہو گئی تھی۔

چالیس روز کے بعد حیدر خان نے وہ مکان بیچ دیا تھا۔ قرض اُتار کر اس نے باقی رقم سے چھوٹا سا مکان لے لیا تھا اور سپر اسٹور میں مال ڈال لیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے ترقی کی اور چھوٹی سی سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی، پھر اس کے ایک دوست نے شادی کا مشورہ دیا تو اس نے نگینہ سے شادی کر لی، جس سے اس کے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے، جن کی عمر اس وقت چار سال تھی۔ بانو اور اس کی بچی کے قتل کے بعد اس کی زندگی میں کافی ہلچل رہی، لیکن چار سال بعد وہ پُرسکون ہو گیا لیکن اب ان واقعات نے

اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اُس کی راتوں کی نیند اور بھوک اڑ چکی تھی۔

☆......☆......☆

اچانک بالکل اچانک حیدر کا کاروبار دن بدن گھاٹے میں جانے لگا یہاں تک کہ اس کے جنرل اسٹور پر تالا لگنے کی نوبت آ گئی تو اس نے کار بیچ ڈالی۔ لیکن پھر وہی حالات ہو گئے تھے بیوی تنگی کا رونا روتی تو بچوں کے تعلیمی اخراجات پہاڑ جیسے دکھتے۔ بیوی کا زیور تک بیچ دیا مگر پھر بھی وجہ سمجھ نہ آتی پیسہ کہاں گیا یہاں تک کہ گھر کی قیمتی چیزیں بھی ایک ایک کر کے بک گئیں اب جو حیدر خان زندگی کا حساب لگانے بیٹھا تو سوائے خسارے کے کچھ نہ تھا۔ ماضی شدت سے یاد آتا تو راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتا......

اب تو کچھ دنوں سے حیدر خان کو اپنے گھر میں بانو اور نور چلتے پھرتے نظر آتے۔ اُس کو اپنے لیے اُن کی آنکھوں میں نفرت اور انتقام کے شعلے لپکتے نظر آتے۔ گھر کے کھڑکیاں' دروازے خود بخود بجنے لگتے' برتن گر کر ٹوٹتے تو کبھی کہیں خود بخود آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

اُس روز بھی حیدر کو خواب میں بانو دھمکی دیتی ہوئی نظر آئی تھی۔ کب تک بچو گے حیدر' آگ لگے گی آگ......! وہ اونچے قہقہے لگاتی اپنی بچی کو چھاتی سے لگائے آگ آگ پکار رہی تھی۔ حیدر خان نے بچی کو دیکھا تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔ اُس کا جھلسا ہوا وجود باہر کو نکلے ڈیلے' اُس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اُس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے رضائی ہٹائی اور بیوی کو آواز دی۔

''نگینہ...... نگین... نگینہ؟'' آدھی رات کے گھپ اندھیرے کمرے میں حیدر کا خوف مزید بڑھ گیا تھا۔ نگینہ کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر وہ ہمت کر کے اٹھا اور کمرے کی لائٹ آن کی بتی کے جلتے ہی نظر آنے والے منظر نے اُس کے بدن سے خون نچوڑ لیا تھا' سامنے بانو اپنی بچی کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ حیدر کے بیوی بچے بے حس و حرکت رسی سے بندھے ہوئے تھے۔

'' بب...... با...... بانو خدا کے لیے...... میرے بیوی بچوں کو چھوڑ دو۔'' وہ گڑگڑا رہا تھا' رو رہا تھا۔

'' مجھے مار دو' لیکن انہیں چھوڑ دو یہ بے قصور ہیں۔''

وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا' اُس کی بات سن کر بانو نے وحشت انگیز قہقہے بلند کیے تھے۔

'' چھوڑ دوں اِن کو' بے قصور ہیں' واہ حیدر واہ...... پہلے یہ بتاؤ میرا اور میری معصوم بچی کا کیا قصور تھا؟ کیا بگاڑا تھا تمہارا؟'' وہ غصے سے پھنکاری تھی۔

'' آج تمہیں کوئی معافی نہیں ملے گی۔''

حیدر کے دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ حیدر نے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا تھا مگر وہ باہر سے بند ہو چکا تھا۔ جوں جوں آگ بلند ہو رہی تھی بانو کے وحشت انگیز قہقہوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا جبکہ حیدر اور اُس کے بیوی بچوں پر جیسے سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے روز ایک پرائیویٹ ٹی وی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی ایک گھر میں اچانک آگ بھڑک اٹھی اور سب کچھ جل کر خاک ہو گیا۔ جلنے والوں میں ایک مرد عورت اور دو بچے شامل تھے۔

'' ہر کوئی اِس خبر پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔''

☆☆......☆☆

دوسری دنیا

خود بھی روتے ہو' رُلاتے ہو' غضب کرتے ہو
داستاں غم کی سناتے ہو' غضب کرتے ہو

لاڈلی نے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی اگر وہ نہ مرتی تو کلیم ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتا......مافوق الفطرت واقعات جو آج بھی رونما ہوتے ہیں......

عبدالغفار عابد

میری شادی تئیس اکتوبر دو ہزار سولہ کو ہوئی' شادی میں میرے چند ادبی دوست بھی شریک ہوئے ان دوستوں میں عبدالقدوس سی بھی شامل تھے جو اپنی فیملی کے ساتھ چکوال سے آئے تھے۔

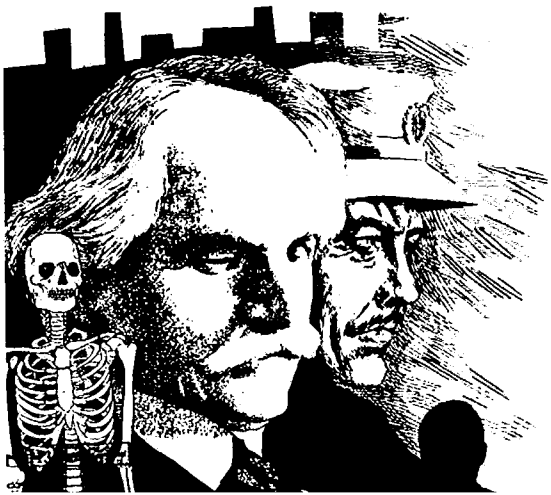

شادی کی تقریب کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو ہماری دعوت کا کہہ گئے' اور پھر ٹھیک دس دن بعد سنی کا فون آ گیا۔

''عابد بھائی' آج جمعرات ہے' آپ ہفتے کی شام کو ہمارے ہاں پہنچ جائیں آپ کی شادی کا صدقہ دینا ہے' میں نے بکرا خرید لیا ہے' ہم فیملی کے ہمراہ اتوار کو چہل ابدال جا کر بکرا ذبح کریں گے۔ دوپہر کا کھانا وہاں ہی کھائیں گے۔''

ہم دونوں میاں بیوی ہفتے کی شام اپنے دوست کے گھر چکوال پہنچ گئے۔ سنی چکوال کی تحصیل چوسیدن شاہ سے تیرا کلومیٹر دور گاؤں بھگوال بالا میں رہتے ہیں' بھگوال بالا سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر بشارت چھوٹا سا شہر ہے یہاں اس کی چکن شاپ ہے' یہ بہت خوبصورت پہاڑی علاقہ ہے' قدرتی آبشاروں اور چشموں سے بھرپور یہ علاقہ پانی کی شدید قلت کا شکار ہے بارشوں کی کمی کے باعث گندم کی فصل بہت متاثر ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ بھی خوبصورت اور محبت کرنے والے ہیں جو کہنے کو تو دیہاتوں میں آباد ہیں لیکن ان میں دیہاتی پن نام کی کوئی چیز نہیں وہ ہر طرح کے شہری ادب' آداب اور تہذیب و تمدن سے مالا مال ہیں' یہ دوسروں کی طرف مائل ہونا پسند نہیں کرتے البتہ دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنا پسند کرتے ہیں۔ جفاکش' دھن کے پکے اور مضبوط کردار کے مالک ہوتے ہیں یہ لوگ' مصائب سے نہیں گھبراتے حالات کا مقابلہ حقیقت پسندی سے کرتے ہیں۔ عورتیں نہایت مہذب' شائستہ اور امن پسند ہوتی ہیں' ان کی آنکھیں پُرسکون اور نرم دکھائی دیتی ہیں' لیکن عزم اور حوصلے سے بھرپور ہوتی ہیں' اُن کی چال سے وقار چھلکتا ہے' عورتیں صبح شام اپنے مقررہ وقت پر کنوؤں سے پانی بھر کر لاتی ہیں' یہاں کے لوگ مہمان نوازی میں بہت مشہور ہیں یہی وجہ ہے اس علاقے کو محبتوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔

چکوال آثار قدیمہ کی جنت ہے' تحقیق کرنے کے بعد ساٹھ سے زائد ایسے مقامات دریافت کیے گئے جو ایک ہزار سال سے لے کر ایک کروڑ بیس لاکھ سال پرانے ہیں' چکوال سے اٹھارہ کلومیٹر دور بن امیر خاتون ایک چھوٹا سا گاؤں ہے' اس کے اردگرد سالٹ رینج کی خوبصورت سنہری چٹانوں اور پہاڑوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کو بہت سحر انگیز بنا دیا ہے۔ چار سال پہلے اس گاؤں کے بارے میں ضلع کے لوگ بھی بے خبر تھے مگر اب یہ گاؤں پوری دنیا میں مشہور ہو چکا ہے' یہاں سے دریافت ہونے والے فاسلز دو کروڑ بیس لاکھ سال پرانے ہونے کی تصدیق ہوئی ہے۔ مزید تحقیق سے یہاں پرانی تہذیب کے ایسے آثار سامنے آئیں گے جواب تک پوری دنیا میں نہیں ہیں۔ چکوال کی سرزمین کو روحانی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے' کلر کہار کی خوبصورت وادی میں سخی باہو کا مزار ہے۔ روایت ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکر جنگلوں میں عبادت کرنے اور دربار سخی باہو پر حاضری دینے کے بعد واپس جانے لگے تو کنویں سے کچھ لڑکیاں پانی بھر کر آ رہی تھیں۔

بابا نے اُن لڑکیوں سے پانی مانگا تو لڑکیوں نے مذاق میں کہا۔

''بابا پانی کڑوا ہے۔'' بابا نے دوبارہ پانی مانگا تو لڑکیوں نے پھر وہی جواب دیا۔ بابا نے کہا۔

''اچھا کڑوا ہے تو کڑوا ہی سہی۔''

جب لڑکیوں نے گھر آ کر پانی پیا تو پانی واقعی کڑوا ہو چکا تھا' گاؤں میں شور مچ گیا لوگ بابا کو ڈھونڈنے نکل پڑے' جس پر بابا فرید نے اپنا عصا زمین پر مارا تو پانی کا میٹھا چشمہ وہاں سے شروع ہو گیا۔ اس وقت بھی کلر کہار میں اس چشمے کے علاوہ سارا پانی کڑوا ہے۔

اتوار کو ہم چہل ابدال پہنچ گئے' یہاں اور بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ چہل ابدال سطح سمندر سے تقریباً سینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

پہلے یہاں آنے جانے کا کوئی مستقل راستہ نہیں تھا۔ جنگل میں ہر طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں ہیں' جنگل کا یہ پہاڑی سفر پیدل طے کرنے میں بھی گھنٹوں لگ جاتے تھے' اب یہاں کے مقامی لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت گاڑیوں کے آنے جانے کا راستہ بنالیا ہے' یہاں پرانے زمانے کی ایک خوبصورت مسجد ہے' اس کے ساتھ ہی حجرہ بنا ہوا ہے۔ چہل ابدال کسی دربار کا نام نہیں اور نہ ہی یہاں کسی بزرگ کی قبر ہے' البتہ راستے میں گنج علی شاہ کا در آتا ہے۔ یہاں چالیس بزرگ بھائی عبادت کرتے تھے' اس لیے جگہ کا نام چہل ابدال رکھ دیا گیا ہے' لوگ یہاں آ کر صدقہ خیرات کرتے ہیں' اتوار کو یہاں کافی رش ہوتا ہے۔

عبدالقدوس سنی اور اس کے کزن عاطف نے بکرا ذبح کر کے گوشت بنایا اپنی ضرورت کے لیے رکھ کر باقی گوشت یہاں آئے ہوئے لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا' سنی کی بیوی ثوبیہ اور میری وائف فہیم نے مل کر کھانا تیار کیا' کھانا کھا کر ہم واپسی کے لیے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے کہ باتوں باتوں میں سنی نے ایک واقعہ بیان کیا۔

جس کو قلم بند کرنے سے خود کو نہیں روک سکا۔ یہ واقعہ انہی کی زبانی سنیے۔

☆......☆......☆

میرے دادا شوکت شاہ کی یہاں کافی زمین تھی' ہم اپنا علاقہ چھوڑ کر کہیں نہیں گئے۔ دادا جان کی عزت اور اثر و رسوخ اپنے علاقے اور زمین سے تھا' لہٰذا ہمارا خاندان اور آباؤ اجداد عرصہ دراز سے اس چھوٹے سے گاؤں بھگوال بالا میں آباد ہیں' دادا جان کو لوگ اپنا پیر سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے' اپنی ذات پر خرچ کرنا پسند نہیں کرتے تھے البتہ غریبوں اور ضرورت مند مریدوں کی ضرور مدد کرتے۔ ستر سال کی عمر میں بھی اُن کے چہرے پر سرخی اور تازگی نوجوانوں جیسی تھی' بارعب شخصیت اور عقاب جیسی آنکھیں تھیں کسی کو اُن کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

شاہ صاحب بہت کم غذا پر اکتفا کرتے' رات کو ایک گلاس دودھ کے ساتھ روٹی کھا لیتے' ناشتہ لسی یا دہی کے ساتھ کرتے' باجرے کی روٹی شوق سے کھاتے' ہمیشہ باوضو رہتے اور زبان سے کلمہ شریف کا ورد جاری رہتا' پانچ وقت کی نماز کے علاوہ رات بھر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

ہمارا گھر پہاڑ کی طرف سب سے اوپر ہے' گھر کی بیک سائیڈ پر بوہڑ اور پیپل کے درخت تھے اور ان درختوں پر جنات کا بسیرا تھا' یہ جن شاہ صاحب کے مرید تھے اور ان کا ہر حکم مانتے اکثر لوگوں نے ان درختوں پر رات کو دیے جلتے بھی دیکھے تھے' جنوں نے کبھی علاقہ مکینوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا' کیونکہ وہ شاہ صاحب سے ڈرتے تھے۔ شاہ صاحب (دادا جان) ہر

جمعرات کی رات پیدل چل ادال جاتے' ساری رات وہاں عبادت کرتے صبح فجر کے وقت واپس گھر آتے' شروع شروع میں گھر والوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی حیران تھے کہ وہ اتنا خطرناک پہاڑی سفر رات کو کیسے کرتے ہیں' پھر آہستہ آہستہ سب اصل حقیقت جان گئے کہ اُن کے مرید جن رات کے اِس سفر میں اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔

☆.....☆.....☆

وقت کو گزرنا ہوتا ہے' وہ گزر رہا تھا۔ ایک دن دادا جان ہمیں چھوڑ کر ملکِ عدم چلے گئے جہاں سے اُن کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ دادا جان کی وفات کے بعد پھر کبھی کسی نے ناصرف ان درختوں پر دیے جلتے نہیں دیکھے' کچھ عرصے بعد یہ درخت سوکھ بھی گئے تھے۔ اور پھر ہوا یہ کہ جب سردیاں عروج پر تھیں' تو ایک شام چچا حمید آگ جلانے کے لیے ان سوکھے درختوں سے لکڑیاں کاٹ کے لے آئے حالانکہ دادا جان نے ان درختوں کو کاٹنے سے منع کیا تھا۔

ہم نے گائیں پال رکھی تھیں' والد صاحب فوج میں تھے لہٰذا اُن کی دیکھ بھال چچا حمید کے ذمے تھی' وہ صبح دودھ نکالنے کے بعد اُن کو چھوڑ دیتے اور وہ نزدیکی جنگل میں چرنے چلی جاتیں' سارا سارا دن جنگل میں چرتیں' شام کو واپس آجاتیں' اُن میں ایک سفید رنگ کی گائے تھی جو چچا جان کو بہت پیاری تھی انہوں نے اُس کا نام لاڈلی رکھا ہوا تھا اور لاڈلی کے گلے میں گھنگھرو بھی ڈال رکھے تھے' جب بھی شام کو وہ گائیں مقررہ وقت پر واپس نہ آتیں' تو چچا جان اُن کا پیچھا کرتے اور لاڈلی کے گھنگھروؤں کی آواز سے وہ اُن کو جلد ڈھونڈ لیتے تھے۔

چچا حمید کی شادی شری پٹھان گاؤں میں ہوئی تھی جو بھگوال بالا سے دو تین میل کے فاصلے پر ہوگا۔ راستے میں ہمارے گاؤں کا قبرستان آتا ہے چچا اکثر رات کو شری پٹھان جاتے تھے گرمیوں کے دنوں میں یہاں شدت کی گرمی پڑتی ہے لوگ دن کی بجائے رات کو سفر کرنا پسند کرتے ایک رات چچا شری پٹھان جانے کے لیے گھر سے نکلے اور تھوڑی دیر بعد ہی واپس آگئے آئے تو اُن کا برا حال تھا۔

انہیں ٹھنڈے پسینے آرہے تھے' رنگ پیلا پڑ گیا تھا' جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ کیوں اتنی جلدی واپس آگئے ہیں' ہم تو یہ سمجھے کہ شاید اُن کی طبیعت خراب ہوگئی ہے' کیونکہ اُن کی ظاہری حالت ایسی ہی نظر آرہی تھی۔ چچا جان کی گود میں اُن کا پانچ سال کا بیٹا کلیم بھی تھا' جب وہ گھر سے نکلے تھے تو کلیم بھی اُن کے پیچھے بھاگا تھا گاؤں کے ایک آدمی شکور نے کلیم کو باپ کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر کہا تھا۔

''بیٹا واپس گھر جاؤ۔'' لیکن کلیم نہ مانا تھا جب ہم نے کلیم کو گھر میں نہ پایا تو پریشان ہوگئے اور اس نے تلاش کرنے گھر سے نکلے تو شکور نے بتایا کہ آپ گھبراؤ نہیں' کلیم اپنے والد کے پیچھے جارہا تھا' وہ اُن کے ساتھ ہی چلا گیا ہوگا۔ چچا جان اکثر اپنے بیٹے کو شری پٹھان نالی سے ملانے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ شکور کی بات سن کر ہم مطمئن ہوگئے تھے' جب چچا گھر واپس آئے تو کلیم ان کے ساتھ تھا۔

اپنے بیٹے کو دیکھو۔'' چچی بولیں۔

''آپ نے اسے ساتھ لے کر جانا تھا تو ہمیں بتا کر جاتے' ہم لوگ خواہ مخواہ پریشان ہوگئے۔'' چچا کو جواباً گہری خاموشی میں دیکھ کر چچی نے پوچھا۔

''خیریت تو ہے آپ کیوں اس قدر چپ ہیں؟ اتنی جلدی واپس لوٹ آئے کیا آپ شری پٹھان نہیں گئے؟''

''ہاں میں وہاں نہیں گیا رستے سے واپس آ گیا ہوں۔'' یہ جواب دے کر چچا نڈھال ہو کر چارپائی پر یوں گر پڑے جیسے کسی بدن سے اُن کی جان کشید کر لی ہو۔ وہ بولنا چاہتے تھے مگر زبان ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ بمشکل چچا کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے۔

''میں کلیم کو ساتھ نہیں لے کر گیا تھا' یہ تو مجھے قبرستان کے اِس پار جاتا ہوا راستے میں ملا تھا میں خود حیران ہوں کہ یہ وہاں کیسے پہنچا یہ میرے پیچھے بھاگا ضرور تھا پر میں اسے واپس اپنے دروازے کے سامنے چھوڑ کر گیا تھا۔''

چچی کو اُن کی یہ وضاحت سمجھ نہیں آئی بولیں۔

''لگتا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ آرام کریں' صبح باتیں کریں گے ہاں میں ایک بات بتانا بھول گئی آپ کی لاڈلی بیمار ہے' آپ کے جانے کے بعد اچانک ڈکرانے لگی پھر زمین پر لیٹ گئی اور اب تک لوٹ پوٹ ہو رہی ہے' بہت تکلیف میں ہے جیسے کوئی اُس کے پیٹ میں چھریاں مار رہا ہے۔''

چچی کا اتنا کہنا تھا کہ چچا چھلانگ مار کر چارپائی سے اٹھے جیسے انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو۔

ایک ٹھنڈی آہ اُن کے منہ سے نکلی اور بولے۔

''آج خیر نہیں لگتا ہے میں کوئی غلطی کر بیٹھا ہوں۔''

ہم سمجھ گئے کوئی غیر معمولی واقعہ ہوگیا ہے سب خاموش تھے۔ چچا حمید پتھر کا بت بنے بیٹھے تھے' بھی چچی نے اُن کو شانے سے پکڑ کر ہلایا اور پوچھا۔

''ہوا کیا ہے آپ کو؟ ہمیں بھی کچھ بتاؤ۔''

چچی کے بار بار پوچھنے پر چچا نے کہا۔

''کچھ نہیں ہوا..... پلیز آپ لوگ سو جائیں مجھے تنہا چھوڑ دیں۔''

''اپنی لاڈلی کی خبر نہیں لو گے وہ بہت تکلیف میں ہے' سن نہیں رہے آپ' آپ تو اس پر جان دیتے ہیں آج وہ درد سے مر رہی ہے آپ کو ذرا پرواہ نہیں۔''

''جانے دو اب وہ ٹھیک نہیں ہوگی' بے شک مجھے لاڈلی اولاد کی طرح پیاری ہے مگر اولاد سے زیادہ نہیں ہو سکتی' کلیم کی آئی اس نے اپنے سر لے لی ہے' اس کا مر جانا ہی ٹھیک ہے۔ لاڈلی کی وجہ سے جو میرے دل پر گزر رہی ہے وہ میں جانتا ہوں لیکن اُس کے قریب نہیں جا سکتا شاہ صاحب زندہ ہوتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔'' امی نے کہا۔

''اچھا اگر ہمارے نصیب میں لاڈلی کی کو بچانا نہیں ہے تو اس کو ذبح کرا دو' حلال مال ہے حرام موت تو نہ مرے۔''

عجیب وسوسوں بھری رات تھی کہ اُس رات کسی کو بھی نیند نہیں آئی۔

ساری رات لاڈلی تکلیف سے تڑپتی رہی صبح اُس کا سانس اُکھڑنے لگا تب چچا نے مولوی کو بلایا اُس نے تکبیر پڑھ کر لاڈلی کی گردن پر چھری پھیر دی لاڈلی کا بچہ گردن اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہا تھا' آج وہ ماں کے ساتھ ساتھ اُس کے دودھ سے محروم ہوگیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بہت دنوں بعد بچانے ہمیں اصل واقعہ بتایا کہ جونہی میں اُس رات گھر سے نکلا اور کچھ دور پہنچا تو کلیم بھاگتا ہوا میرے پیچھے آیا اُس نے ساتھ جانے کی ضد کی مجھے پیدل سفر کرنا تھا لہٰذا میں اُسے ڈانٹ کر واپس گھر کے سامنے چھوڑ گیا' اور پھر جب میں قبرستان کے درمیان پہنچا تو میرے پاؤں بھاری ہونے لگے چلنا مشکل ہو رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں گھنگھروؤں کی آواز آئی میں سمجھا کوئی جانور ہوگا جس کے گلے میں گھنگھرو بندھے ہوں گے لاڈلی کا بھی خیال آیا کہ کہیں وہ میرے پیچھے تو نہیں آئی خیر میں نے دل کڑا رکھا اور قبرستان پار کرلیا اب یہ گھنگھروؤں کی آواز بالکل قریب آگئی تھی تبھی میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو سامنے بلند قامت لوگ کھڑے تھے ایک چھوٹا بھینس کا بچہ اُس کے پاس تھا۔

جس کے گلے میں زنجیر پڑی ہوئی تھی اور پیروں میں گھنگھرو بندھے تھے جن سے یہ آواز آرہی تھی۔ ان لوگوں میں سے ایک نے مخاطب ہوکر کہا۔

''اگر آپ شاہ صاحب کے رشتے دار نہ ہوتے تو آج آپ کی خیر نہیں تھی آپ نے ہمارے درخت کاٹے حالانکہ شاہ صاحب نے آپ کو منع کیا تھا دوسرا آپ اپنے بچے کے معاملے میں بہت لاپرواہ ہیں یہ آپ کے پیچھے قبرستان آگیا جانتے نہیں یہ قبرستان سخت ہے اور پھر یہ رات کا وقت ہے۔''

میں نے جی کڑا کر کے سوال کیا۔

''آپ لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''ہم جو بھی ہیں آپ کی خیر چاہتے ہیں آئندہ کبھی ہمارے وہ درخت نہ کاٹنا اپنا بچہ سنبھال لو اور پھر کبھی اسے رات کے وقت قبرستان نہ آنے دینا اس کے بدلے اب ہم آپ کی لاڈلی لے جائیں گے۔''

جونہی انہوں نے لاڈلی کا نام لیا تو میں خوف سے کانپ گیا۔

''لو اسے سنبھالو۔'' وہ بھینس کے بچے کی زنجیر میرے ہاتھ میں دے کر غائب ہوگئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ جنات ہیں' میں نے بھینس کے بچے کی زنجیر تھام لی اور اسے کھینچتا آگے چلا مگر وہ پیچھے کی جانب کھنچنے لگا' مڑ کر دیکھا تو وہاں بھینس کا بچہ غائب تھا اُس کی جگہ کلیم کھڑا تھا میں نے لپک کر اُسے اٹھالیا زنجیر کھولی وہ رونے لگا میں کلیم کو کندھے پر ڈال کر گھر لے آیا اور یہاں آتے ہی خبر لی کہ لاڈلی بیمار ہے۔

''جب بچانے ہمیں یہ واقعہ بتایا تو ہم سب گھر والے خوف زدہ ہوگئے' اس دن کے بعد ہمارے گھر کا کوئی فرد رات کو شری پٹھان قبرستان سے نہیں گزرا' اور نہ پھر کبھی ہم نے ان درختوں سے لکڑیاں کاٹیں۔''

میں نے اپنے دوست سے وہ درخت دیکھنے کی فرمائش کی جب ہم بوہڑ اور پیپل کے سوکھے درختوں کے پاس گئے تو میں نے خوشبو کی مہک محسوس کی اس مہک کے بارے میں سنی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہاں سے گزرنے والا ہر کوئی یہ مہک محسوس کرتا ہے۔

میں نے اپنے دوست سے وعدہ کیا تھا کہ میں یہ کہانی لکھوں گا میں نے وعدے کے مطابق ایک اور دنیا کے باسیوں سے جڑی یہ کہانی سچی کہانیاں کے لیے لکھ دی ہے' آپ قارئین کو یہ کہانی کیسی لگی اس بارے میں اپنی قیمتی رائے احوال میں ضرور دیجیے گا۔

☆☆.....☆☆

عشق نمبر

اب تو شائد ہی مجھ سے محبت کرے کوئی
میری آنکھوں میں تم صاف نظر آتے ہو

سچی کہانیاں کا شمارہ اپریل 2018ء 'عشق نمبر' ہوگا۔
لکھاریوں کی ایسی عشقیہ کہانیاں شامل ہوں گی جو آپ برسوں یاد رکھیں گے کیونکہ وہ آپ کے دل کے تاروں کو بے انتہا خوبصورت موسیقی سے آشنا کریں گی۔
صرف عشقیہ کہانیاں ہی نہیں بلکہ آپ اپنی زندگی کے عشق بھی تحریر کی شکل میں ہمیں بھیج سکتے ہیں۔

ایجنٹ حضرات سے درخواست

برائے کرم اپنے آرڈر سے ادارہ
سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں۔

مردے کی فریاد

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے زندگی کی کس گلی میں شام ہوجائے

ایک گورکن کا ہولناک تجربہ جو پڑھنے
والوں کے بھی رونگٹے کھڑے کردے گا

الماس فاطمہ ارمان

یہ کہانی ایسے گورکنوں کے لیے عبرت ہے جو پیسے کے لالچ میں کسی بھی قبر کو مسمار کردیتے ہیں اُس قبر کے مردے کو ڈھانچہ کہہ کر دوسرے گڑھے میں ڈال دیتے ہیں اور اُن کی جگہ پر تازہ مردہ دفنا

دیتے ہیں لوگوں سے میری التجا ہے کہ اپنے پیاروں کو اس طرح مسمار ہونے سے بچائیں ساری عمر کے لیے وہ اکیلا روتا ہوا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اُن کی محبتوں کا کیا صلہ ہم دیتے ہیں قبر میں دفن کرنے کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھتے اُن کی قبر پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی ہے کم از کم ان کے نام کا کتبہ ہی لگا دیں تاکہ اُن کی قبر کی شناخت کے ساتھ وہ مسمار ہونے سے بچ جائے یہ کہانی بھی ایسے ہی دو محبت کرنے والے جوڑے کی جنہوں نے خودکشی کر کے اپنی محبت کو امر کیا دونوں کی قبریں برابر برابر تھیں مگر اُن کے وارث بھی پلٹ کر اُن کی قبروں پر نہ آئے اُن کی روحیں بے چین تھیں مگر یہ کیا دس سال بعد اُن کی قبروں کو مسمار ہونا تھا اُن کی روحیں جدا ہوگئیں مگر جدا ہونے سے پہلے مردے نے قبرستان کے چوکیدار شاہ گل سے ملاقات کی کس طرح کی یہ شاہ گل آپ کو اپنی زبانی بیان کردے گا۔

دسمبر کی سخت سرد رات تھی ہولناک سناٹا تھا لوگ سردی کی وجہ سے اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

دکانیں ہوٹل سب بند ہوچکے تھے۔ سردی کے ساتھ ہوا کے ساتھ بارش بھی وقفہ وقفہ سے ہورہی تھی۔ شاہ گل اپنی سائیکل پر بیٹھا عزیز آباد جہاں پرانا قبرستان ہے وہی چھوٹے چھوٹے بنگلے اور فلیٹ بھی ہیں پہرہ دے رہا تھا۔

شاہ گل پندرہ سال سے اس محلے کے چوکیداری کررہا تھا اُس کی سیٹی کی آواز دور دور تک گونجتی تھی محلے کے ساتھ ساتھ آخر میں وہ قبرستان کا چکر لگاتا تھا سب لوگ پوچھتے شاہ گل رات کے پہر قبرستان کے چکر لگاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟

''ارے یار کیا ڈرنا ایک دن ہمیں بھی یہاں آنا ہے۔''

میں سندھ یعنی میرپور خاص کا رہنے والا تھا۔ بچپن میں ہی کراچی بھاگ کر آ گیا تھا کہیں جگہ نہ ملی تو قبرستان کے گورکن رمضان کے ساتھ رہنے لگا اُس کے ساتھ گورکن کا کام کرنے لگا۔

قبروں کی صاف صفائی کرتا اس کے عوض لوگ اُسے اچھی اجرت دیتے وقت گزرتا گیا وہ دل کا پکا ہوگیا شروع شروع وہ قبر میں اترتے ہوئے گھبرا جاتا تھا۔ مگر وہ اب کسی بات سے نہیں ڈرتا تھا وہ قبر سے مردوں کے ڈھانچے نکال کر بڑے آرام کے ساتھ دوسری جگہ منتقل کردیتا بہادری کی وجہ سے چوکیداری کا کام اُسے سونپا گیا تھا۔ سردی ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔ اُس نے محلے میں چاروں طرف چکر لگایا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ سردی سے اُس سے سائیکل نہیں چل رہی تھی وہ سائیکل سے نیچے اترا اور قبرستان کے اندر کے راستہ سے اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا قبروں کے بیچ سے نکلتے ہوئے اُسے کسی قبر میں رونے اور باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی گریہ کر کے اُسے اپنے دل کی باتیں کررہا ہو۔ اُس نے جلدی سے ٹارچ جلایا اور قبر کی طرف رخ کیا۔

''یہ کیا اُس نے دیکھا قبر کا منہ کھلا ہوا ہے درمیان کی دونوں سلیں بھی ہٹی ہوئی ہیں۔ شاہ گل سمجھا کوئی مردہ خور یا کفن چور ہوگا اُس نے اپنے ڈنڈے کو زور سے قبر کی سل پر مارا۔

''کون ہے اندر باہر نکل۔'' اندر سے آواز آنا بند ہوگئی۔ شاہ نے ٹارچ جلائی اور اندر روشنی ماری اُس نے دیکھا ایک آدمی لاش سے لپٹا ہوا ہے۔ اور لاش کا بھی بند کفن کھولا ہوا ہے اس کی

میت بالکل تازہ تھی وہ ایک نوجوان لڑکی کی میت تھی وہ یہ منظر دیکھ کر سن ہوگیا مگر پھر اُس نے ہمت کر کے اُس آدمی سے کہا۔

''قبر سے باہر نکلو ورنہ میں تمہیں اُس لڑکی کے ساتھ دفن کردوں گا۔'' شاہ گل نے دیکھا وہ تیزی سے اوپر آ رہا ہے اُس نے ٹارچ کی روشنی تیز کر دی۔

''اُف میرے خدا یہ کیا ماجرا تھا۔'' اُس نے دیکھا وہ لڑکا تھا اُس کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔''

''میں اپنی منہاج سے باتیں کر رہا تھا۔''

''منہاج کون؟''

''آپ نے دیکھا نہیں جس سے میں قبر کے اندر باتیں کر رہا تھا۔'' سخت سردی میں شاہ گل کو پسینہ آ گیا۔

''تم کون ہو مجھے صاف صاف بتاؤ ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔'' پولیس وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

''ارے مجھ مردے کو پولیس کے حوالے کیا کر رہے ہو تم چلو میں اپنے بارے میں بتاتا ہوں میرا نام راحیل ہے اور جس سے میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ میری زندگی میری محبت منہاج ہے میری مینا ہم دونوں میں بہت محبت تھی ہم دونوں نے مرنے جینے کی ساتھ قسمیں کھائی تھیں مگر مینا کے چچا اور والد ہمارے رشتے کے لیے رضا مند نہیں تھے وہ کہتے ہماری برادری سے الگ شادی نہیں ہوتی۔

اس لیے انہوں نے شادی میں جلدی کی اور چچا نے اپنے بیٹے سے مینا کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں مایوں کے دن مینا نے باتھ روم سے تیزاب کی بوتل حاصل کر کے پی ڈالی۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی وہ بچ جائے مگر وہ دنیا میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں میں روتا رہا میں روز اُس کی قبر پر آتا تھا پھر پتہ ہے کیا ہوا۔ ایک دن میں روتے روتے سو گیا مجھے لگا وہ مجھے کہہ رہی ہے راحیل تم اکیلے کیوں ہو میرے پاس آ جاؤ میرے برابر میں جگہ ہے پھر میں نے بھی خودکشی کر لی مگر مرنے سے پہلے میں نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا وہ مجھے اُس کے برابر ہی دفنائے اس طرح ہم دونوں برابر ہیں مگر یہ دنیا والے ہمیں برابر بھی نہیں رہنے دیں گے۔

شاید یہ کل یا پھر دو دن بعد ہمیں الگ الگ کر دیں تم گورکن کا کام بھی کرتے ہو؟ اُس لڑکے نے پوچھا۔ میں صرف رمضان چاچا جو کہ گورکن ہیں اُن کی مدد کرتا ہوں مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو تم تو زندہ آدمی ہو۔'' شاہ نے لڑکے کو پاگل سمجھ کر کہا۔ ارے تم سے میں پھر کہہ رہا ہوں میں مرا ہوں اچھا تم اپنے گھر جاؤ تم نہیں سمجھو گے۔''

یہ کہہ کر وہ لڑکا شاہ گل کی نظروں سے دھواں بن کر اوجھل ہوگیا۔ شاہ گل کو ایسا لگا جیسے برابر والی قبر میں کوئی اتر گیا ہو۔ شاہ گل نے لڑکی کی قبر پر روشنی ڈالی۔

''ارے یہ کیا قبر بالکل برابر تھی۔'' شاہ گل تیزی سے اپنے کوارٹر کی طرف بھاگا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے رمضان چاچا کو اٹھایا۔

''چاچا چاچا چا......''

''کیا ہوا بھئی۔''

''چاچا جلدی سے چائے بنا۔'' رمضان نیند میں گھبرا کر اٹھا۔

''خیر تو ہے شاہ چاچا میری طبیعت خراب ہے۔'' چاچا رمضان نے اُس کو گرم گرم چائے کے ساتھ انڈا ابال کر دیا۔ شاہ گل نے دو کپ گرم چائے پی اور لحاف میں گھس گیا اُس نے رمضان سے تھوڑی سی افیم لی اور کھا کر سو گیا۔ صبح کافی ٹائم تک سوتا رہا دن کے تین بجے چاچا نے اُسے اٹھایا۔

''شاہ گل اٹھ جا کام بہت ہے دو جنازے آنے ہیں دونوں کی قبریں برابر ہیں صاف صفائی کر کے پرانے ڈھانچوں کو نکال کر گڑھے میں ڈالنا ہے چائے تیار ہے جلدی سے پی کر آ جا شاہ گل رات کی تمام باتیں افیم کے نشے میں بھول گیا۔

جلدی سے چائے پی کر وہ قبرستان پہنچ گیا۔

مگر جب وہ وہاں پہنچا تو اُس کے دماغ کو بری طرح جھٹکا لگا تمام رات کی باتیں فلم کی طرح دماغ میں گھومنے لگیں یہ وہی قبریں تھیں جہاں اُس کی ایک اجنبی سے گفتگو ہوئی تھی۔

''ابے کہاں کھویا ہوا ہے یہ ڈیڈ باڈی کھڈی میں ڈال کر آ۔''

''نہیں چاچا میں ان باڈیوں کو نہیں اٹھاؤں گا۔'' شاہ گل نے سختی لہجے میں کہا۔

''جھلا ہوگیا ہے۔''

''چاچا اِن کو ان قبروں میں رہنے دے یہ محبوب محبوبہ ہیں۔ اس کے محبوب نے مجھ سے رات بات کی ہے۔ میں تجھے سب کچھ بتاؤں گا تو یہ قبریں بند کر دے۔''

''چل دفع ہو پتہ نہیں افیم زیادہ کھالی ہے تو جا میں اور نشی یہ کام کریں گے۔'' شاہ واپس اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جنازے آ گئے جنازے کے ساتھ جو لوگ تھے اُن کے شور کی آواز سن کر وہ دوبارہ اُسی سمت چل پڑا لڑکی کی میت نوری لحد میں اتار دی تھی وہ دفنا کر چلے بھی گئے مگر لڑکے کی میت رکھی تھی شاہ گل نے نشی سے پوچھا۔

''اس کی میت کیوں رکھی ہے۔''

''اِس کا بھائی پردیس سے آیا ہے راستہ میں ہے۔ وہ شکل دیکھے گا تب تدفین ہوگی۔'' پتہ نہیں شاہ گل کا دل بے چین تھا سردی میں بھی اُس کو ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے کچھ دیر بعد رونے پیٹنے کی صدائیں آنے لگیں۔ شاید اُس کا بھائی آ گیا وہ بری طرح رو رہا تھا۔ شاہ گل نے اپنی سی کوشش کر لی کہ پرانے مردوں کی جگہ تبدیل نہ ہو مگر کسی نے اُس نہ سنی۔

تو اُس نے فیصلہ کر لیا وہ گورکن کی نوکری نہیں کرے گا۔ وہ کوارٹر میں گیا اور اُس نے اپنا سامان اٹھایا اپنے پرانے دوست کے ساتھ رہنے لگا۔

اس نے بینک میں چوکیداری کی نوکری کر لی اور اپنے آپ کو اللہ کی عبادت میں مشغول کر لیا وہ ہر نماز میں توبہ کرتا اللہ مجھے معاف فرمائیں نے گورکنوں کے ساتھ مل کر کافی قبریں مسمار کیں وہ اگر کسی کے جنازے میں بھی جاتا ہے ڈر کی وجہ سے شکل نہیں دیکھتا کہیں پھر سے وہ سامنے نہ آ جائے اللہ تعالیٰ اپنے گناہ بندوں پر رحم فرما تو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے ہم مسلمانوں کو ہدایت فرما وہ اپنے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کرنے جائیں وہ اپنے پیاروں کو اس طرح نہ بھول جائیں یہ مت سمجھیں وہ مرنے کے بعد ہمیں بھول جاتے ہیں وہ پل پل ہمارا انتظار کرتے ہیں کب ہمارا پیارا آئے گا۔

☆☆......☆☆

خون آشام انتقام

یہاں کی خاک سے ہم بھی مشام رکھتے ہیں
وفا کی بو نہیں آئی یہاں نہ باندھو ناؤ

ماں باپ کے گزرنے کے بعد ردا کی حالت اپنوں نے بدتر کردی تھی اور پھر وہ ہوا جو انسانی عقل مان نہیں سکتی.....

تبسم زہرہ رضوی

جب امی کو اپنی موت کا یقین ہوگیا تو انہوں نے بڑی حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر اپنے تکیے کے نیچے اشارہ کیا میں نے تکیے کے نیچے دیکھا ایک کاغذ کچھ نوٹ تھے۔ میں نے نکال

کر امی کو دے دیے۔ انہوں نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا اور بہت رک رک کر اذیت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم اس پتے پر چلی جانا یہ میری کزن ہے۔'' اس کے بعد ان کی سانس اکھڑنے لگی۔ میں جلدی سے پانی لانے مڑی بوتل سے پانی لے کر جب ماں کے منہ میں گلاس لگانا چاہا ان کی اذیت تمام ہوگئی۔ اب نہ انہیں پانی کی ضرورت تھی نہ دوا دارو کی وہ مجھے چھوڑ کر اکیلا چھوڑ کر ایسے دیس جا بسیں کہ جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آتا ہے۔ میرے چیخ مار کر رونے پر خالہ آ تو گئیں لیکن ان کے چہرے پر ایسے تاثر تھے کہ جیسے میں ڈرامہ کر رہی ہوں لیکن امی کے بے جان وجود نے کچھ دیر کے لیے ان جیسی سنگدل کو بھی خاموش کر دیا۔

امی اور پاپا کی پسند کی شادی ہوئی تھی اس لیے دونوں کے گھر والوں نے انہیں قبول نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں نے کرائے کا مکان لیا اور اس میں رہائش اختیار کی میری پیدائش بھی وہیں ہوئی تھی۔ پھر ایک بھائی بھی ہوا لیکن کچھ عرصہ زندہ رہ کر مرگیا۔

پاپا گورنمنٹ ملازم تھے۔ اچھا بھلا گزارہ ہو رہا تھا پاپا مجھے بہت چاہتے تھے لیکن یہ چاہت شاید میرے نصیب میں تھی نہیں۔ نشے میں دھت بس کے اندھے ڈرائیور نے اُن کی جان لے لی۔ میت اٹھنے تک تو امی بے ہوش تھیں۔ ہوش آیا بھی تو یہ ہی کہتی رہتیں کہ اب میں جی کر کیا کروں گی اب تنخواہ آنا بند ہوگئی اور خرچ کی پریشانی ہو رہی تھی وہ تو بھلا ہو پاپا کے دوستوں کا کہ جنہوں نے بھاگ دوڑ کر کے پاپا کی پنشن بنوادی تھی ورنہ کلرک تو جتنا تنگ کر سکتے تھے کر چکے تھے۔ ان دنوں میں میٹرک میں پڑھتی تھی۔ ہم کوئٹہ شہر میں رہتے تھے۔ مکان کرائے کا تھا' اسی شہر میں خالہ بھی رہتی تھیں لیکن امی میں اور ان میں کچھ بہت بنتی نہیں تھی۔

امی کی پسند کی شادی کی وجہ سے نانی نے شادی اُن کی عمر سے دگنی عمر کے آدمی سے کردی یہ دولت مند تھے۔ کوئٹہ میں اُن کا بڑا سارا پرانے وقتوں کا مکان تھا۔ بچے بھی ہوئے لیکن خالہ بہت خوش نہیں تھیں۔ اپنی تباہی کی ذمہ داری وہ امی کو سمجھتی تھیں۔

خیر اب تو مالک مکان گھر خالی کروا رہا تھا۔ وہ دروازے پر امی کو باتیں سنا رہا تھا خالہ اپنی گاڑی میں آئیں اور اسے کرارے کرارے جواب دیے۔ خون کے رشتوں کی پریشانی یہ ہے کہ جوش میں آجاتا ہے۔

''تو اتنی ہمدردی ہے تو آپ لے جائیں۔''

''ہاں لے جاؤں گی' چلو منی۔'' وہ امی سے بولیں۔

''سامان سمیٹو۔'' اور ہم ان کے گھر آگئے اور دن میں تارے نظر آگئے۔ کچھ ہی دن میں امی نے اپنا چولہا الگ کرلیا۔ ہم ماں بیٹی ایک کونے میں پڑے رہتے پھر بھی گھر والوں کے چہروں کے بل ختم نہیں ہوتے تھے۔ سب ٹی وی دیکھتے ہمارا ٹی وی خراب ہوگیا تھا۔ بنوانے کی اوقات نہیں تھی۔ کوئی مشہور ڈرامہ چل رہا ہوتا اور میں امی کا منہ دیکھ کر رہ جاتی۔

خالہ کے تین بیٹے ہی تھے بیٹی نہیں تھی۔ وہ مجھے ان سے دور رکھنے کی کوشش کرتیں۔ وہ خود بھی مغرور و نک چڑھے تھے ہم لوگوں کو اس طرح دیکھتے جیسے حقیر کیڑے مکوڑے ہوں۔ خدا کسی کو کسی کے دروازے پر نہ ڈالے' اب میں سمجھدار ہوگئی تھیں سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی دوسرے

درجے کی مخلوق سمجھنے پر مجھے بہت ملال ہوتا اب امی بھی بیمار رہنے لگی تھیں۔ پنشن کی رقم اتنی قلیل ہوتی کہ اس سے اُن کا علاج معالجہ مشکل تھا میری پڑھائی کا خرچ کچن کا خرچ ہی مشکل سے پورا ہوتا۔ خالہ چاہتیں تو ہماری مدد کر سکتی تھیں' لیکن ایسا نہیں تھا۔

خالو صاحب تو ہمیں کس طرح برداشت کر رہے تھے۔ بڑے سے گھر میں سب سے کونے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اس کے برابر میں اسٹور میں امی چولہا جلا لیتی تھیں۔ خالہ کی طرف سے مزیدار کھانوں کی خوشبوئیں آتیں اور ہم ماں بیٹی دال روٹی حتیٰ کہ چٹنی روٹی' کھاتے۔

''خبردار امی کہتیں جو کسی کے کھانے پر نیت خراب کی؟ غیرت کے ساتھ جیو۔'' سو میں نے کبھی خالہ کے کچن میں نہیں جھانکا جہاں ملازمہ بہترین کھانے پکا رہی ہوتی خالہ کی دوستیں شہر کی امیر کبیر خواتین تھیں۔

اُن کے پاس ہمارے لیے وقت بھی کب تھا۔ ہم بھی یہی سوچتے کہ اپنے گھر میں رکھ لیا ہے یہی کیا کم ہے۔ جو ہم ان سے کچھ اور توقع رکھیں؟ امی کو چیسٹ کینسر ہو گیا تھا۔

مرتے وقت انہوں نے مجھے جو پتہ دیا تھا وہ کراچی کا تھا' یہ بھی انہی کی خالہ زاد بہن تھیں۔ امی کہتیں ہیں تو یہ بھی منی ہی کی طرح کی؟ لیکن وہ کراچی ہو گا۔

وہاں ہو سکتا ہے بہتری ہو؟ امی نے پتہ نہیں میرے لیے کیا کیا خواب بُنے تھے۔ سب مٹی ہوتے دیکھ کر وہ بری طرح رونے لگتیں۔ وقت نے مجھے وقت سے پہلے بہت بڑا کر دیا تھا۔ میں مستقل یہ سوچ رہی تھی کہ یہاں کچھ بھی ہے لیکن جان و عزت محفوظ ہے۔ آگے پتہ نہیں کیسے لوگ ملیں؟ کیا ہو' خیر چالیسویں کے بعد منی خالہ نے مجھے سخت نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''تم نے اپنے لیے کیا سوچا ہے۔'' میں اپنی ذات میں ایک بہادر لڑکی تھی۔ لیکن گھر سے نکلنے کا سوچ کر میرے چھکے چھوٹ گئے۔

''وہ امی نے کراچی جانے کو کہا تھا۔''

''تو چہلم تو ہو چکا۔'' ان کے لہجے میں سفاکی تھی۔

''جی کل جاؤں گی۔''

''آج کیوں نہیں سب ٹرینیں ابھی کراچی جا رہی ہیں۔'' میں دل میں دھواں دھار رو رہی تھی۔ ایکدم مضبوط ہو گئی جب جانا ہی ٹھہرا تو کل کیا اور آج کیا؟

''ٹھیک ہے میں ابھی تیاری کرتی ہوں۔'' میں نے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نوکر چھوڑ آئے گا۔'' میں اپنی طرف آ گئی۔ کپڑوں کی اٹیچی لی ایک آدھ زیور امی کا بچا تھا' پنشن کے کاغذات' امی کی چیزیں بطور نشانی' باقی چیزیں تو راہِ خدا میں دیں۔ ڈرائیور نے ہارن دینے شروع کر دیے تھے۔ آخر میں نے امی کی مسہری سے لپٹ کر کہا۔

''خدا حافظ۔'' پھر خالہ کی طرف جھانکا۔ وہ فون پر مصروف تھیں۔ ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہہ دیا۔ ان سے اچھی تو بوا بیگم تھیں کھانا پکانے والی' ایک طرف کھڑی میری دکھ بھری روانگی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے گلے سے لگایا سر پر ہاتھ پھیرا سو روپے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔

''کوئی مشکل ہو تو خط لکھ دینا اسی پتے پر جو ہو سکا کروں گی۔'' مجھے پتہ تھا مختصر تنخواہ پر نوکری کرنے والی بوا بیگم بھلا میرے لیے کیا کر سکتی ہیں۔ لیکن اس وقت اس کڑے وقت میں اُن کی آواز نے مجھے اتنا حوصلہ دیا کہ بیان سے باہر ہے۔

میں دل میں روتی بظاہر مضبوط نظر آنے کی کوشش کرتی آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور چاچا بھی شریف آدمی تھے۔ اپنی نوکری بچاتے یا مجھ پر رحم کھاتے' لیکن اس طرح بے ماں باپ کی بیٹی کو نکالے جانا انہیں بھی شاق نظر آ رہا تھا۔ خیر زنانے ڈبے میں سوار ہو گئی۔ چاچا نے ٹکٹ لا کر دیا سر پر ہاتھ رکھا تو مجھے پاپا یاد آ گئے۔ سیٹی ہو گئی تھی ٹرین چل پڑی وہ اتر گئے۔ صبح دم کراچی آ گیا تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو پتہ بتایا ڈیفنس اس نے آسانی سے مجھے ننھی آنٹی کے گھر پہنچا دیا۔

امی نے سچ کہا تھا کہ ہے تو یہ بھی منی کی طرح' مگر اس کے سوا کوئی اور ہے بھی تو نہیں' میں نے ان کے بڑے بنگلے میں قدم رکھا تو دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ اُن کی بھی بوا تھیں' تیز طرار ابھی تو بیگم آرام کر رہی تھیں۔ شام کو ملیں گی۔ آیئے آپ کو آپ کی جگہ دکھا دیتی ہوں۔ ابھی ہم دوسری منزل پر کھڑے تھے۔ وہ مجھے لے کر تیسری منزل پر چلی گئیں۔

یہاں ایک کمرہ اور واش روم بنا تھا۔ باقی بھاڑ جیسا صحن' کمرہ میلا اور چھوٹا سا تھا میں نے خود ہی ڈسٹنگ کر کے اٹیچی رکھ کر منہ ہاتھ دھویا' گھر میں آنے والے غریب رشتہ داروں کے قدم چومے نہیں جاتے۔

کچھ دیر ٹھہر کر میں پھر نیچے آ گئی۔ بوا کچھ پکا رہی تھیں میں نے اُن کی طرف دیکھا انہوں نے چائے ناشتہ کو دے دیا۔

''یہاں سے کھانا آپ کو تین دن ملے گا پھر آپ کو خود اپنا بندوبست کرنا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میرے پاس پیسے بھی کچھ بہت نہیں تھے۔ ناشتہ لے کر میں پھر اوپر چلی آئی چائے پیتے ہوئے میں مستقل اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اچانک خیال آیا کہ مجھے اس سے مانگنا چاہیے جو کبھی واپس نہ کرے۔ میں نے قضا نماز ادا کی اور اپنے سامان میں ہلکا گدا بچھا کر سو گئی' شام کو آنکھ کھلی آنٹی جاگ چکی تھیں شرفِ باریابی بخش دیا گیا۔

میں نے اچھی طرح سلام کیا' جواب اس طرح دیا کہ کہیں میں گنواروں کی طرح لپٹ نہ جاؤں رسمی تعزیت کی' میں نے بتایا۔

''B.A کا امتحان دیا ہے نوکری چاہیے۔'' انہوں نے میرے سامنے نمبر ملایا۔ کچھ بات کی' پھر کہا۔

''نوکری لگ گئی ہے۔ کل ڈرائیور چھوڑ آئے گا باقی خود آنا جانا' ہم نے تمہارے لیے اتنا کر دیا۔ یہاں کوئی کسی کو پانی نہیں پوچھا۔ جتنی جگہ رہنے کو دے دی ہے۔ پچاس ہزار کرائے پر ملتی ہے۔''

''جی.....'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

''بس اب آرام کرو۔'' انہوں نے اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اوپر چلی آئی۔ بات تو سچ کہنے کا طریقہ غلط تھا۔ خیر یہ بھی بہت ہے نوکری کا سوچ کر خوشی ملی۔ اوپر تنہائی تھی ویرانی تھی لیکن یہ بھی بہت تھا۔ جان عزت محفوظ ہونا ہی بڑی بات ہے خیر بڑی اچھی بات یہ تھی کہ یہ ننھی آنٹی جو مسز ہوٹل والا کہلاتی تھیں۔

اُن کا کوئی لڑکا نہیں تھا صرف تین لڑکیاں ہی تھیں معمولی شکل کی، لیکن امارات کی وجہ سے اچھی لگ رہی تھیں۔ مجھ میں اور اُن میں کلاس کا بہت بڑا فرق تھا۔

رات سونے کو لیٹی تو بے آواز آنسو چہرہ بھگوتے رہے۔ پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ صبح میں آفس جانے کو تیار تھی۔ بوا نے ناشتہ دے کر یہ جتا دیا کہ آج دوسرا دن ہوگیا ہے۔

''جی آنٹی۔'' آفس اچھا تھا کوئی غیر ملکی فرم تھی ماحول بھی کسی حد تک بہتر تھا۔ اب یہ اپنے آپ پر بھی منحصر ہوتا ہے، سینئر نے کام سمجھا دیا۔ دن اچھا بھلا گزر گیا لنچ ٹائم میں، سب نے لنچ باکس نکالے کچھ نے ہوٹل سے کھانا منگوایا لنچ باکس دیکھ کر ایک سرد آہ کلیجے سے نکل گئی۔

امی ٹھیک تھیں تو ایسا ہی اسے بھی بنا کر دیتی تھیں۔ ہوٹل سے میں نے بھی کھانا منگوالیا تھا۔ گھر آکر میں نے پیسوں کا شمار کیا۔ اب بس سے جانا پڑے گا۔ وہ کرایہ اور کھانا ملا کر تنخواہ تک پیسے پورے ہوتے نظر نہیں آرہے تھے۔ کل یہاں بھی کھانے کا آخری دن ہے۔ بوا کو میرے لیے کھانا پکانا مشکل نظر آتا تھا۔ پھر کیا میں بھوک سے مر جاؤں گی مجھے بے اختیار رونا آگیا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

پھر پتہ نہیں کب گہری نیند آگئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کمرہ ہے اپنے پرانے گھر کا جس میں وہ امی اور پاپا رہتے تھے۔ پاپا نے امی سے کہا۔

''یہ رونے کی آواز کس کی ہے؟''

''یہ آپ کی بیٹی رو رہی ہے۔''

''ہیں کیوں......؟''

''پتہ نہیں......''

''گڑیا......'' انہوں نے گھر کے نام سے پکارا۔ پھر دیکھا کہ امی پاپا نے مجھے بہت سارا پیار کیا لپٹا لپٹا کر حوصلہ دیا۔

''کیوں رو رہی ہو؟'' اس نے بتایا کہ پیسے کم پڑ رہے ہیں۔

''تمہارے پاس تھوڑا زیور ہے بیچ دینا چیز اسی دن کے لیے ہی تو ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ دن گزر جائیں گے اور اچھے دن آجائیں گے۔ خواب کے آخری حصے میں یہ تھا کہ پاپا لپٹا کر کہہ رہے تھے کہ میں اپنی بیٹی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا؟ اور امی کہہ رہی تھیں کہ میں نے تمہیں نماز سکھائی تھی وہ ساری پریشانیوں کا حل ہے۔

اسے ترک نہ کرنا، جن بچوں کے ماں باپ مرجاتے ہیں کیا وہ زندہ نہیں رہتے بہت حوصلے سے جیو، میری کی آنکھ کھل گئی صبح کا اعلان موذن فرما رہے تھے میں کلمہ شریف پڑھتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ پھر دو دن بعد زیور بیچنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پاپا کی پنشن میرے نام ہوگئی۔ معاشی سہارا بڑھ گیا۔

چپڑاسی نے بات کی کہ میں گھر سے صاف ستھرا کھانا پکوا کر لاتا ہوں آپ کو ہوٹل سے آدھی قیمت میں پڑے گا، میں نے طے کرلیا۔

میں نے امی کے مطابق نماز کی پابندی شروع کردی تھی اس طرح بہت سے مسائل بھی حل ہوجاتے کہ مجھے خود حیرت ہوجاتی۔ نھی آنٹی کا رویہ مجھ سے بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی بیٹیوں کے رشتوں کے لیے آنے والی عورتیں میری طرف دیکھتی تھیں کہیں کی حور پری تو میں بھی نہیں تھی لیکن ایک تو میرا رنگ صاف تھا دوسرے کوئٹہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے صحت اچھی تھی۔ تیسرے سجدے کا نشان عبادت گزار ہونے کا گواہ تھا؟ حالانکہ میں صبح نکلتی شام کو گھر آتی تو اوپر قید ہوجاتی۔

جب نیچے سب ہنس بول رہے ہوتے تو میرا بھی بڑا دل چاہتا۔ میں بھی سب میں بیٹھوں ہنسوں بولوں مجھے رونا آنے لگتا۔ غربت بری بلا ہے میں کب اس قابل ہوں کہ ان سب میں بیٹھ سکوں نہ پلے روپیہ پیسہ نہ ماں نہ باپ نہ جاہ وحشم کسی بات میں بھی تو مقابلہ نہیں تھا۔ یہی کیا کم ہے کہ اپنے گھر میں جگہ دے دی ہے۔ کھانے کا سسٹم یہ تھا کہ جو لنچ چپڑاسی سے خریدا جاتا آدھا وہیں ختم ہوجاتا۔ باقی کا شام کو گھر لا کر کھالیتی۔ گھر سے بھی بھوکی پیاسی آفس جاتی۔ وہاں دس بجے چائے ملتی تھی اپنے پرس سے بسکٹ نکال کر ناشتہ ہوجاتا میرا بھی دل چاہتا تھا کہ پراٹھہ ناشتہ یعنی انڈا پراٹھا دوپہر کا کھانا رات کا کھانا ہو اس کے بجائے ٹھنڈی سانس مقدر تھی لیکن جب سے میں نے خواب میں امی پاپا کو دیکھا تھا میرے اندر زندہ رہنے کی امنگ جاگ اٹھی تھی۔ ایک دن میں نے کلیجی تکہ والے کو چھوٹی سی انگیٹھی جلا کر کلیجی تکہ بناتے دیکھا تو خریدنے کے بہانے پوچھ لیا۔

''انکل یہ انگیٹھی کہاں ملتی ہے۔''

''وہ سامنے گلی میں ٹال ہے وہیں کوئلے بھی ملتے ہیں۔'' میں نے وہاں جاکر دیکھا۔ واقعی وہاں ٹال تھی میں نے دونوں چیزیں خریدیں۔ گھر لا کر ایک طرف بیٹھ کر سب سے پہلے چائے بنائی پی تو مزہ آگیا۔ پھر تو جب موقع ملتا میں ضرور کچھ کھانا پکاتی۔

اس طرح صحت کافی بہتر ہونے لگی لیکن شاید بہتری مقدر میں نہیں تھی یا سکون مجھے راس نہیں آتا تھا۔ مجھے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا لیکن ہاف چادر بھی لیتی تھی۔ اس روز جو گھر پلٹی ہنگامہ تیار تھا۔ سب کے موڈ خراب تھے۔

''اِدھر بلاؤ اُسے......'' نھی آنٹی کی طیش بھری آواز آئی اور میرا دل سینے میں دھڑکنے لگا۔ ان کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

''جب سے تم منحوس نے میرے دروازے پر قدم رکھا ہے مجھے بزنس میں نقصان ہوا میری بیٹی کا طے ہوتا رشتہ ختم ہوگیا تمہاری وجہ سے، تم نے انہیں اپنے جال میں پھانس لیا۔'' پھر مجھے یاد آیا چند دن پہلے جب میں گھر آئی تھی تو چند خواتین نظر آئی تھیں۔ میں نے اخلاقاً سلام کرلیا تھا۔

''تم ابھی کے ابھی میں ہمارا گھر خالی کردو؟'' اب تو مجھے پسینے آگئے۔ اس وقت فون بجا اُن کی دوست بزنس پارٹنر تھیں۔ انہیں بے پناہ فائدہ ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر خوشی نظر آئی۔ اور میں نے دونوں ہاتھ اُن کے آگے جوڑ دیے۔

''آنٹی خدا کے لیے مجھے گھر سے نہ نکالیں، میں دو وقت مجبوراً یہاں سے گزرتی ہوں اس کا کوئی حل نکال لیں، میں بڑی چادر بلکہ برقعہ اوڑھ کر گزر جایا کروں گی۔'' فائدے کی خوشی میں اُن کا موڈ بحال ہوگیا۔ اسی شرط پر انہوں نے مجھے معاف کیا تھا کہ میں برقعے میں اوپر جاؤں گی چند دن خاموشی سے گزر گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ آنٹی سے کہوں کہ مجھے گلی سے زینہ لگوادیں لیکن اس سے خطرہ یہ تھا کہ کوئی چور چکار نہ چڑھ کر آجائے۔ اس طرح میں ان کے حصے سے گزرنے سے بچ جاتی۔ خیر ان کے معاف کردینے سے بہت اطمینان ہوا۔

میں امی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نماز کی پابندی کررہی تھی شاید اس وجہ سے مسائل حل ہوجاتے تھے۔ بلکہ اس مرتبہ زیادہ ہی حل

ہوگئے۔ کیونکہ آنٹی کے میاں خالو کا تو انتقال ہو چکا تھا یہ بزنس دیکھتی تھیں۔ اس لیے کینیڈا میں مقیم اُن کی دوست و بزنس پارٹنر نے بزنس کا کافی حصہ کینیڈا منتقل کر کے ننھی آنٹی کو اس کا اونر بنا دیا۔ اس طرح وہ فیملی یہاں سے چلی گئی اور سکون ہوگیا۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا کہ دشت غربت میں تیرے لیے آرام کہاں؟ تو شاید اسی کے لیے کہا تھا۔ ننھی آنٹی کے جانے سے جو خوشی ملی وہ زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کچھ اوباش لڑکے جن کا تعلق انہی کے بنگلوں سے ہیں تو میں ان اوباش لڑکوں کی نظروں میں آگئی واپسی میں بس ہماری لائن کے کونے پر اتار دیتی۔ پھر گھر تک پیدل آنا پڑتا یہ شام کا وقت ہوتا بنگلے کوٹھیوں کے باہر لان ہوتے تھے اور ایک مرتبہ آواز آئی۔

''ابے لوٹ ہی لوٹ۔'' پھر ہنسنے کی آوازیں' ان بگڑے امیرزادوں کی آوازوں سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ بینک لوٹ کر آئے ہیں۔ میں سن رہ گئی۔ ہر دو بنگلوں کے بعد ایک پتلی سی گلی آتی تھی اپنے آپ کو چادر میں پوشیدہ کیے میں گلی میں مڑ جاتی پھر دو بنگلوں کے بعد پتلی گلی میں سے گزر کر سڑک پر آ کر پھر اپنے گھر آتی۔ تاکہ اگر کوئی پیچھے آ رہا ہوتا مڑتا دیکھ کر رک جائے لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ جرائم پیشہ لڑکے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

''ابے وہ آ رہی ہے تیری والی؟''

''ابے میری کہاں سب کی ہے' جس دن ہتھے چڑھی سب کی دعوت ہوگی۔ ایسے ہی کام چلتا ہے مل بانٹ کے؟'' میں سن ہی تو رہ گئی۔ خیر اس دن تو میں کسی نہ کسی طرح گھر آ گئی خیریت سے لیکن جو دل کی حالت تھی۔ بیان سے باہر تھی' کاش کوئی باپ بھائی میرے بھی ہوتے پھر دیکھتی کیا قیمہ بناتے' منحوسوں کا' اس وقت میرے دماغ میں جملہ گونجا۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ مصرعہ تھا کہ اُس کا جگنو' لیکن پھر وہ ہوگیا جو میرے فرشتوں نے بھی نہ سوچا تھا؟ دوسرے دن موسم کے آثار کچھ اچھے نہیں تھے۔ بس سے اتری تو چار بائیک سوار میرے آگے پیچھے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ میں کونے والے بنگلے کی طرف مڑ گئی وہاں ایک تندرست بزرگ جو نانا ابا کہلاتے تھے کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ آندھی آ رہی تھی اندھیرا چھا رہا تھا میں گھبراہٹ دہشت کے عالم میں' ان کی طرف دوڑی وہ معاملہ سمجھ کر غصے میں کھڑے ہوئے اُن کے پیچھے اے سی نکلا ہوا تھا اُس کے اوپر جست کی چادر کا دروازہ تھا چھوٹا سا اُن کی کرسی ہٹا کر میں نے اُسے ہٹایا۔ اندر چھوٹے اے سی کا خلا تھا میں اللہ کا نام لے کر اس میں گھس گئی اس وقت وہ چاروں بھاگتے ہوئے وہاں آ گئے' نانا ابا دلیر تھے۔

''لڑکی ہمارے حوالے کر دو بڑے میاں۔''

ایک بدتمیزی سے بولا۔

''ابھی کرتا ہوں۔'' انہوں نے سیٹی بجائی۔ اب میں شاید انہی کے بیڈ روم میں تھی جلدی سے گلی کے دروازے کی طرف بڑھی اور اندھیری گلی سے کسی نہ کسی طرح گھر تو پہنچ گئی۔ لیکن اب میں باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ میری چھت پر ایک آرٹیفیشل جھاڑ کا درخت تھا۔ میں نے اس کی آڑ لے کر دیکھا نانا ابا کی سیٹی پر آٹھ دس لمبے تڑنگے غالباً اُن کی آل اولاد نکل آئے تھے اور وہ لڑکے اِدھر اُدھر کوئی کب تک میری حمایت کرے گا۔ اس رات مجھ سے کھانا بھی نہ کھایا گیا بس رو رو کر اسی سے فریاد کرتی رہی جو مظلوموں کا فریاد رسا

ہے۔ اور سوچتی کہ اگر نوکری پر نہیں جاؤں گی تو زندہ کیسے رہوں گی۔ اب گھر میں صرف بوا تھیں۔ اور گیٹ پر چوکیدار میرے اوپر ٹوٹنے والی قیامت سے بے خبر' اگر خبر ہو بھی گئی کیا کوئی میرا ساتھ دے گا۔ یہ نہ ہو کہ نکلوا دیں۔ لیکن دوسری صبح میرے لیے خوشی و مسرت لے آئی۔ میری کولیگ میرے پاس آئی اور کہا۔

''یہ ایک ٹیکسی کا بندوبست کر رہے ہیں۔ ہمارا اور آپ کا روٹ ایک ہی ہے ہم تین ہیں چوتھی آپ آ جائیں۔ ماہانہ کرایہ ڈیوائیڈ کر لیں گے۔'' جب ہی رب کہتا ہے بندے پکار کے دیکھ راستے نکالنا میرا کام' چنانچہ بس کی اذیت ختم ہوئی پیدل اور غنڈوں سے بھی نجات شام کو آرام سے ٹیکسی میں گھر کے دروازے پر آ تا جاتی۔

اب میرا پروموشن بھی ہوگیا تھا جانے آنے کا آرام بھی ہوگیا تھا۔ اِدھر ان لڑکوں نے چونکہ بینک بھی لوٹا تھا اس لیے پولیس اُن کے گھر بھی آئی تھی۔ یہ تو بڑے ہل اونرز بااثر لوگ تھے جو معاملہ رفع دفع کر دیا۔ لیکن اب یہ لوگ زیادہ تر گھر میں رہتے تھے کالج یونیورسٹی میں بھی اس کا ریکارڈ خراب تھا۔ اور سب سے بڑھ کر اللہ کے بندہ انہوں نے روا رکھا ناصر یعنی میرے کے قہر کو بھی آواز دے دی تھی مجھے وہ خوفزدہ لمحات بھولے نہیں بھولتے تھے۔ جو ان کی وجہ مجھ پر گزرے تھے' ایک دن بوا اپنی سہیلی جو پڑوس کی تھیں باتیں کر رہی تھیں کہ انہی لوگوں نے ماسی کی لڑکی سے بھی ریپ کیا تھا۔ پھر اس کو پیسے دے کر خاموش کر دیا۔ بہرحال میرے دل میں آگ لگی تھی انتقام انتقام انتقام......

اصل کہانی تو آپ اب سنیئے۔ خدا تو معاف کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے خوش ہوتا ہے' ہر جگہ ایسی بات نہیں ہوتی' جہاں سزا دینی ہوتی ہے۔ وہاں ضرور دیتا ہے' پھر اگر صرف میرا معاملہ ہوتا تو شاید معاف کر دیتی یہ غنڈے تو معاشرے کے لیے خطرہ ہیں سب سے بڑھ کر اُن کے ماں باپ اُن کے پشت پناہ ہیں۔ اُن کی سرکوبی بہت ضروری ہے۔ آفس سے آ کر میں کچھ دیر آرام کرتی' پھر اٹھ کر کچھ پکا کھا لیتی۔ بوا کی مٹھی گرم کی تو انہوں نے کچن کے نام پر کاؤنٹر بنوا کر اوپر شیڈ ڈلوا دیا تھا۔ بہت آسانی ہوگئی تھی۔ جب شام رات میں تبدیل ہونے لگتی میں باہر دیکھتی تو درخت کی آڑ لے لیتی اس دن مجھے پتہ نہیں کیا ہوا میں برابر والوں کی چھت پر چلی گئی؟ گھپ اندھیرا لیکن سامنے کی لائن میں صمد ملعون جوان سب کا سردار تھا وہ رہتا تھا۔ اب اگلا گھر پھلانگتی تو اُن کا گھر سامنے پڑتا۔ دوسرے بنگلے میں ایک میٹر تک کا فاصلہ تھا۔ میں مایوس لوٹ رہی تھی کہ چاندنی میں اس چھت پر ایک تختہ پڑا نظر آیا۔ میں نے برابر والوں کی دیوار پر رکھ کر دیکھا۔ خوب مضبوط تھا اٹھایا بھی بہت مشکل سے گیا تھا۔ وہاں ایک بڑے درخت کی شاخیں آ رہی تھیں اب رسی لا کر باندھ دوں گی۔

اس گھر میں ایک انکل رہتے تھے وہ پتنگ بازی کے شوقین تھے۔ شاید بانس جو بیس پچیس لمبا نظر آ رہا تھا پتنگ لوٹنے کے لیے ہوگا میں نے اس کا سرا ٹٹول کر دیکھا سرے پر چھوٹا کنڈا لگا تھا۔ میں خوش خوش واپس آ گئی۔ میرے پاس ایک پرانی کالی سیاہ چادر تھی۔ اسی اصول پر میں نے پوری عورت کے سائز کی سیاہ رنگ کی عورت بنائی خصوصاً اُس کا چہرہ اتنا خوفناک تھا کہ اللہ کی پناہ پھر اس کو امی کا کالا سیاہ سوٹ پہنایا۔ اب تو میں خود بھی لرز اٹھی۔ اب مجھے کل کا انتظار تھا۔ اگلے

دن میں گوشت لینے گئی تو ایک کلیجی بھی خریدی جو بالکل تازہ تھی۔ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے میں گھر آ کر آدھی تو پکانے کے لیے رکھ دی آدھی کو خوب مسلا وہ خون خون ہوگئی۔ پھر چھنی سے چھان کر جگ میں خون تیار تھا۔ اسے میں نے شام کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر ایک سیاہ رنگ کے شاپر میں پلٹ دیا۔ کیلیں لگا لکڑی کا ٹکرا بھی باندھ دیا۔ پھر یہ سیاہ عورت لے کر اندھیرے میں' میں اس بنگلے کی چھت پر آ گئی جہاں بانس رکھا تھا۔ یہاں کے مکین شاید امریکہ کینیڈا نکل گئے تھے سو ویرانی تھی۔ سامنے صمد کمبخت کا گھر نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے موبائل پر گیم کھیلتا نظر آیا' میں نے سیاہ عورت کی گردن کے پچھلے حصے میں بانس کا کنڈا پھنسایا خون سے بھرا شاپر اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔ بانس اٹھانے کو جو میں نے ٹارچ جلائی میری خود کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ایک جانور جو بہت ہی بڑا چوہا یا سیاہ رنگ کی گوتھی مردہ حالت میں بانس کے قریب پڑا تھا میں نے بہت ہمت کی اور کاغذ سے پکڑ کر خون کے شاپر میں ڈال دیا۔ اسے شاید کسی دوسرے جانور نے بھنبھوڑ دیا تھا زخمی ہوکر مرا تھا۔ اب یا اللہ پکار کر اس بانس کو اس منحوس کی کھڑکی تک لے گئی اس کی لمبائی کھڑکی میں جا کر اس کے منہ تک پہنچی۔ سیاہ عورت میں' میں نے فوم کے دو تکیے پھاڑ کر بھرے تھے۔ وہ موبائل میں گم تھا۔ اب جو عورت نے اس پر حملہ کیا اور اس نے ہوش کی دنیا میں اُس کی شکل دیکھی میں نے بانس کو جھٹکا دیا اور جو مخلوق شاپر میں خون نہائی تھی اس کے منہ پر الٹ گئی اس کی چیخیں زمین و آسمان ہلا رہی تھیں میں نے بانس کو تیر کی تیزی سے کھینچ لیا۔ میں خود پسینے میں شرابور تھی۔ دبے پاؤں گھر لوٹ آئی۔

بانس کو اسی جگہ پر چھوڑا جہاں سے اٹھایا تھا سیاہ عورت کو بغل میں دبایا اور گھر آ کر نہا دھو کر سکون کی سانس لی۔ بچو یہ پہلی قسط ہے میں نے دل میں کہا۔

لوگ جمع ہوگئے تھے اُن کی حرکتوں کی وجہ سے بہو بیٹیوں والے ناپسند کرتے تھے۔ وہ بار بار بے ہوش ہو رہا تھا یہی کہتا۔

"عورت آئی چڑیل ....." لوگ لاحول ولا کہتے واپس ہوگئے۔ ماں باپ اسپتال لے کر بھاگے انہوں نے کہا۔

"نفسیاتی کیس ہے سکون کا انجکشن لگا دیا ہے آپ سائیکو جسٹ کو دکھائیں۔" دوسرے دن سردی بھی بہت تھی ابر بھی بری طرح چھایا ہوا تھا۔ میں نے سیاہ چادر میں ملفوف ہوکر اس کے سامنے والے بنگلے میں دیکھا اس کا باپ کہیں جانے کے لیے گاڑی نکلوا رہا تھا ماسی ڈرائیور کو کچھ سامان دے رہی تھی۔ صاحب چوکیدار سب کھڑے تھے اس مرتبہ میں نے شاپر باندھ کر ہاتھ سے تاک کر نشانہ لیا۔ درخت کی آڑ لے کر جو عین ابا کے سر پہ تھا وہ ماسی خون خون ہوگئی تو نوکر سہمے ہوئے تھے۔ بھاگ کھڑے ہوئے صاحب بھی بے ہوش ہوگئے تھے۔ ہماری ٹیکسی جس راستے سے گزرتی تھی ایک آستانہ آتا تھا ہر مشکل کا حل بنگالی صرف بنگالی' میری کولیگ نادیہ اپنا رشتہ نہ ہونے پہ پریشان تھی۔ مجھ سے کہا۔

"میرے ساتھ چلی چلو۔" میں نے مروت میں ہاں کہہ دی وہاں رش لگا تھا۔ بڑی مشکل سے باری آئی۔

"پانچ ہزار رکھ دے' کچھ تعویذ وغیرہ دیے اور تیرا کیا ہے۔" مجھے پیاس لگی تھی میں نے لمحہ بھر پہلے پرس سے پانی کی بوتل نکال کر پانی پیا تھا تو

تھوڑا آنکھوں میں لگا لیا۔ جیسے بہت روئی ہوں۔ میں نے نادیہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے تنہائی چاہتی ہوں اب میں غضب کی ایکٹریس بھی ہو چکی تھی۔ وہ ایک طرف ہوگئی میں نے بابا کے آگے بڑھ جوڑ دیے۔

"بابا حضور' میرا مسئلہ ایسا نہیں جو میں یہاں بتا سکوں میں آپ کو جتنے کہیں گے پیسے دوں گی۔ لیکن مجھے اپنا فون نمبر دے دیں۔" کچھ سوچ کر انہوں نے نمبر دے دیا رات کو میرے دماغ میں اپنے شیطانی منصوبے کا آخری حصہ تھا۔ رات گیارہ کے بعد میں نے کال ملائی۔

"جی بابا....."

"بول بچہ....."

"بابا مجھے آپ سے بزنس کرنا ہے۔ لہٰذا پلیز بابا ہیئت سے باہر آ جائیں۔ میری پیسوں کی پیشکش اپنی جگہ برقرار ہے۔ میں آپ کو لاکھوں دلوا سکتی ہوں۔ پھر دو چار باتیں کر کے اندازہ کیا کہ اعتبار کروں یا نہیں۔

"آپ اس گھر میں جائیں گے لڑکی پر بھی سایہ ہوگیا ہے۔ دو لاکھ لڑکے کے لیں' باقی آپ کا کیس ہے جیسے چاہیں ہینڈل کریں بابا کو پیسوں کی شدید ضرورت تھی کل ٹھیک بارہ بجے آپ وہاں سے گزریں۔ اب مجھے کسی کے گھر جانے کی ضرورت نہیں تھی ہماری اپنی چھت سے دور سے منظر نظر آ رہا تھا۔

رات بھر میں' میں دو تین شاپر خون بھرے اُن کے لان میں اچھال چکی تھی۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ دن کے بارہ بجے بابا کے مطابق میں چھت پر شریفانہ حلیے میں درخت کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔ ایک آدمی ہندو سادھو' پیلا لبادہ بڑے بڑے بال' لمبی داڑھی' سیاہ رنگت

غزل

جیون کی ہر پریم کہانی تیرے نام
میری ہر اک درد نشانی تیرے نام

میرے ہر ایک لفظ میں تیری صورت ہے
لمحہ لمحہ شام سہانی تیرے نام

میرا ہر اک نقش تمہارا اُجلا پن
جذبوں سے بھرپور جوانی تیرے نام

میری سوچ یہ کہتی ہے تم میرے ہو
میرے پیار کی بات پرانی تیرے نام

کمرے میں خاموش پڑا سا رہتا ہوں
ان آنکھوں سے بہتا پانی تیرے نام

میں نے ساجد اب یہ اکثر لکھنا ہے
دریا کی ہر ایک روانی تیرے نام

ملک عاشق حسین ساجد' مظفر گڑھ

ہاتھوں میں کڑے پیروں میں کڑے اور کھڑاؤں گلے میں موٹے موٹے موتیوں کی مالا' صمد کے گھر کے قریب رُکا اُن کے گھر کا یہ حال تھا کہ نوکر ملازم کام چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اُس کی ماں خود کھانا پکا رہی تھی اور تھک کر بے حال ہو رہی تھی۔ گاؤں سے اُن کے رشتہ دار بھی آ گئے تھے اس کے والد باہر کھڑے تھے کہ سادھو جی بولے۔

''پریشان ہے بچہ؟'' وہ اُن کے پیروں میں گر پڑے پھر جائے وقوعہ پر لے گئے۔

''ہوں کالی تجھ سے ناراض ہے بچہ' کالی کالی ہی تھی مہاراج مان جائے گی راضی ہوگی پر سامان آئے گا۔ سیاہ بکرا غرض کہ دو لاکھ لگیں گے۔''

''دیں گے دیں گے بابا۔'' اُن کی جوان بیٹی بڑی خوبصورت تھی۔ بابا اس کی بھی جھاڑ پھونک میں لگے تھے۔ میں نیچے اتری بوا دوسری بوا سے سہمی ہوئی باتیں سن رہی تھیں۔ یہ بھی تو اتنی بڑی کوٹھی میں اکیلی رہتی تھی۔

''سن رہی ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''جی بوا...... سب لوگ اُن کے گھر جا رہے ہیں۔'' اصل میں میرے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

''چلیں دیکھیں......'' دونوں بوڑھیاں تیار ہوگئیں میں بھی اُن کے ساتھ سو شریفوں کی ایک شریف بنی جا پہنچی۔ اصل میں' میں اپنی آنکھوں سے جھاڑ پھونک دیکھنا چاہتی تھی۔ دنیا سے بے زار سادھو جی نے پہلے تو دو لاکھ کی گڈی قابو کی پھر سارے گھر کا چکر لگایا جے رام جی کی جے۔

''سادھو جی آپ حکم دیں' میں کروں گی۔'' ماں کو اپنی اولاد خطرے میں نظر آئی۔ اسی اثنا میں اُن کی عزیزہ نے چیخ ماری لان میں باہر ایک شاپر شاخ پر خون بھرا نظر آیا تھا ان سے بڑی چیخ ہماری بوا کی تھی میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگیں ایسی سرپٹ دوڑیں کہ جوانوں کو مات کیا گھر آ کر بھی سانس قابو میں نہیں آیا۔

''اے منی آج میں یہاں نہ سونے کی؟''

اگلے دن منصوبے میں آخری رنگ بھرنے کا دن تھا میں نے اپنے ٹیکسی والے جو بڑے میاں کچھ افیون چی قسم کے تھے۔ کلفٹن جانے کی بات کی جب میں دو گھنٹے کی تفریح کے بعد آؤں تو آپ تیار ملیں گے۔ تفریح کیا میری نانی اماں بیمار ہیں انہیں سمندر کے پانی سے غسل دینا ہے۔

''ہاں بیٹا مجھے پانی سے ڈر لگے ہے۔'' میں نے سیاہ عورت کو اپنی پرانی سینڈل پہنائی۔ پورا برقعہ اوڑھایا اور سہارا دے کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ بابا سے فون پر رابطہ تھا۔ ساحل پر ایک طرف ٹیکسی چھوڑ دی۔ اور نانی چڑیل کو لیے بابا کے بتائے ہوئے درخت تک جا پہنچی اب اِدھر اُدھر دیکھ کر میں نے پہلے نانی کو اوپر پھینکا پھر خود چڑھ گئی اور آرام سے شاخ پر بیٹھ کر پرس سے کھانے پینے کی چیزیں نکالیں اور انصاف کیا' اتنے میں دیکھا کہ صمد کی ماں گرتی پڑتی آ رہی ہے۔ وہ آ کر اسی درخت کے نیچے بیٹھی پھر پتہ نہیں کہاں سے بابا سادھو آ گئے اُن کے ہاتھ میں ڈوری سے بندھی ایک مٹی کی ہانڈی تھی۔ اس میں آگ جل رہی تھی دھواں اٹھ رہا تھا۔

''اب یہ ڈال دے۔'' انہوں نے رنگ برنگی پڑیاں اس عورت کو دیں۔ جب نیلی پڑیا ڈالو نیلے شعلے نکلے' پیلی تو پیلے پھر سبز ہری تو ہرے شعلے آخر میں سرخ ڈالنا۔ ہمارے جانے کا آ گیا ہے بچہ...... بابا خاموش لال شعلے کے ساتھ چڑیل اس میں گر کر بھسم ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر بابا یہ جا وہ جا عورت کی حالت خراب تھی پھر بھی اس نے ہمت کر کے لال پڑیا ہانڈی میں ڈالی سرخ شعلے نکلے اور میں نے نانی سیاہ کو ایک خوفناک آواز کے ساتھ' ان شعلوں میں کم اور عورت پر زیادہ پھینک دیا۔ ایک ہلکی لاغر آواز کے ساتھ وہ بے ہوش ہوگئی۔ اب اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں بجلی کی تیزی سے اتر آئی اپنی نانی کو لیا اور ٹیکسی میں آ بیٹھی فون آ رہا تھا۔

''کام ہوگیا ہے اس کے گھر والے اسے اٹھانے آنے والے ہیں' آپ جا رہی ہیں تو مجھے بھی لے چلیے۔''

''آ جائیں۔'' اور کچھ دیر کے بعد ایک چھبیس ستائیس سال کا جوان جینز ٹی شرٹ پہنے خوبصورت سا' ہاتھ میں بڑا سا شاپر لیے آ بیٹھا۔ پھر میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں نوکری نہ ہونے کی وجہ سے وہ بابا بنے ہوئے تھے۔ مسلمان اچھے خاندان کے فرد تھے۔ میں نے نانی کو ٹھونس ٹھانس کر شاپر میں رکھ دیا تھا اسی طرح بابا کے شاپر میں پیلا چوغہ کڑے سرکی وگ داڑھی کھڑاؤں وغیرہ' میں نے کوشش کر کے اپنے آفس میں اُن کو جاب دلوادی تھی خالہ آئی ہوئی تھیں کہ بابا کہ جن کا نام یاسر احمد تھا کی ماں میرا رشتہ لائیں۔ اور میں ایک خوبصورت تقریب میں اُن کی بنا دی گئی۔ اب ہمیں پھر رہنے کے لیے جگہ چاہیے تھی اُن کی ماں کا تو فلیٹ تھا صمد کے ماں باپ دبئی شفٹ ہوگئے تھے گھر آسیب زدہ ہوگیا تھا کوئی اس کے پاس سے بھٹکتا تک نہیں تھا۔ اُن کے ابا اسے بیچنے یا کرائے پر اٹھانا چاہتے تھے۔ ہم میاں بیوی پہنچ گئے اور وہ ہمیں کوڑیوں کے مول کرائے پر مل گیا یہیں ہمارے دونوں بچے ہوئے۔ ایک بیٹا ایک بیٹی' یاسر تو اتنے اچھے ہیں کہ میں آپ کو کیا بتاؤں ایک دن کھانے کے بعد رات کو سونے لیٹے تو میں نے کہا۔

''یاسر ہماری گورنمنٹ جاب تو ہے نہیں اگر یہ چھوٹ گئی تو کیا ہوگا۔'' پہلے تو خوب ہنسے پھر کہا۔

''تو میں نے بابا جی کو کون سا پھینک دیا ہے۔'' خیر نانی کو تو میں نے بھی نہیں پھینکا انہی کو پہن کر آپ کے برابر بیٹھ جاؤں گی۔ زمانہ خراب ہے ہر طرح کی عورتیں گھروں سے نکل آتی ہیں۔

''کوئی میرا میاں لے اڑی تو میں کیا کروں گی۔''

''بس تم عورتوں کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

میں نے صمد کے باقی تین دوستوں کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔ ایکدن اپنے بنگلے کے پچھلی سائیڈ پر دیکھا تینوں دوست چائے پی رہے تھے۔ میں نے کالج میں گولہ پھینکنے کی ٹریننگ لی ہوئی تھی۔ خون بھرا شاپر پتنگ کے مانجھے سے باندھ کر گولہ پھینکنے کے انداز سے کھینچ مارا۔ وہ سب کی چائے اور ان کے چہروں پر پھٹا' چیختے ہوئے بھاگے میں نے بجلی کی تیزی سے ڈور واپس کھینچ لی۔ دوسری اہم بات تو رہ گئی ہے۔

وہ یہ کہ صمد کی ماں جب درخت کے نیچے بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے نانی کو الگ کرنے کے بعد پرس سے تیز دھار قینچی نکال کر اس کے بال اڑا دیے بے شرم عورت' جب تک یہ اور اس جیسی دوسری عورتیں ان کے بیٹے دوسری بیٹیوں سے اُن کی عزت سے کھیلتے رہیں گے معاشرہ اسی طرح روبہ زوال رہے گا بلکہ آنے والا ہر دن بد سے بدتر ہوگا۔ عورت ہی نے معاشرے کو ڈاکو دیے اسی نے ولی اللہ' خواتین خود فیصلہ کریں کہ کیا کہلانا پسند کریں گی۔

☆☆......☆☆

بلی کے سیاہ بچے

کچھ تمہاری نگاہ کافر تھی
کچھ مجھے بھی خراب ہونا تھا

اس بچی پر بھی سفلی عمل کروا دیا گیا تھا مگر شیطان صفت اور ملعون لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ بچانے والا سب سے بڑا ہے......

صدف حبیب

کافی دن سے میں پارلر جانے کا سوچ رہی تھی مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا مگر اب خاندان میں شادی آ رہی تھی تو لازمی جانا ہی تھا' گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر میں نے سوچا اپنی بیٹی

کے ساتھ چلی جاؤں گی۔

میری شادی کو دس برس بیت چکے ہیں میری بیٹی سات سال کی ہے اور بیٹا پانچ سال کا' الحمدللہ میں ایک خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں میرے شوہر بھی بہت خیال رکھنے والے ایک نیک انسان ہیں۔

کہانیاں پڑھنے کا شوق تو مجھے بچپن سے ہی ہے جب ہم چھوٹے تھے تو ہمارے گھر ہر ماہ بچوں کا ماہنامہ رسالہ نونہال آتا تھا ہم دو ہی بہن بھائی ہیں بھائی مجھ سے بڑے ہیں ہم دونوں ہی اُس رسالے کے پیچھے پڑے تھے کہ پہلے میں پڑھوں پہلے میں پڑھوں' پھر امی کی بہت ڈانٹ بھی پڑتی تھی لیکن جیت ہمیشہ بھائی کی ہی ہوتی کیونکہ میں شروع سے ہی صلح جو طبیعت کی مالک ہوں جلدی مان جاتی ہوں۔

وقت گزرتا گیا ہم بڑے ہوئے مگر میرا کہانیاں پڑھنے کا شوق بدستور قائم تھا۔ کافی چھوٹی عمر میں ہی بھائی کی شادی ہو گئی تھی' بھابی کے گھر آنے سے ہمارے گھر میں رونق بڑھ گئی تھی کیونکہ میں اکلوتی تھی اور بھابی کے آنے سے بہن کی کمی پوری ہو گئی تھی۔ بھابی بھی میری ہی ہم عمر تھی' اُن کو بھی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا وہ مجھے بہت سی کہانیاں سناتی تھیں اور میں بہت انہماک سے سنتی بھی تھی۔ میری شادی کے بعد بھابی نے لکھنا بھی شروع کیا اور آج ماشاءاللہ وہ ماہنامہ سچی کہانیوں میں پچھلے دس سال سے لکھ رہی ہیں۔

مجھے بھی لکھنے کا شوق اپنی بھابی کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا' کہتے ہیں ہر چہرے کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے مگر ہر چہرہ انسان نہیں پڑھ سکتا۔ مجھے جب سے لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے تو میری نگاہیں بھی اِسی کوشش میں ہوتی ہیں کہ کوئی چہرہ ایسا مجھے ملے جس کی آپ بیتی میں لفظوں میں تحریر کر سکوں۔

اُس روز میں پارلر جانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھی کہ بیٹا بھی ضد کرنے لگا بڑی مشکل سے اُسے شوہر کے پاس چھوڑا اور بیٹی کو لے کر گئی سوچ کے گئی تھی کہ جلدی فارغ ہو جاؤں گی مگر وہاں تو بہت رش تھا مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق بیٹھنا پڑا۔ وہ پارلر ہمارے گھر کے قریب ہی ہے' اچھی لڑکی ہے جو پارلر چلا رہی ہے۔ اُس نے گھر میں ہی ایک کمرہ ریزرو کیا ہوا ہے اس کام کے لیے' اس لیے وہاں بیٹھ کر گھر جیسا ہی ماحول لگتا ہے۔

وہاں دو دلہنیں تیار ہونے آئی ہوئی تھیں جس میں سے ایک دلہن کو دیکھ کر میں ٹھٹک سی گئی' پتہ نہیں کیوں مجھے اُس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف محسوس ہوا اور بہت ویرانی بھی دکھائی دی حالانکہ وہ انتہائی خوبصورت تھی' مگر اُس کی آنکھیں مجھے کچھ عجیب سی لگیں' میں خود شادی شدہ ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ دن ہر لڑکی کے لیے اہم ہوتا ہے اور وہ ڈر اور خوشی دونوں کی کیفیت سے گزر رہی ہوتی ہے۔ جہاں اُسے ماں باپ سے جدائی کا دکھ ہوتا ہے وہاں نئے لوگوں سے جڑنے کا ڈر اور خوشی ہوتی ہے' مگر اُس لڑکی کی آنکھوں میں' میں نے صرف ویرانی' ڈر' خوف اور دہشت دیکھی اور تب تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس کے ساتھ آئی محترمہ نے دلہن کا جوڑا سفید رنگ کا نکالا' میں ششدر رہ گئی کیونکہ بھلے آج کل فیشن میں سرخ رنگ کے علاوہ لوگ کئی طرح کے رنگ بنا رہے ہیں مگر سفید کے ساتھ کچھ تو کنٹراسٹ ہوتا ہے مگر اُس لڑکی کا جوڑا مکمل سفید رنگ کا تھا۔

لڑکی کے ساتھ آنے والی خاتون جب جوڑا

Pakistanipoint Waqar Azeem

نکال کر میرے برابر میں آ کے بیٹھیں تو طبیعت سے مجبور مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''سنیے اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گی؟''

وہ خاتون بہت باوقار سی لگ رہی تھیں' میرے پوچھنے پر چونک گئیں اور مجھے حیرت سے دیکھ کر کہنے لگیں۔

''پوچھیے۔'' میں نے کہا۔

''آپ لوگوں کے ہاں کیا نکاح میں سفید رنگ کا جوڑا پہناتے ہیں؟''

اس سوال کا پوچھنا تھا کہ اُن کے چہرے پر سے کئی رنگ آ کر گزر گئے اور وہ بہت بے چین نظر آنے لگیں میں ایکدم شرمندہ ہوگئی میں نے فوراً معذرت طلب کی لیکن انہوں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کہنے لگیں۔

''نہیں کوئی بات نہیں آپ کا پوچھنا ایک فطری عمل ہے اکثر لوگ برا سمجھتے ہیں نکاح کے وقت سفید جوڑا پہنانا' مگر شاید آپ کو معلوم نہیں حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے نکاح کے وقت سفید رنگ کا لباس ہی زیب تن کیا تھا۔''

یہ سنتے ہی میں شرمندہ ہوگئی اور فوراً معذرت کی وہ میری شرمندگی بھانپ گئی تھیں' اس لیے بولیں۔

''میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا دراصل یہ بچی جس کا آج نکاح ہے میری اکلوتی بیٹی ہے' اور رنگوں کی دیوانی بھی مگر اس کی زندگی سے رنگ جیسے اڑ سے گئے ہیں۔'' اُن کے یہ کہنے پر میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا جس پر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔

''آج تو میں جلدی میں ہوں ورنہ آپ کو ضرور تفصیل بتاتی۔'' مگر مجھ سے رہا نہ گیا میں نے اُن سے کہا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں اور میں آپ کی بچی کے بارے میں ضرور تفصیل جاننا چاہوں گی اس پر اُن خاتون نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''کوئی خاص وجہ یا آپ کو ایسے ہی ہمدردی محسوس ہو رہی ہے۔'' انہوں نے عجیب سی دکھی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''نہیں ایسی بات بالکل نہیں ہے آپ مجھے غلط مت سمجھیے گا۔'' میں نے معذرت خواہ لہجے میں کہا۔

''دراصل میں ایک رائٹر ہوں اور انسانی جذبوں کو لفظوں میں تحریر کرنا ہی میرا کام ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ضرور آپ کی بچی کی زندگی کے بارے میں جاننا چاہوں گی مگر اس معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے اگر آپ کو مناسب لگے تو ہی مجھے بتایئے گا۔'' ایک لمحے کو انہوں نے کچھ سوچا اور پھر غور سے مجھے دیکھا اور کہنے لگیں۔

''آپ کی باتوں میں مجھے اپنائیت محسوس ہو رہی ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو بتا کے شاید میرے دل کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنا نمبر دیا اور میرا نمبر بھی لیا اور کہا۔

''میں خود فون کروں گی آپ کو میں یہاں قریب ہی رہتی ہوں' آپ آ جایئے گا میں۔''

اُن کی بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب تک اُن کی بچی مکمل تیار ہو چکی تھی اور بلا کی حسین لگ رہی تھی مگر اتنے میک اپ اور تیاری کے باوجود اُس کی آنکھوں کی ویرانی ویسی ہی تھی تھوڑی دیر میں وہ دونوں چلی گئیں اور میں بھی اپنی سردا

مکمل کروا کے اپنی بیٹی کے ہمراہ گھر واپس آ گئی۔

گھر واپس آ کر بھی میرا دل کام میں نہیں لگا بار بار اُس لڑکی کی شکل ہی دماغ میں گھومتی رہی اور میں غائب دماغی سے اپنے کام میں مصروف رہی' اس بات کو میرے شوہر نے فوراً محسوس بھی کیا اور پوچھنے لگے۔

''کیا بات ہے بھئی آج سناٹا کیوں چھایا ہوا ہے' اتنی خاموش کیوں ہو اور کچھ پریشان بھی لگ رہی ہو۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو ایسا کیوں لگا۔'' میں نے اُن سے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

''محترمہ میں نے تین آوازیں دیں آپ کو مگر آپ کا دھیان کہیں اور تھا۔'' میں ایکدم شرمندہ ہوگئی۔ پھر میں نے انہیں پارلر میں ملنے والی عورت اور اُس کی بیٹی کے بارے میں بتایا مگر انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور مجھے بھی اُلٹا منع کیا کہ میں ہر کسی سے اتنی پرسنل نہیں ہو جایا کروں اور مجھے سختی سے منع کیا کہ اگر اُس عورت کا فون آئے تو جانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل ویسے ہی حالات خراب ہیں کسی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے ہر کسی پر اعتبار نہیں کرلیا کرو میں نے کہا۔

''وہ خاتون بہت مہذب لگ رہی تھیں۔'' مگر انہوں نے میری بات کاٹ دی اور کہا۔

''یار تم بحث مت کرو دیکھو لکھتا تمہارا شوق ہے مگر اس کو شوق ہی رکھو اتنی جذباتی مت ہو جایا کرو کہ کوئی نقصان پہنچنے میں خاموش ہوگئی' بحث کرنا فضول تھا وہ میری بات سمجھ نہیں رہے تھے یا شاید حالات کی وجہ سے وہ اپنی جگہ درست تھے البتہ میں نے مزید کوئی بحث نہیں کی۔

بات یہ نہیں تھی کہ میں صرف لکھاری ہوں اور

ادراک

حقیقتوں میں تتلیاں، رقص کرتی ہیں
سوچوں میں، خاموشیاں شور کرتی ہیں
عجب سانحہ ہے.....
صحرا آنکھوں سے آنسو نہیں رُکتے
ادراک میں میری محبت، محبت نہیں رہتی
تم خود ہی بتاؤ!!
میں مسکراؤں تو کیسے؟

شاعرہ: عائشہ نور خٹک۔ گجرات

اس حیثیت سے اُس کے حالات جاننا چاہ رہی تھی بلکہ الحمدللہ میں ایک دردمند دل بھی رکھتی ہوں اور مجھ سے کسی کی بھی تکلیف نہیں دیکھی جاتی میں جانتی تھی کہ اُن کے حالات سننے کے بعد اگر میں کچھ نہ بھی کر سکی تو کم از کم اُن کی ہمدرد بن کر اُن کا کچھ درد تو کم کر سکوں گی مگر میرے شوہر شاید میری بات سمجھ نہیں پا رہے تھے یا ہوسکتا ہے وہ اپنی جگہ ٹھیک ہوں۔ میں بھی کافی دن ذہنی کشمکش کا شکار رہی اور وہ لڑکی میرے حواسوں پر سوار رہی پھر آہستہ آہستہ وہ میرے ذہن سے محو ہوگئی۔

اُس دن میں گھر میں بیٹری کاٹ رہی تھی کہ اچانک فون کی بیل بجی میں سمجھی شاید میری والدہ کا فون ہے کیونکہ میری والدہ مجھے دن بھر میں اکثر فون کرتی رہتی ہیں کیونکہ میں اُن کی اکلوتی بیٹی ہوں اور لاڈلی بھی' خیر میں ذکر کر رہی تھی کہ فون کی بیل بجی میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے انجان آواز سن کر ایکدم چونکی پھر سلام کر کے پوچھا کہ آپ کون بات کر رہی ہیں۔ انہوں نے جب میرا نام لیا کہ مجھ سے ہی بات کرنی ہے تو

میں حیران ہوئی میں نے کہا۔

''محترمہ معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' اس پر انہوں نے پارلر کا حوالہ دیا اور مجھے یاد دلایا میں ایکدم چونک گئی اور یاد آیا واقعی یہ خاتون میرے دماغ سے نکل ہی گئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ملنا تو میں بھی چاہ رہی تھی مگر پھر شوہر کے الفاظ یاد آئے کہ ہر کسی پر بھروسہ نہیں کرو مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ میں نے اُن خاتون کو اگلے دن آنے کا کہا انہوں نے مجھے ایڈریس سمجھایا اور فون رکھ دیا۔

سارا دن میرا پریشانی میں ہی گزرا کہ جاؤں یا نہ جاؤں پھر میں نے سوچا کہ پارلر ہی چلی جاتی ہوں وہاں اُن کو بلالوں گی اس طرح کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوگا یہ سوچ کر تھوڑا ڈر کم ہوا مگر ذہن ابھی بھی کشمکش میں ہی مبتلا تھا۔

اگلے دن صبح گھر کے کام کاج سے فارغ ہوکر بیٹھی ہی تھی کہ سوچا اُن خاتون کو فون کر کے پارلر آنے کا کہہ دوں یہ سوچ کر میں نے انہیں فون کیا اور کہا۔

''آج مجھے پارلر آنا ہے اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو وہیں آ جائیں ہم وہیں بات کرلیں گے۔'' وہ مان گئیں اور میں مطمئن ہوکر اپنے کام میں لگ گئی کہ شام کو بچوں کو ٹیوشن بھیج کر پارلر چلی جاؤں گی۔ شام میں بچوں کو بھیج کر میں ساس کو بتا کے پارلر آ گئی وہاں وہ خاتون پہلے سے تھیں اور انعم (جس کا پارلر ہے) اُس سے باتوں میں معروف تھیں۔ انعم بھی ایک ہمدرد لڑکی ہے اور وہ شاید پہلے سے ان خاتون کے حالات سے واقف تھی اس لیے مطمئن انداز میں اُن سے گفتگو میں معروف تھی، مجھے دیکھ کر دونوں مسکرائیں انعم کو پہلے ہی میں نے بتا دیا تھا میسج کر کے کہ میں اُن خاتون سے ملنے تمہارے گھر آؤں گی تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں جس پر اُس نے خوشدلی سے آنے کی اجازت دی جب ہی میں مطمئن ہوکر آ گئی تھی مجھے دیکھ کر انعم چائے بنانے چلی گئی تھی اور وہ خاتون اور میں کمرے میں رہ گئے۔

تھوڑی دیر گزرنے کے بعد وہ خاتون بولیں۔

''میرا نام حاجرہ بیگم ہے اور میری بیٹی کا نام مہوش ہے وہ میری اکلوتی بیٹی ہے میرے شوہر ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم ہیں، مگر آج کل کافی بیمار ہیں لہٰذا میں سلائی وغیرہ کر کے اپنا گزر بسر کر لیتی ہوں اللہ کا شکر ہے کہ اچھے دن بھی بہت دیکھے اور اپنا ذاتی گھر ہے اِس لیے الحمدللہ اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔''

''آپ سوچ رہی ہوں گی کہ میں نے خود آپ کو فون کر کے بلایا ایسی کیا خاص بات ہے میں چاہتی تو نہیں بھی بتاتی اپنی پریشانی کے متعلق مگر آپ سے بات کر کے اُس دن مجھے اندازہ ہوا کہ آپ ایک لکھاری ہیں اور آپ کی مدد سے میں لوگوں کو بتا سکتی ہوں کہ آج کل مکر و فریب اور دھوکہ بازی کے کیسے کیسے جال لوگوں نے دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے بچھا رکھے ہیں۔''

وہ خاتون کافی دکھ سے بولیں۔

''مہوش کی نسبت بچپن سے ہی اپنی خالہ کے بیٹے سے طے تھی۔ میرا بھانجا بھی انتہائی شریف لڑکا ہے اور پی آئی اے میں ملازمت کرتا ہے، جب مہوش انٹر کے امتحانات سے فارغ ہوئی تو میری بہن نے شادی کے لیے زور ڈالنا شروع کیا۔ مہوش انتہائی خوبصورت تو تھی ہی ساتھ ہی سلیقہ مند بھی بہت تھی اور میرے بہن بہنوئی تو دیوانے تھے اس کے وہ بچپن سے ہی سب کی

لاڈلی رہی جب میری بہن ہمارے گھر باقاعدہ رشتہ لے کر آنے ہی والی تھی اُس ہی دوران میری نند گھر رہنے آ گئیں سیالکوٹ سے، میری دو نندیں ہیں ایک تو کراچی میں ہی ہیں اُن کی کوئی اولاد نہیں ہے اور دوسری نند جو سیالکوٹ سے آئی تھیں اُن کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ جس میں سے وہ ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی شادی کر چکی تھیں اور اب اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ ہمارے گھر رہنے آئی تھیں اُن کے گھر آتے ہی گھر میں عجیب سی فضا قائم ہوگئی تھی دراصل وجہ اُن کا بیٹا تھا جو کہ ہر وقت مہوش کو تکتا رہتا تھا۔ میں نے اپنی بیٹی کی پرورش بہت احتیاط سے کی ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ آج کل کے حالات کیسے ہیں مگر میری نند کے بیٹے ارشد کے آنے سے گھر کا ماحول گھٹن زدہ ہوگیا تھا میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اتنے عرصے بعد آئی تھیں اور ظاہر ہے اُن کے بھائی کا گھر تھا۔ اُن کو ہمارے گھر آ کر تقریباً آٹھ دن ہو چکے تھے اُس دن عصر کی نماز پڑھ کر سب چائے پی رہے تھے اور ارشد باہر گیا ہوا تھا تو ہماری نند میرے شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

''اصغر بھائی آج تم سے کچھ مانگنے کا ارادہ کیا ہے۔ بھئی بہن کو خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔'' میرے کان ایک دم کھڑے ہو گئے کیونکہ اُن کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ کیا مانگنے والی ہیں۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے مہوش کو اندر جانے کا کہا۔ میری نند کی بات سن کر میرے شوہر مسکرا کے بولے۔

''کہو بھئی اِس سے پہلے کبھی منع کیا ہے جو ایسے کہہ رہی ہو۔''

''مجھے اپنے ارشد کے لیے مہوش کا ہاتھ چاہیے' اصغر بھائی بڑی امید سے بول رہی ہوں ارشد تو گھر کا بچہ ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔'' اُن کے کہنے کی دیر تھی مجھے اتنا شدید غصہ آیا کیونکہ بشریٰ آپا (میری نند) جانتی تھیں کہ مہوش میرے بھانجے سے منسوب ہے خیر وہ تو میرے شوہر نے فوراً ہی منع کرتے ہوئے کہا۔

''بشریٰ تم جانتی ہو مہوش اپنی خالہ کے بیٹے سے منسوب ہے اب تو ہم باقاعدہ رسم بھی کرنے والے ہیں۔'' یہ سنتے ہی میری نند کی شکل دیکھنے والی ہوگئی اور وہ ایکدم غصے میں آ گئیں۔

''بھائی تم نے مجھے غیر سمجھا اب میں اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گی۔'' میرے شوہر نے لاکھ سمجھایا پر وہ اُس وقت نہیں مانیں۔ لیکن پھر اچانک رات میں خود ہی ٹھیک ہوگئیں اور اپنے بھائی سے اور مجھ سے معافی مانگی۔ جس پر مجھے کافی حیرت بھی ہوئی مگر میں سمجھی کہ شاید واقعی انہیں احساس ہوگیا ہے۔ اگلے دن صبح وہ ارشد کے ساتھ باہر جانے لگیں تو میں نے پوچھا۔

''آپا کہاں جا رہی ہیں کیونکہ میری جو نند کراچی میں رہائش پذیر ہیں اُن سے بھی اُن کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔'' اس لیے میں تھوڑا حیران ہوئی میرے اس طرح سوال کرنے پر پہلے وہ تھوڑا اگڑ بڑائیں پھر کہنے لگیں۔

''دراصل میں ارشد کے ساتھ بازار جا رہی ہوں جلدی آ جاؤں گی۔'' میں خاموش ہوگئی میں نے سوچا شاید کچھ خریداری کرنی ہوگی ورنہ تو وہ عموماً تحائف ہی لے کر جاتی ہیں کچھ خریدتی تو کبھی نہیں پھر بھی میں نے اتنی توجہ نہیں دی۔ شام کے سات بجے تو اور پریشانی ہوئی کہ آپا اور ارشد کا کچھ پتہ نہیں تھا میرے شوہر بھی پریشان ہو رہے تھے ابھی ہم اُن کا تذکرہ ہی کر رہے تھے کہ اچانک دونوں آ گئے مگر جیسے ہی انہوں نے گھر میں قدم رکھا میں چونک گئی کیونکہ سارا دن کی

خریداری کے بعد جو اُن کے تھیلے سے نکلا وہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوئے وہ تھیلے میں بلی کے کالے بچے لائی تھیں میں نے کہا۔

''آپا یہ کیا ہے۔'' کہنے لگیں۔

''ارے کیا بتاؤں تمہارے کراچی میں لٹیرے بہت ہیں ہر چیز اتنی مہنگی ہے یہاں' مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آیا واپس آرہے تھے تو بیچارے بلی کے بچے بھوکے نظر آئے تو انہیں اٹھالائی۔ مہوش او مہوش ذرا ان کے لیے دودھ لاؤ بیٹا۔'' مہوش بھی ایکدم بھاگ کے آئی مگر جیسے ہی مہوش نے بلی کے بچوں کو دیکھا وہ چکرا کر گر گئی میں ایکدم پریشان ہوگئی۔

کیا ہوا ہے مگر آپا بالکل نارمل کھڑی رہیں جیسے مہوش کے گرنے کا انہیں یقین ہو' میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کروں میں نے پانی ڈالا مگر اُس کے باوجود مہوش کو ہوش نہیں آیا جو سورتیں یاد تھیں وہ سب پڑھ کر پھونکیں آہستہ آہستہ مہوش نے آنکھیں کھولیں میں نے پوچھا۔

''کیا ہوا بیٹا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

مگر وہ خاموش رہی اُس کی آنکھیں عجیب سی وحشت زدہ ہورہی تھیں۔ میں نے اور اس کے ابو نے اسے سہارا دے کر کمرے میں لٹایا۔ مہوش کو لٹا کر جب میں کمرے سے باہر آئی تو ارشد اور آپا کو کسی بات پر ہنستے ہوئے دیکھا مجھے بہت غصہ آیا ایک تو بچی کو پوچھا بھی نہیں اور اب یہاں بیٹھ کر ہنسی مذاق کررہے ہیں مگر میں خاموش رہی' رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر میں کمرے میں جانے لگی تو سوچا پہلے مہوش کو دیکھ لوں مگر میں جیسے ہی اُس کے کمرے میں داخل ہوئی میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی وہ بلی کے چاروں بچے مہوش کے سرہانے بیٹھے تھے اور مہوش ٹکٹکی باندھے چھت کو گھور رہی تھی' میں نے جلدی سے بلی کے بچوں کو بھگایا اور مہوش کو آواز دی۔

''کیا ہوا مہوش تم سوئی نہیں اور یہ بلی کے بچے تمہارے پاس بیٹھے تھے تمہیں پتہ نہیں چلا۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ مگر وہ بدستور خاموش رہی، میں نے اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کا سر سہلانا شروع کیا تھوڑی دیر بعد اُس کی آنکھ لگ گئی تو میں اپنے کمرے میں آگئی اور آتے ہی اپنے شوہر سے کہا۔

''اصغر آپ خدا کے لیے ان بلی کے بچوں کو باہر چھوڑ کے آجائیں جب سے یہ آئے ہیں مہوش کی طبیعت خراب ہے۔ میرے دل میں وہم آرہے ہیں' ارے بیگم وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''اور یہ بلی کے بچے بے ضرر ہیں ابھی تو آئے ہیں اور تمہیں خوف بھی محسوس ہونے لگا۔''

اُس وقت تو میں خاموش ہوگئی کہ ہوسکتا ہے شاید یہ واقعی میرا وہم ہو اور ایسا کچھ بھی نہ ہو مگر دل اندیشوں میں گھرا ہوا تھا یہی سب سوچتے ہوئے نجانے کب میری آنکھ لگی' صبح حسب معمول میں فجر کے وقت اٹھی تو دیکھا آپا اور ارشد کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی میں نے سوچا جا کر دیکھتی ہوں کیونکہ آپا کو تو میں نے آج تک کوئی نماز پڑھتے نہیں دیکھا اس لیے اتنی صبح اُن کے کمرے کی لائٹ جلی دیکھی تو حیرت ہوئی میں اُن کے کمرے کے پاس پہنچی ہی تھی کہ دیکھا ارشد ایک بوتل میں پانی بھر رہا ہے اور آپا کچھ پڑھنے میں مصروف ہیں مگر اُن کے سر پر دوپٹہ بھی نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایسا کیا پڑھ رہی ہیں کہ دوپٹہ

بھی نہیں اوڑھا میں خاموشی سے دیکھتی رہی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے تھوڑی دیر بعد جس بوتل میں ارشد نے پانی بھرا تھا وہ آپا کو دی اور آپ نے وہ پانی دیواروں پر چھڑکنا شروع کردیا یہ دیکھ کر میرا تو دماغ ہی گھوم گیا اور میں فوراً اُن کے کمرے میں گئی۔

''یہ کیا کررہی ہیں آپا۔'' میں نے زوردار آواز میں پوچھا تو مجھے دیکھ کر ارشد اور آپا گڑبڑا گئے آپا فوراً بولیں۔

''ارے کچھ نہیں ہاجرہ خیر و برکت کے لیے دیواروں پر قل شریف کا پانی چھڑک رہی تھی۔''

''یہ کون سے قل شریف پڑھے ہیں آپا کہ سر تک نہیں ڈھانپا آپ نے آخر آپ کے دماغ میں چل کیا رہا ہے۔'' میں نے غصے سے پوچھا۔ بس میرے پوچھنے کی دیر تھی وہ تو ایسے بپھر گئیں جیسے میں نے نجانے کیا پوچھ لیا ہو۔

''ہاجرہ تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو اب میں اس گھر میں ایک پل بھی نہیں رکوں گی۔'' وہ زور زور سے سینہ کوبی کرنے لگیں اتنا شور شرابہ سن کر مہوش کے ابو اور مہوش دونوں اُٹھ کر باہر آگئے پوچھنے لگے۔

''آخر کیا ہوا ہے بھئی ہاجرہ۔'' اصغر نے مجھ سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی آپا شروع ہوگئیں۔

''ارے بھائی اپنی بیگم سے کیا پوچھ رہے ہو' مجھ سے پوچھو اب یہی کسر رہ گئی تھی کہ تمہارے گھر سے رسوا ہو کر نکلوں تمہاری بیگم نے تو آج مجھے میری صحیح جگہ دکھا دی اللہ کسی بہن کو ایسا دن نہ دکھائے' وہ بلا وجہ بات کو بڑھا رہی تھیں اور میں حیران تھی کہ کس طرح انہوں نے اپنی غلطی کو چھپا کر مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا دیا ہے۔

اُن کا یہ ڈرامہ تھوڑی دیر ہی چلا اُس کے بعد جیسے ہی صبح کا اجالا ہوا وہ جانے کے لیے تیار ہوگئیں مہوش کے ابو نے بہت روکا مگر وہ نہیں رکیں اس بات کو لے کر میرے شوہر بھی مجھ سے ناراض ہوئے کہ مجھے اپنی نند کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا مگر میں کیا کرتی میرا رد یہ اُن کا عمل دیکھ کر فطری تھا۔ اگلے دو دن تک مہوش کے ابو کا موڈ خراب ہی رہا پھر خود ہی ٹھیک ہوگئے آپا کو گئے ہوئے تیسرا روز تھا میں عصر کی نماز پڑھ کر تسبیح پڑھنے میں مشغول تھی کہ اچانک مہوش کے کمرے سے چیخنے کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں میں ایکدم پریشان ہو کر اُس کے کمرے کی طرف بھاگی دیکھا تو مہوش بے ہوش تھی۔

''کیا ہوا بیٹا آنکھیں کھولو۔'' میں نے پانی اُس کے منہ پر چھڑکا تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آگئی اور ٹکٹکی باندھے چھت کو گھورنے لگی میں اُس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی کیونکہ کچھ دن پہلے جب مہوش بے ہوش ہوئی تھی جب بھی اُس کی یہی حالت ہوئی تھی آج تو میں نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ اصغر گھر آئیں گے تو تفصیل سے بات کروں گی۔ دل میں وہم اور اندیشوں نے جگہ بنالی تھی رات کو مہوش کے ابو آئے میں نے سوچا کھانا کھالیں پھر بات کروں گی مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی مہوش کے کمرے سے دوبارہ چیخنے کی آواز آئی اور جب میں اور اس کے ابو اُس کے کمرے میں گئے تو ہماری آنکھیں پتھرا گئیں کیونکہ مہوش پورے بال کھول کر فرش پر الٹی گری ہوئی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا میں اور اس کے ابو ایکدم گھبرا گئے اور اُس کو فوراً اسپتال لے کر بھاگے' ایمرجنسی میں مہوش کو ایک گھنٹہ رکھا گیا پھر ڈاکٹرز نے چھٹی دے دی اور ہم

اُسے گھر لے آئے نیند کے انجکشن کے زیر اثر وہ جلد ہی سوگئی۔ اگلی صبح مہوش کافی دیر تک سوتی رہی میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا' ڈاکٹرز سے میں نے اور اس کے والد نے بہت پوچھا کہ آخر ہماری بچی کو کیا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا۔

''بچی کی رپورٹس بالکل نارمل ہیں ہوسکتا ہے بے ہوشی کمزوری کی وجہ سے ہو آپ غذا پر توجہ دیں۔'' میں سبزی کاٹ رہی تھی کہ سبزیوں کا سوپ بنا کر دوں گی مہوش کو اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی دیکھا تو ایک عورت کھڑی تھی اور بے حد بدحال حلیے میں تھی میں سمجھی کہ شاید کوئی فقیرنی ہے۔ میں نے کہا۔

''رکو اماں لاتی ہوں پیسے۔'' اس پر وہ غصے سے بولی۔

''میں پیسے مانگنے والی نہیں ہوں بس بھوکی ہوں اگر کچھ ہے کھانے کو تو دے پیسے نہیں چاہیے۔'' میں شرمندہ ہوگئی میں نے کہا۔

''معاف کرو اماں تم یہاں بیٹھو میں کھانا لاتی ہوں۔'' میرے گھر کے باہر چبوترا بنا ہوا ہے میں نے اس عورت کو وہاں بٹھادیا اور کھانا لینے چلی گئی' اتنی دیر میں وہ بلی کے بچے جو میری مندے کرآئی تھیں باہر چبوترے کی طرف جانے لگے۔ میں نے انہیں ہٹایا مگر وہ پھر بھی چلے گئے جیسے ہی میں کھانا لے کر چبوترے پر گئی وہ عورت بلی کے بچے دیکھ کر ایکدم چیخنے لگی۔

''ہٹاؤ انہیں یہاں سے۔'' میں ایکدم پریشان ہوگئی میں نے کہا۔

''اماں یہ بلی کے بچے آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔'' مگر وہ نہیں مانیں اور بولنے لگی۔

''یہ نہیں یہ بلی کے عام بچے نہیں ہیں ان پر گندا علم ہوا ہے یہ تجھے بھی گندا کردیں گے ہٹاان کو ہٹاان کو۔'' وہ چیخنے لگی اُن کے شور کرنے پر گلی کی کچھ عورتیں بھی جمع ہوگئیں۔ سارا ماجرہ سن کر ایک عورت کہنے لگی۔

''بہن جب یہ اماں اتنا کہہ رہی ہیں تو ہٹادو ان بلی کے بچوں کو۔'' میں نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اثبات میں سر ہلادیا وہاں سے جمعدار گزر رہا تھا میں نے اُسے کہا۔

''ذرا ان بلی کے بچوں کو گھر سے دور چھوڑ دینا وہ نے گیا' تھوڑی دیر بعد وہ عورت بھی کھانا کھا کر جانے لگی تو میں نے اُسے روکا میں نے کہا۔

''اماں آپ کو کیسے پتہ کہ ان بلی کے بچوں پر گندا علم ہوا ہے۔'' وہ عورت عجیب سے انداز میں ہنسی اور بولی۔

''ہم کسی کا احسان نہیں رکھتے تو نے مجھے روٹی کھلائی تو میں نے بھی تجھے اصلیت سے آگاہ کردیا اب آگے تیرا کام ہے اپنی بچی کو بچادو نہ وہ سفید لٹھے میں ملے گی۔'' یہ کہہ کر تو میرے پیروں تلے زمین نکل گئی آنکھوں کے آگے ایکدم اندھیرا سا آگیا تھوڑا سا سنبھلی تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا وہ عورت پتہ نہیں کہاں غائب ہوگئی تھی میں نے آگے گلی میں جا کر اُسے بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی جیسے تیسے میں اپنے گھر آئی اور بھاگ کر مہوش کے کمرے میں گئی اور جو دیکھا تو میرے جسم کی آدھی جان نکل گئی جن بلی کے بچوں کو میں نے جمعدار سے چھڑوایا تھا وہ چاروں مہوش کے گرد بیٹھے اُسے تک رہے تھے یہ منظر دیکھ کر میں بے ہوش ہوگئی جب ہوش آیا تو مہوش کے ابو کو اپنے سرہانے بیٹھا پایا میں نے فوراً مہوش کا پوچھا اور دیوانوں کی طرح بھاگ کر اُس کے کمرے میں گئی

دیکھا تو وہ ٹکٹکی باندھے چھت کو گھور رہی تھی اُس کی یہ حالت دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی میرے شوہر بھی آگئے وہ بھی بے حد پریشان لگ رہے تھے کیا ہوا ہے جاجرہ کچھ بتاؤ تو سہی تم لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل ڈوبا جارہا ہے۔ وہ ایکدم بیٹھ گئے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اُس عورت کے آنے سے لے کر بلی کے بچوں کو چھڑوانے تک پوری تفصیل سنائی اور پھر یہ بھی بتایا کہ کس طرح میں بلی کے بچوں کو واپس دیکھ کر بے ہوش ہوئی یہ سب سن کر وہ بھی بے چین نظر آنے لگے۔

''کچھ سمجھ نہیں آرہا جاجرہ میں کیا کروں میں تو کسی ایسے شخص کو جانتا بھی نہیں جسے ان سب چیزوں کا علم ہو ایسا کرتا ہوں صبح امام صاحب سے ملاقات کرکے انہیں تفصیل بتاتا ہوں۔'' اُن کی بات سن کر مجھے بھی تھوڑی تسلی ہوئی اور میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ صبح جب فجر کی نماز پڑھنے شوہر مسجد گئے تو میں بھی مصلیٰ بچھا کر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوگئی اور رو رو کر دعائیں مانگنے لگی۔

''میرے مالک ہم نے بھی کسی کا برا نہ چاہا تو سب حال جانتا ہے اپنا رحم کر میرے مولا میری بچی کو نظر بد اور ہر بری بلا سے محفوظ رکھ آمین۔'' دعا مانگ کر مجھے بہت سکون ملا اب بے چینی سے میں اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگی کہ دیکھوں مولوی صاحب نے کیا کہا' تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی میں نے جاکر دیکھا تو شوہر امام صاحب کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ امام صاحب نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا فوراً پیچھے پلٹے اور کچھ دیر باہر کھڑے ہوکر قرآنی آیات کا ورد کرتے رہے اور دوبارہ اندر داخل ہوئے میرے شوہر نے انہیں پوری تفصیل بتادی تھی' امام صاحب

ذہانت

ٹیچر: ''اگر تمہاری شادی جڑواں بہنوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہوجائے۔ تو تم اپنی بیوی کو کیسے پہچانو گے؟''

ذہین اسٹوڈنٹ: ''میں پاگل ہوں جو پہچانوں گا۔''

اقبال حسین۔ کراچی

مہوش سے ملنا چاہ رہے تھے میرے شوہر نے مجھے اشارہ کیا میں مہوش کے کمرے میں گئی اور اُس کو اٹھا کر بٹھایا کہ امام صاحب کو بلالوں گی' میں نے کہا۔

''اٹھو بیٹا امام صاحب آئے ہیں تم پر دم کریں گے انشاء اللہ ٹھیک ہوجاؤ گی۔'' میرے شوہر امام صاحب کو لے کر مہوش کے کمرے کی طرف آئے مگر امام صاحب نے دروازے پر ہی رک کر اندر آنے سے منع کردیا اور کہا۔

''اصغر بھائی معذرت میں اندر نہیں جاسکتا میرے شوہر نے سوالیہ نظروں سے امام صاحب کو دیکھا تو وہ سمجھ گئے اور کہنے لگے۔

''دراصل اصغر بھائی آپ کے گھر اور بیٹی پر کسی نے سفلی کا عمل کروایا ہے جب میں آپ کے گھر میں داخل ہوا اُسی وقت مجھے اندازہ ہوگیا تھا مگر اس بچی کا چہرہ دیکھ کر میں دور سے ہی سمجھ گیا ہوں مگر میں اندر اس لیے نہیں جاسکتا کہ میں اس کے توڑ سے واقف نہیں ہاں مگر آپ کی مدد ضرور کرسکتا ہوں میں ایک شاہ صاحب کو جانتا ہوں جو اس حوالے سے لوگوں کی فی سبیل اللہ مدد کرتے ہیں میں آپ کو اُن سے ضرور ملوادوں گا مگر دعا کریں کہ وہ راضی ہوجائیں کیونکہ آج کل اُن کی طبیعت ناساز ہے اور وہ کسی سے اِن سلسلوں میں

مل بھی نہیں رہے ہیں مگر میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔'' امام صاحب میرے شوہر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

امام صاحب کے ان لفظوں سے ہم میاں بیوی کو تھوڑی ڈھارس ہوئی مگر میرے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ یہ سب کس نے کروایا ہوگا اور میرا سیدھا شک اپنی نند پر ہی گیا کیونکہ بلی کے بچے وہی ہمارے گھر لائی تھیں اور ہوسکتا ہے کہ ہم نے مہوش کے رشتے کے لیے منع کیا تھا تو انہوں نے وہی دشمنی نکالی ہو مگر کوئی اِس حد تک بھی گر سکتا ہے وہ بھی سگی بہن' کوئی بہن کیسے اپنے بھائی یا اُس کی اولاد کو نقصان پہنچانے کا سوچ سکتی ہے سوچ سوچ کر میری عقل حیران تھی آیا کس حد تک گر گئیں میرے دل سے بہت آہ نکلی مگر میں خاموش رہی اور اپنے شوہر کے سامنے اِس طرح کی کوئی بات نہ کی کہ اُن کا دل خراب ہو۔ مہوش کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی سوکھ کے کانٹا ہوگئی تھی کوئی بات نہیں کرتی تھی صرف چھت کو گھورتی رہتی یا زمین تکتی رہتی اُس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

اُس دن میں عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو دروازے پر دستک ہوئی دیکھا تو شوہر کے ساتھ امام صاحب اور ایک نہایت ہی بزرگ شخصیت کھڑے ہوئے تھے میں نے فوراً سلام عرض کیا اور دروازے کے سائیڈ پر ہوکر انہیں اندر آنے کی دعوت دی انہوں نے باہر کھڑے ہوکر غور سے گھر کے دروازے کا معائنہ کیا اور پھر میرے شوہر سے مخاطب ہوئے۔

''میاں کسی کو بلا کر لایئے اور یہاں کا فرش کھدوایئے۔'' میرے شوہر برابر والوں کے بیٹے کو بلا کر لائے وہ بے چارہ اللہ اُسے اچھا رکھے سب سامان لے کر آیا اور فرش کھودنے لگا۔ ابھی تھوڑا ہی فرش کھدا تھا کہ اچانک بلی کے بچوں کے رونے کی آواز آنے لگی وہ بزرگ آواز سن کر جلال میں آگئے مگر بولے کچھ نہیں۔ دراصل امام صاحب نے اُن کو مکمل تفصیل سے پہلے ہی آگاہ کردیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بلی کے بچے میری آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرگئے میں دم سادھے یہ سب دیکھ رہی تھی اتنی دیر میں کھدائی مکمل ہوئی اور جو وہاں سے نکلا اُسے دیکھ کر میں چکرا کے رہ گئی کالے کپڑے میں ایک دلہن بنی گڑیا اور اُس میں پیوست سوئیاں دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوئے اچانک مجھے اُس دن والی عورت کی بات یاد آگئی کہ اپنی بچی کو بچا ورنہ وہ تجھے سفید لٹھے میں ملے گی۔' شاہ صاحب نے کپڑے اور گڑیا کو ہاتھ لگانے سے منع کیا اور جیب سے ماچس نکال کر کچھ پڑھا اور پھر وہ کپڑا اور گڑیا جلادی جیسے ہی وہ گڑیا جلنا شروع ہوئی گھر کے اندر سے مہوش کے چیخنے کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں میں جیسے ہی اندر کی طرف جانے لگی شاہ صاحب نے مجھے روک دیا اور کہا۔

''خاتون آپ یہیں رہیے اور بچی کے پاس ابھی مت جایئے۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر داخل ہوئے اور جس کمرے میں آپا اور ارشد ٹھہرے تھے وہاں چلے گئے' مہوش کے ابو بھی اُن کے ساتھ گئے شاہ صاحب نے ایک شیشہ منگوایا اور ہم سب کو دور بیٹھنے کا کہا میں اور مہوش کے ابو دور بیٹھ گئے اور امام صاحب بھی ساتھ ہی بیٹھ گئے شاہ صاحب نے کچھ پڑھنا شروع کیا اور تھوڑی دیر گزری تھی اُس شیشے میں ارشد اور آپا کا چہرہ نظر آیا اور فوراً غائب ہوگیا اصغر تو ایکدم گھبرا گئے یہ سب دیکھ کر اور شاہ صاحب کی طرف سوالیہ

نظروں سے دیکھنے لگے۔ شاہ صاحب اُن کی پریشانی سمجھ گئے اور بولے۔

''میاں معذرت کے ساتھ مگر تلخ حقیقت یہی ہے کہ جو چہرے آپ نے شیشے میں دیکھے آپ کی پریشانی اور کالے علم کی وجہ یہی لوگ ہیں اِن ہی لوگوں نے آپ کے گھر اور بیٹی پر یہ جادو کروایا ہے آپ کے گھر کی نازک صورت حال دیکھتے ہوئے مجھے یہ عمل کرنا پڑا ورنہ عموماً میں یہ عمل نہیں کرتا مگر جہاں مجھے لگتا ہے کہ بچاؤ ممکن نہیں وہاں کرنا پڑتا ہے یہ محترمہ اب بھی سکون سے نہیں بیٹھی ہیں ورنہ اِن کا عکس عیاں نہیں ہوتا وار اب اُن کے عمل کی کاٹ ضروری ہے' اگر آپ کاٹ کروانا چاہتے ہیں تو جو ہدایات میں دے رہا ہوں اِس پر فوراً عمل کریں ورنہ اپنی اولاد سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔'' میرے شوہر تو یہ سن سن کر سکتے کی سی کیفیت میں آگئے انہیں بالکل یقین نہیں آرہا تھا کہ اُن کی سگی بہن اُن کا اپنا خون اُن کے ساتھ اتنی گھناؤنی حرکت کرسکتی ہے۔ شاہ صاحب نے تھوڑی دیر کمرے میں قرآنی آیات کی تلاوت کی پھر مجھ سے پانی منگوایا اور کہا کہ اِس کمرے کا غسل کریں میں نے وہ کمرہ پورا دھویا اور وہاں اگربتی جلادی' اتنی دیر میں شاہ صاحب نے مجھے ایک تعویذ بنا کر دیا اور کہا۔

''یہ بچی کے گلے میں ڈال دیں اور تین دن بعد بچی کو لے کر میرے پاس آیئے گا۔'' اُن کی بات سن کر ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میں تعویذ لے کر مہوش کے کمرے میں آگئی جہاں وہ بے سدھ زمین پر پڑی ہوئی تھی اپنی بچی کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھیں برسنے لگیں اور آپا کے لیے دل سے آہ نکلی۔ میں نے مہوش کو اٹھایا اور اُس کے بستر پر لٹا کے تعویذ اُس کے گلے میں

غزل

آرزو دل کی دل میں رہ گئی
کہنی تھی جو بات دل میں رہ گئی

سوچا تھا اُسے دیکھیں گے ہر زاویے سے
آیا وہ سامنے تو حسرت دل میں رہ گئی

سنگ غیر کے رخصت ہوا وہ ہنستے ہوئے
اک چیخ سی ہمارے لبوں پہ جمی رہ گئی

یوں تو سب کچھ حاصل ہے زندگی میں ہمیں
بس اے دوست اک تیری کمی رہ گئی

بھگوتے رہے آنسو دامن ہمارا بخاری
اُسے پالینے کی تمنا ہمارے دل میں رہ گئی

مریم شاہ بخاری' شرقپور شریف

پہنا دیا۔

اگلے تین دن سکون سے گزرے بس مہوش کی خاموشی نہیں ٹوٹی' تین دن بعد ہم مہوش کو لے کر شاہ صاحب کے پاس گئے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا کہ ویسے تو ان تین دنوں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا بس مہوش مستقل خاموش ہے۔''

یہ سب سن کر شاہ صاحب مسکرائے اور بولے۔

''میاں اللہ پاک کا شکر ادا کریں کہ بچی کو نئی زندگی مل گئی ورنہ اگر اس کا تو ژنہیں ہوتا تو ان ہی تین دنوں میں اس کا خاتمہ بھی ہوسکتا تھا۔'' یہ سب سن کر میری تو جان ہی نکل گئی اور میں نے دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ واقعی میرا رب بہت مہربان ہے اور مارنے والے سے زیادہ میرے رب کی شان ہے۔

شاہ صاحب میرے شوہر سے مخاطب ہوئے اور بولے۔

''میاں سب سے پہلے تو آپ اس بچی کا نکاح کر دیجیے اُس سے یہ حصار میں آجائے گی اور دوسرا یہ کہ جب نکاح کریں تو اس بات کا خیال رکھیے گا کہ نکاح کے وقت بچی کو سفید جوڑا پہنایئے گا اور اس کی پہلی اولاد ہونے تک اسے سرخ اور کالے رنگ سے دور رکھیے گا۔ اور رہی بچی کی خاموشی کی بات تو آہستہ آہستہ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گی۔ گندے علم کی وجہ سے اُس کا دماغ تھوڑا سن ہوگیا ہے اللہ پاک اپنا رحم کرے گا۔''

اس سے پہلے کہ میں اُن سے کچھ پوچھتی وہ خود ہی کہنے لگے۔

''جو ہدایات میں نے آپ لوگوں کو بتائی ہیں اُس پر عمل کریں اور کیوں کیسے اِن سوالات سے پرہیز کریں اور جتنا جلدی ہو سکے نکاح سے پہلے ایک کالا بکرا منگوا کر بچی کا صدقہ بھی دیں۔'' شاہ صاحب کی باتیں سن کر ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور اُن کا شکریہ ادا کر کے واپس گھر آگئے۔ گھر آکر میں نے سب سے پہلے اپنی بہن کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا کیونکہ میرے شوہر کا کہنا تھا کہ انہیں سب بتاؤ جھوٹ کی بنیاد پر ہم اپنی بچی کی زندگی کی شروعات نہیں کریں گے اگر انہیں اعتراض نہیں تو بسم اللہ کریں ورنہ اللہ پاک کوئی نہ کوئی وسیلہ پیدا کر ہی دیتا ہے۔ اس لیے میں نے فون کر کے اپنی بہن کو تمام باتوں سے آگاہ کیا وہ مجھ سے بہت ناراض ہوئی کہ میں نے اتنی پریشانی میں ہوتے ہوئے اُس سے تذکرہ کیوں نہ کیا میں نے بڑی مشکل سے اُسے منایا وہ اگلے ہی دن اپنے شوہر اور نوید (اپنے بیٹے) کے ساتھ ہمارے گھر آئی اور ہم نے نکاح کی تاریخ پکی کر دی رخصتی ایک ماہ بعد رکھی گئی تھی۔

الحمدللہ اب میری بچی کی رخصتی بھی ہوگئی ہے اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم ہے وہ خاتون اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مسکرائیں اور اُن کے اندر کی ممتا دیکھ کر مجھے احساس ہوا واقعی اولاد کا دکھ انسان کو اندر سے کتنا توڑ دیتا ہے اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہر ماں کی گود ٹھنڈی رہے اور اللہ پاک ایسے عمل کرنے والوں سے محفوظ رکھے اور انہیں ہدایات دے آمین۔

نجانے لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ مرنے کے بعد اللہ رب العزت کو منہ دکھانا ہے ایسے لوگوں کے لیے تو نبی پاک ﷺ نے اپنی شفاعت سے بھی انکار کیا ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔

☆☆.....☆☆

دو بدروحیں

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

وہ انسان تو نہ تھیں ورنہ رکشہ والا اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی سنسناہٹ محسوس نہ کرتا.....

مور شاہد حسین

اللہ اکبر اللہ اکبر مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز گونج رہی تھی اور میں رکشے کے پاس کھڑا کسی مسافر کے آنے کے انتظار میں تھا میں چاروں طرف اپنی نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ مجھے چند

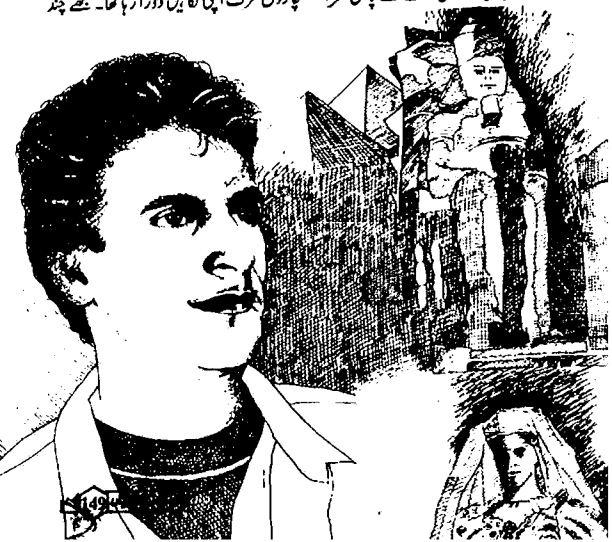

ایک مسافر دکھائی دیے مگر میری طرف آنے سے پہلے ہی اپنی مطلوبہ گلی میں مڑ گئے میں انہیں مایوسی سے دیکھتا ہی رہ گیا لمحے گزرتے رہے تھوڑی ہی دیر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ چوک قریب قریب ویرانی پیش کر رہا تھا اور رات دھیرے دھیرے مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔

وہ سخت سردیوں کا موسم تھا۔ گلیاں سنسان ہو چکی تھی شاید لوگ اپنے گھروں میں لحاف اوڑھے دبکے پڑے تھے۔ دور دور تک خاموشی تھی۔ سناٹا تھا' ویرانی تھی۔ ماحول عجیب پُراسرار لگ رہا تھا اور رات گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔

اس روز معمول سے بھی کم دیہاڑی بن سکی تھی۔ اس لیے میں سواریوں کے انتظار میں پریشان سا کھڑا تھا۔ میں انہی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ قدموں کی آہٹ مجھے خیالات کی دنیا سے کھینچ لائی۔ میں نے چونک کر چاروں طرف نظریں گمائیں تو مجھے دو لڑکیاں آتی دکھائی دیں۔ اُن کی مرکزِ نگاہ میرا ہی رکشہ تھا۔

ایک لڑکی چھوٹی عمر کی تھی جبکہ دوسری کی عمر اندازہ بیس سے بائیس کے درمیان تھی۔ چھوٹی بے پروائی سے چیونگم چباتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور بڑی بس خاموشی سے قدم بڑھا رہی تھی۔ ان کے انداز میں بے پروائی تھی۔ اُن کو دیکھ کر میری روح تک سرشار تھی۔ زندگی حسین سے حسین تر دکھائی دے رہی تھی۔ پھول کھلتے محسوس ہو رہے تھے چاروں طرف خوشبو ہی خوشبو مہک رہی تھی۔ ایک خوشبو کی لہر میری روح میں اترتی چلی گئی۔ عجیب قسم کی ٹھنڈک اور تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ آپ حیران نہ ہوں میں شوخ اور دل پھینک ٹائپ ہوں۔ میری نظریں کسی کی پرواہ کیے بغیر حسین چہروں کے پیچھے پیچھے تعاقب کرتی ہیں۔ اس لیے میں جی ہی جی میں خوش تھا اور جی بھر کے ان پر محبت لٹانا چاہتا تھا۔

دوسرے لمحے میری خوشی حیرانگی میں بدل گئی۔ اس قدر شدید سردی میں کھلے آسمان کے نیچے بغیر کسی گرم کوٹ وغیرہ کے اُن کا چلنا میرے لیے حیرانی کا باعث تھا۔ میں حیران نگاہوں سے اُن کو دیکھتا رہا۔ وہ میرے قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں اور میری حیرت تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

بڑی نوجوان لڑکی کی چمکدار آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی وہ دیکھنے والے کو اسیر کر دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی بس میں اسی لمحے ان آنکھوں کا اسیر ہو گیا اور خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں کھو گیا۔

''بات سنیں' ریلوے اسٹیشن چلیں گے؟'' چھوٹی نے چیونگم سے شغل کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں کہا۔

''جی ضرور مگر تین سو روپے لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے مگر شارٹ کٹ راستے سے چلنا ہو گا تاکہ ریل گاڑی نکل نہ پائے۔'' میں اس کی آواز پر چونک اٹھا۔ یہ آواز ہوبہو چھوٹی کی آواز جیسی تھی میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''جی بہتر۔'' میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا اور پھر وہ رکشے کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ خدا کا نام لے کر میں نے رکشہ اسٹارٹ کیا اور سڑک پر دوڑانے لگا۔

وہ دونوں سائے کی طرح خاموشی اور بے حس و حرکت بیٹھی باہر دور دور تک پھیلے ہوئے گھپ اندھیرے کو تک رہی تھیں باہر اتنی تاریکی تھی کہ رکشے کی ہیڈ لائٹس بھی کمزور پڑ رہی تھی۔ جانے کیوں وہ

خاموشی سے باہر ایک سمت مسلسل گھور رہی تھیں۔ مجھے اندر ہی اندر خوف محسوس ہو رہا تھا اور دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی مجھے اُن کی خاموشی سے ڈر لگ رہا تھا انہوں نے نہ تو اپنی جگہ سے حرکت کی تھی اور نہ ہی زبان سے کوئی لفظ ادا کیا تھا بس وہ دور دور تک پھیلے ہوئے گھپ اندھیرے کو تک رہی تھیں۔

سفر جاری تھا باہر غضب کی سردی تھی اور ہر سو دھند اور ویرانی کا راج تھا۔ دور دور تک جاتی سڑک خالی اور سنسان دکھائی دے رہی تھی گہرا تاریک راستہ مجھے اور بھی گہرا' خاموش اور ویران معلوم ہو رہا تھا۔ خوف کی لذت کو میرا دل پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ایک وحشت ناک سناٹا مجھے اپنے اندر اترتا محسوس ہوا۔ میں دل ہی دل میں خدا سے اپنی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا میں اپنی خیریت کی خیر مناتا ہوا۔ اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر لاکھ کوشش کے باوجود بھی میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وقت تھا کہ گزر ہی نہ رہا تھا اور منزل میلوں دور ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ گھبراہٹ کی وجہ سے میرے لیے رکشہ چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ میرے دل میں عجیب سے خیالات گردش کرنے لگے اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں سخت سردی میں بھی میرے پسینے چھوٹ رہے تھے اور وہ دونوں بے نیازی سے بیٹھی گہرے اندھیرے کو تک رہی تھیں۔ اس وقت غضب کی سردی تھی مگر ان پر سردی کا ذرا بھی اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''آپ کا نام ظہیر ہے نا؟'' چھوٹی کے منہ سے اپنا نام سن کر میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ میرے ہاتھ بری طرح لرز کر رہ گئے' بمشکل میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے رکشے پر قابو پا لیا ورنہ کوئی حادثہ یقینی تھا۔

''آپ...... کو...... میرا نام کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے لرزتے ہوئے ایک ایک لفظ ادا کیا۔

''ہاہاہا...... ہاہاہا......'' اس نے زوردار وحشیانہ قہقہہ لگایا اُس کا قہقہہ سن کر میں بری طرح گھبرا گیا۔ وہ قہقہہ مجھے بے انتہا ڈراؤنا اور پُراسرار محسوس ہوا۔

''آپ ڈر گئے نا؟ یہ رہا آپ کا نام۔'' اس نے شیشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں میرا نام ظہیر لکھا ہوا تھا۔

اس کے بعد اُس کی زبان کو جیسے پر لگ گئے۔ وہ مسلسل باتیں کرنے لگی میرے ساتھ یوں باتیں کر رہی تھی جیسے برسوں سے مجھے جانتی ہو۔ وہ بے انتہا باتونی معلوم ہوئی اور دوسری یوں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے نہ بولنے کی قسم کھائی ہو میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ لڑکی میرا دماغ خراب کیے جا رہی تھی میں چاہنے لگا کہ وہ مزید کچھ نہ بولے اور ہم فوری منزل پر پہنچ جائیں مگر منزل طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھی اور ایک ایک لمحہ صدیوں کے برابر لگ رہا تھا۔

''یہاں روک دو۔'' اچانک بڑی نے سختی سے کہا تو میں سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گیا۔

اس کی آواز بہت بھاری معلوم ہوئی۔ میں اپنے سارے وجود سے لرز کر رہ گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ دور دور تک ویران سڑک کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں کوئی چوراہا تھا نہ ہی قریب کوئی آبادی......

خوفناک تاریکی میں میرا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ دل پوری شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی اور سخت سردی میں بھی پورا بدن پسینے سے شرابور

غزل

کچھ لمحے پاس میرے تم آیا کرو
میرے دل کو ذرا بہلایا کرو

بہت کمزور دل ہے یہ بیمار کا
بیٹھ کر سامنے مسکرایا کرو

ہوتی برداشت فرقت یہ مجھ سے نہیں
ستم اتنا نہ مجھ پے ڈھایا کرو

اتنی اچھی نہیں ہے زخمی دل زہا
حال میرا سنو اور سنایا کرو

قائدے الفت کے بھی ہوتے ہیں کچھ تخن
کیے وعدے کبھی تو نبھایا کرو

مانا میں نے ہو مجبور ناصر مگر
مریض عشق کو یوں نہ ستایا کرو

ایم ناصر جوئیہ، چوک متیلا

تھا۔ رکشے سے اتر کر بڑی نے مجھے پانچ سو روپے کا نوٹ تھمایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں اُف اُس کی انگلیاں برف سے زیادہ ٹھنڈی تھیں ایک سرد لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ دوسرے لمحے میں ایک دم ٹھٹھک کر رہ گیا اور مڑ کے دیکھا تو حیران رہ گیا میں چیخنا چلانا چاہتا تھا۔ مگر میری آواز حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ پورا وجود بری طرح کانپنے لگا۔ دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ دل کی دھڑکن مزید تیز ہوگئی اور روح میں گھبراہٹ اترتا چلا گیا۔

میں الٹے قدموں پیچھے گھوم گیا۔ میرا سر گھومنے لگا۔ اوسان خطا ہوگئے میرے دائیں بائیں آگے پیچھے وہ کہیں بھی نہیں تھیں میں چکرا کر گرتے گرتے بچا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں میں لڑکھڑاتے ہوئے رکشے کے قریب آیا اور خود کو سنبھالتے ہوئے ایک بار پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر اندھیرے میں گھورا۔ وہ کہیں نظر نہ آئی نہ ہی اُن کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سرد موسم ہونے کے باوجود میں پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس وقت سردی اور تاریکی کی وجہ سے روڈ بھی سنسان دکھائی دے رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ فوری گھر پہنچ جاؤں۔

وہ میری زندگی کی خوفناک ترین رات تھی جب بھی آنکھ لگتی میں خواب میں اُن کو ہی دیکھتا اور ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا سوتے جاگتے کروٹیں بدل بدل کر تھک سا گیا کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔

اس وقت میں بخار میں بری طرح تپ رہا تھا اور سوالوں کی برسات میرے دماغ کو چھلنی کر رہی تھی میں آج تک یہ معمہ حل نہیں کر سکا کہ وہ کوئی بھوت تھیں یا آسیبی روح......

☆☆......☆☆

نعیم بابا

یہ دنیا مانتی ہے صرف دریاؤں کی گہرائی
مرے دل میں بھی گہرائی ہے لیکن کون مانے گا

وہ نیک ہستی جن کے ذریعے بیش بہا فیض حاصل ہوئے
مصنف کے ذاتی تجربات کا نچوڑ، فکر انگیز تحریر......

قاضی فیضان حسین عثمانی

کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماورائے عقل ہوتے ہیں جن کو عقل تسلیم نہیں کرتی مگر وہ آپ کی زندگی میں آتے ضرور ہیں۔ پُراسرار لفظ کے بارے میں اکتوبر 17ء میں اپنی پُراسرار کہانی

میں تشریح کر چکا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ آپ کے لیے پُراسرار وہی واقعات اور معاملات ہوں گے جو آپ کے دل و دماغ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیں کہ ایسا ہوا تو کیوں ہوا اور ایسا ہو جاتا تو اچھا ہوتا اس طرح نہیں ہونا تھا سمجھ سے باہر ہے وغیرہ وغیرہ مطلب ہر وہ واقعہ جس میں اسرار چھپا ہو جو آپ کی عقل کے گھوڑے دوڑانے کے باوجود نہیں سلجھ پا رہا ہو سمجھ میں نہیں آ رہا ہو وہ پُراسرار معاملہ ہے۔

ہماری روز مرہ کی زندگی میں ایسے ہزاروں واقعات ہو جاتے ہیں جو بظاہر تو بڑے چھوٹے اور معمولی ہوتے ہیں مگر ہماری عقل ہماری سوچ رکھنے کی صلاحیتوں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہوتے ہیں جو لکھنے میں نہیں آتے عقل میں نہیں سما پاتے مگر ہم اُن کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ ایک اٹل اور حتمی حقیقت ہے کہ ہر کام 'من جانب' اللہ ہے اُس کام کو ہونے کے بعد اگر' مگر' خبر' کب' کیوں' کیسے' کہاں' وہاں' یہاں' جہاں' شاید' ایسا' ویسا' کیسا وغیرہ وغیرہ کے الفاظ ہی آتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں یہ ہی الفاظ دماغ میں دہراتے رہتے ہیں۔ آج کی یہ کہانی جو کہ پُراسرار نمبر کے لیے ہے اس میں بیان کردہ واقعات بھی پہلے کی طرح بہت سادہ اور عام سے لگیں گے۔ بعض پڑھنے والوں کو مگر میرے لیے یا مجھ جیسے عقل سے پیدل اُن لوگوں کے لیے بہت خاص اور اہم ہوتے ہیں جو اللہ پاک کے نیک' مقرب' پرہیز گار اور باعمل عبادت گزار اللہ کے ہو جانے والے اللہ سے لو لگانے والے اللہ والوں کی صحبت اور سنگت میں اپنا وقت گزرنا اپنے لیے باعث اجر و ثواب سمجھتے ہیں اور اُن اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھ کر اُن کی شفقت' محبت اور خلوص ملنے کے ساتھ ساتھ اُن کے در سے جو نورانی و روحانی فیوض و برکات ظاہر ہوتے ہیں اُن کو حاصل کرنا بھی اپنے لیے سعادت کا باعث سمجھتے ہیں۔

اور انہی اللہ والوں جن کو اللہ اپنا بنا لیتا ہے اُن کو مستجاب الداعوات' کے منصب پر فائز کر دیتا ہے اُن کے منہ سے نکلی ہر دعا پوری ہونے لگتی ہے اُن کے پاس آنے والے ہر حاجت روا' اور ضرورت مند کی حاجت اور ضرورت پوری ہونے لگتی ہے اللہ پاک اپنے نیک متقی پرہیز گار بندوں کے تو وسیلہ جلیلہ کے صدقے میں ایسے ایسے گناہ گار لوگوں کی دعاؤں کو بھی شرف قبولیت بخشتا ہے جو زندگی میں شاید ہی کبھی کوئی نیک کام کر پائے ہوں مگر جب مشکل' پریشانی' دکھ' تکلیف اور فکر میں مبتلا ہوتے ہیں اور کسی اللہ والے کی چوکھٹ پر جا کر دعا کرتے ہیں اُس کے وسیلے سے اللہ سے مانگتے ہیں تو اللہ پاک اپنے اُس گناہ گار' خطا کار' بدکار' سیاہ کار بندے کی دعا کو بھی قبولیت کا شرف بخش کر اُس کی مشکل کو ختم' پریشانی کو دور اور تکلیف کو رفع کر کے اُس کے دکھ کو سکھ میں بدل دیتا ہے۔

میری آج کی پُراسرار کہانی کا کردار ایسے ہی اللہ کے نیک بندے' متقی' پرہیز گار' رحمدل' پُر خلوص' مخلص قابل احترام 'نعیم بابا' ہیں اور اُن کے ساتھ وقت گزرنے کے دوران میرے ساتھ جو واقعات اور حالات پیش آئے وہ ہیں اور ایسی عام اور سادہ سی باتیں ہیں جو بظاہر عام اور سادہ ہیں مگر میرے لیے بہت خاص ہیں اور آج 'نعیم بابا' کو دنیا سے گئے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں مگر وہ واقعات آج بھی میرے دماغ میں روز اول کی طرح تر و تازہ ہیں اور اب بھی دماغ میں موجود ہیں عقل کے گھوڑے دوڑا دوڑا کر پاؤں شل ہو جانے کے بعد اُن باتوں کا جواب ملنے سے قاصر ہوں جو 'نعیم بابا' سے ملاقاتوں میں میرے ساتھ ہوئیں۔

نعیم بابا سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً 18 سال پہلے 1999ء میں ہوئی تھی جب میری بہن کا ایک اچھے پڑھے لکھے سلجھے اور شریف خاندان سے رشتہ آیا جو کہ میری دوسری بہن کے سسرالی رشتہ دار ہیں اور اگر خاندان کا پچھلا بیک گراؤنڈ یا پیچھے کی نسلوں میں جائیں تو دونوں خاندانوں کے گھرانوں میں آپس میں تعلق رہ چکا تھا۔ لڑکا پرائیویٹ جاب میں تھا دیکھے بھالے لوگ تھے مگر پھر بھی ہم نے کسی نیک اللہ والے سے استخارہ کرانے کا سوچا آج سے 18 سال یا 20 سال پہلے استخارہ کرانے کے لیے کسی اچھے عبادت گزار پرہیز گار شخص کو تلاش کرنا پڑتا تھا ویسے تو ہر شخص خود استخارہ کر سکتا ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہو مگر وہ یہ سوچ کر کسی اللہ والے نیک و متقی پرہیز گار بزرگ کے پاس جاتا ہے کہ مجھ جیسے گناہ گار کی دعا میں وہ طاقت نہ ہو مجھ سے کروڑوں درجے بہتر یہ بزرگ ہستی ہیں ان سے استخارہ کرایا جائے اور میری بھی یہ ہی سوچ تھی جو مجھے نعیم بابا تک لے گئی۔

اب آج کل تو استخارے سینٹر خود آپ کے موبائل پر میسج کر کر کے استخارہ کرانے کی دعوت دیتے ہیں اُس وقت ایسا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ میں نے اپنی بہن کی دوست جو کہ میری بھی بڑی بہنوں کی طرح تھیں' اُن سے اپنی اُس پریشانی کا ذکر کیا کہ آپ کوئی استخارہ کرنے والا نیک انسان بتائیں کیونکہ وہ خود بھی بہت باعمل عبادت گزار نیک لڑکی تھیں جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ آنتوں کے کینسر میں مبتلا ہو کر بھری جوانی میں 2003ء میں دنیا سے جا چکی ہیں مجھے اپنے سگے بھائی کا درجہ دیتی تھیں۔

''فیضان تم نعیم بابا کے پاس چلے جاؤ وہاں بہت خلقت آتی ہے اور اکثریت کو اُن کی دعاؤں سے فائدہ ہوتا ہے۔ تم اُن سے استخارہ کراؤ۔ باجی ہجوم تو جادوگروں' اور تماشہ دکھانے والوں کے پاس بھی لگا رہتا ہے میں نے بے زاری سے کہا۔

''بھائی ایسا نہیں ہے وہ بہت پہنچے ہوئے ہیں اور اُن کے پاس موکل ہیں اللہ کے ناموں اور اللہ کے پاک کلام سے وہ ضرورت مندوں' حاجت مندوں کی مشکلات اور پریشانیاں دور کرتے ہیں۔''

''ارے باجی آپ تو بڑی تفصیل جانتی ہیں آپ کا جانا ہوا ہے۔'' میں نے ناہید باجی کی بات سن کر کہا۔

''ہاں بھائی میں اسکول میں جاب کے لیے انٹرویو دے کر آ رہی تھی تب میرے اور بجنل کاغذات کی فائل کہیں گر گئی تھی میں بہت پریشان تھی کسی کے بتانے پر قلعے پر جہاں نعیم بابا بیٹھتے ہیں وہاں اُن کے ساتھ گئی تھی۔'' (یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ حیدرآباد میں دو قلعے مشہور ہیں ایک پکا قلعہ اور دوسرا کچا قلعہ بابا جی پکے قلعے کے علاقے میں بیٹھے تھے)

''پھر باجی وہاں جا کر کیا پتہ لگا آپ کو؟'' میں نے اُن سے معلوم کیا۔

''انہوں نے مجھے استخارہ کر کے بتا دیا کہ تمہارے کاغذات جلد ہی مل جائیں گے تمہارے گھر کے پاس ہی کہیں گرے ہیں کسی نے اٹھا لیے ہیں خود پہنچا دے گا۔'' ناہید باجی نے بتایا۔

''اُس کے بعد تین دن بعد ہمارے فلیٹ کے پلازہ کے چوکیدار نے میری فائل مجھے لا کر دی کہ کوئی شخص دے کر گیا ہے اقبال صاحب کے فلیٹ پر پہنچا دیں۔'' (اقبال ناہید باجی کے والد کا نام ہے)۔

''آپ کو کوئی وظیفہ دیا تھا' پڑھنے کو یا چلہ کرنے کو دیا تھا میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں مجھے 'سورۃ النور' کی تلاوت کرنے کو کہا تھا ہر نماز کے بعد انہوں نے بتایا آج ناں نعیم بابا دنیا میں ہیں اور ناں میری بہن (بہن کی دوست) ناہید باجی حیات ہیں مگر میرے دل سے ہر وقت اُن کی مغفرت اور بخشش کے لیے دعائیں نکلتی ہیں جنہوں نے مجھے نعیم بابا جیسے انسان کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں ایک دن صبح نعیم بابا کے پاس پہنچ گیا ایک تیرا سا ہال تھا جہاں ایک خلقت موجود تھی جو اپنے اپنے عزیز اُن سے اپنا دکھ درد بیان کر رہی تھی اور وہ اُس کا حل بتا رہے تھے یا حل کرنے کا طریقہ جو قرآنی آیات اور سورتوں سے بتا رہے تھے۔ میں بھی سب سے پیچھے بیٹھا اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میں نے نوٹ کی ایک بات کہ حضرت زیادہ تر لوگوں کو سورۃ النور کی تلاوت کا بول رہے ہیں کہ ہر نماز کے بعد سورۃ النور پڑھو۔ تقریباً 2 گھنٹے کے بعد میرا نمبر آیا تو میں گیا اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑھتے رہے۔

''رشتہ اچھا ہے لوگ بھی اچھے روزی رزق دینے والی ذات اللہ پاک کی ہے بیٹا پریشان مت ہو اللہ کا نام لے کر بسم اللہ کردو اپنے والد کو بولو نعیم بابا نے مجھے بولا۔

میں گھر آ گیا اور بتا دیا میری بہن کی شادی کی تیاریاں تو ہو ہی رہی تھیں اب سب لوگ مطمئن ہو گئے۔ میرا نعیم بابا کے پاس جانا آنا کم نہیں بلکہ وقت کے ساتھ بڑھتا گیا میں اپنے نہیں دوسروں کے مسائل لے لے کر اُن کے پاس جاتا اور اُن حل کے لیے وظائف لالا کر بتاتا یہ ہمدردی' احساس اور دوسروں کے کام آنا مجھے والدین سے ورثے میں ملے ہیں میں کسی کے کام کو بھی منع نہیں کرتا بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کبھی منع کیا ہو میرے رہنے کا ارک جاتے ہیں مگر میں دوسروں کے کام نہ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں چاہے سامنے والے میرے ساتھ برا ہی کیوں نہ کر چکا ہو۔ مگر میں اُس کے بھی کام آ جاتا ہوں اور یہ عادت میں وقت کے ساتھ پختہ اور مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ کبھی کبھار تو میں بغیر کسی کام کے اُن کے در پر چلا جاتا وہ مسکراتے ہوئے کہتے۔

''بیٹا آج پھر کسی حاجت مند کی حاجت لے آئے ہو۔''

''نہیں حضرت آج تو آپ کی دعائیں لینے آیا ہوں۔'' وہ مسکرا کر سر پر ہاتھ پھیرتے دعا دیتے اپنے ہاتھ سے چائے منگوا کر پلاتے مجھے اُن کے پاس جا کر سکون ملتا تھا۔ دماغ میں گڈمڈ ہوتے خیالات میں ٹھہراؤ آ جاتا تھا۔ نعیم بابا صبح سے دوپہر تک وہاں بیٹھ کر لوگوں کے مسائل حل کرتے تھے اور ظہر کی نماز پر اٹھ جاتے تھے ظہر کی نماز وہ دربار ہی پر ادا کرتے تھے میں نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ کتنے ہی لوگوں کے مسائل حل ہوتے تھے وہ لوگ خوشی خوشی مٹھائیاں اور نذرانے لاتے تھے کہ یہ ہم آپ کے لیے لائے ہیں مگر نعیم بابا نے مسکراتے ہوئے کہتے۔

''مجھ کو حاجت نہیں ہے' یہ اللہ کی مخلوق کو کھلا دو اور نذرانہ دربار پر دے دو یا کسی ضرورت مند ہو واقعی انہوں نے پیسہ کمانے کی دکان نہیں کھولی تھی بلکہ لوگوں کا دکھ تکلیف کم کرنے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔ اب آگے جو آخر کے واقعات ہیں وہ اُس کہانی کا ٹرننگ پوائنٹ ہیں میرے بچپن کا دوست آپ اُس کا نام راحیل رکھ لیں اُس کا دوست اُسی کا ہم نام تھا اُن کے بڑے بھائی ملائیشیا میں سیٹل تھے وہ پاکستان آئے ہوئے تھے اور اُن کا کہنا تھا کہ اس بار میں 15 افراد کو ملائیشیا لے کر جاؤں گا جن میں اُن کا اپنا سگا بھائی بھی شامل ہوگا جو میرے دوست راحیل کا دوست تھا۔ اور اُس کا نام بھی راحیل ہی تھا مگر وہ میرے دوست راحیل کی طرح ہوشیار نہیں تھا میرا دوست راحیل بھی جانا چاہتا تھا اور وہ مجھے راضی کر رہا تھا کہ تم بھی چلو میں نے اُس کو کہا۔

''ٹھیک ہے اگر تم جاؤ گے تو میں بھی ملائیشیا چلوں گا تمہارے ساتھ۔'' اُس نے میری ملاقات اپنے دوست کے بڑے بھائی سے کرا دی یہ آج سے تقریباً 18 سال پہلے کے واقعات بتا رہا ہوں اُس وقت ملائیشیا میں روزگار کے مواقع بہت زیادہ تھے۔ مہاتیر محمد کی اچھی اور بہتر پالیسیوں نے ملائیشیا کو ترقی پذیر ممالک سے اُٹھا کر ترقی یافتہ ممالک میں شامل کر دیا تھا اُس کی کرنسی کی مارکیٹ میں ویلیو تھی اُن صاحب نے جو وہاں کی مقامی لڑکی سے شادی کے بعد وہیں سیٹل تھے اِس بار آئے تو لوگوں نے اُن کے ساتھ جانے کے لیے اُن کی خوب دعوتیں بھی کیں میری ملاقات اُن سے میرے دوست راحیل نے کروائی میں مطمئن ہو گیا۔ اُن کا کہنا تھا۔

''میں اِس بار صرف 15 افراد کو لے کر جاؤں گا اور اُن کو رہائش اپنے پاس ہی دوں گا اپنے گھر میں' اور وہاں جا کر کام دلواؤں گا۔'' اسی دوران انہوں نے میرے دوست راحیل کو اِس چکر میں ساتھ لے جانے سے منع کر دیا۔

''تم اگلے چکر میں چلنا کیوں کہ اُن کا بھائی جو راحیل کا دوست تھا اور ہم نام بھی وہ کچھ نہیں جانتا اُس کو عقل نہیں ہے تم یہاں پر پہلے اُس کو سکھاؤ سمجھاؤ اُس کے ساتھ کوئی ہنر سیکھے گا پھر اگلے چکر میں تم دونوں چلنا میں نے یہ سنا تو کچھ عجیب لگا مگر پھر دوست کے کہنے پر اپنا پروگرام ملتوی نہیں کیا بلکہ جانے کے لیے تگ و دو کرنے میں لگ گیا پاپا سے بات کی تو وہ تھوڑی بحث کے بعد مان گئے۔

''ٹھیک ہے میں پے من کرتا ہوں کسی کو بول کر ایک شخص کے 80000 تھے ٹوٹل اخراجات جو اُن صاحب کو دینا تھے میں نے اپنا پاسپورٹ بھی اُن کو جا کر دے دیا جو انہوں نے اپنے بھائی کی دکان میں دوسرے پاسپورٹوں کے ساتھ رکھ دیا دکان اُن بھائی کی تھی۔ جہاں وہ شام میں بیٹھ کر کچہری کرتے تھے میں نے اُن کو کہا۔

''میرا پاسپورٹ 6 ماہ بعد ایکسپائر ہو جائے گا۔'' وہ بولے۔

''نو پرابلم وہاں سے ہی رینیو کروا لیں گے۔'' ہر طرح سے مطمئن کر دیا۔ انہوں نے بس اُن کو پے منٹ دینی تھی۔ وہ دو دن بعد اسلام آباد جانے والے تھے ویزہ لگوانے کے لیے پاپا کی طرف سے پے منٹ کا انتظار تھا کہ کب تک ہوتی ہے اس دن صبح سے ہی عجیب بے چینی اور بے کلی سی تھی ذہن اُلجھ رہا تھا سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں نے جانے کا فیصلہ درست کیا ہے یا غلط سوچیں اور خیالات آ رہے تھے طرح طرح کے یکدم مجھے نعیم بابا سے ملاقات کرنے کا خیال دماغ میں آیا کہ کافی دن ہو گئے ہیں اُس کے پاس نہیں گیا۔ ملائیشیا والے کام کی وجہ سے چلو آج ملاقات بھی ہو جائے گی اور اُن سے دعا بھی لے لیں گے۔ ملائیشیا جانے کا بھی بتا دوں گا یہ سوچ کر میں نعیم بابا کے پاس پہنچ گیا اپنا نمبر آنے پر میں اُن کے پاس گیا۔

''ہاں برخوردار کیسے آنا ہوا آج بڑے دن بعد چکر لگایا کہاں تھے۔''

''حضرت ذرا میں مصروف تھا۔ اس لیے آپ کی طرف آنے کا موقع ہی نہیں ملا مجھے۔'' میں نے

ادب وعاجزی سے جواب دیا۔

''اچھا کہو کیسے آنا ہوا آج۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ آنکھیں بند تھیں کچھ پڑھ رہے تھے۔ آنکھیں بند ہونے پر چہرے پر مسکراہٹ ضرور ہوتی تھی اُن کے یہاں میں آپ کو ایک بات بتانا لازمی سمجھتا ہوں کہ جب سے میری نعیم بابا سے ملاقاتیں شروع ہوئی تھیں۔ بہن کی شادی کے لیے جو رشتہ آیا تھا اُس کا استخارہ کرانے گیا تھا بہن کی شادی کے بعد بھی میرا اُن کے پاس آنا جانا لگا رہا تھا۔ ملائیشیا جانے کے واقعات اُن سے ملاقات کے 8 ماہ بعد کے ہیں اور میں نے اُس تمام عرصے میں جو بات نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ نعیم بابا ظہر کے وقت جب نماز کا ٹائم ہو جاتا تو اپنا کام ختم کر دیتے تھے۔ صبح سے ظہر تک لوگوں سے ملتے تھے ظہر کی نماز وہ 'دربارِ سخی' پر ہی ادا کرتے تھے پھر اپنے گھر چلے جاتے تھے یہ بات نوٹ کی تھی میں نے کہ نمازِ ظہر اُن کی 'دربارِ سخی' پر ہوتی تھی واللہ اعلم بالصواب......

حضرت میں آپ کو بتانے اور آپ سے دعائیں لینے آیا ہوں میرا ملائیشیا جانے کا فائنل ہو گیا ہے میں جلد چلا جاؤں گا۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر اُن کو بتایا۔

''نہیں ملائیشیا نہیں جاؤ وہاں جانا بہتر نہیں ہے تمہارے لیے۔'' انہوں نے یکدم مجھے کہا۔ میں شاک کی کیفیت میں آ گیا خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ دو تین منٹ ایسے گزر گئے۔

''ندیم نام کا بندہ لے کر جا رہا ہے ناں' وہ وہاں نوکری کرتا ہے اُس نے وہاں کی مقامی لڑکی سے شادی بھی کر لی ہے جو ایک عدد بیکری کی مالک ہے۔'' نعیم بابا بول رہے تھے آنکھیں بند کیے اور میں حیران و پریشان اُن کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ اس طرح آنکھیں بند کر کے بالکل اس طرح بتا رہے تھے کہ جیسے اُن کی نظروں کے سامنے یہ سب لکھا ہوا ہے وہ وہی سب کچھ بتا رہے تھے جو میرے علم میں تھا مگر میں حیران اس لیے تھا کہ نعیم بابا کے علم میں یہ سب کیسے آیا اور وہ کیسے بتا رہے ہیں یہ سب......

''بیٹا زیادہ مت سوچو اللہ پاک سے خیر اور اچھے کی امید رکھو' وہ شخص وہاں لے جا کر سب کے ساتھ فراڈ کرے گا' بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔'' اُن کی آواز نے مجھے سوچوں سے باہر نکال پھینکا۔

''بیٹا بہتر اور اچھا ہے کہ تم یہاں ہی اپنے روزگار کی کوشش کرو اور اگر جانا بھی ہو تو کسی اچھے طرح سے جانا جس طرح وہ لے جائے گا وہ درست نہیں ہے' آگے تمہاری مرضی ہے ہم نے تمہیں اللہ کے حکم سے ہر بات سے پہلے ہی آگاہ کر دیا ہے۔ اب ماننا یا ناں ماننا تمہارے اوپر ہے۔ میری اُس وقت حالت ایسی تھی کہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' میں شاک کی کیفیت میں وہاں سے اٹھا میرا حال اُس مسافر کی طرح لگ رہا تھا کہ جس کے سامنے منزل آ جاتی ہے مگر وہ راستہ کھو جاتا ہے۔ میں اُس وقت دریا میں تیرتے اُس انسان کی طرح تھا جو کنارہ بھول جاتا ہے کس طرح میں نے بائیک اسٹارٹ کی کیسے گھر پہنچا کچھ پتہ نہیں میں اگر اُن کی باتوں پر توجہ دیتے بغیر چلا جاؤں جو ہو گا دیکھا جائے گا دل نے کہا۔ میں پھر اُن کی صحت اور رنگت میں بیٹھنے کا کیا فائدہ جب اُن کی باتوں پر عمل نہیں کر سکتے ہو دماغ نے مجھے فوراً ٹوکا۔

''اتنی مشکل سے تو تجھے باہر جا کر روزگار کمانے کا موقع ملا ہے تم ہمت پکڑو اور چلے جاؤ۔'' دل نے پھر کہا۔

''نہیں اگر تم اللہ کے نیک بندوں کی صحبت میں بیٹھنے کا دعویٰ کرتے ہو تو اللہ کے اُسی ایک نیک بندے نے تمہیں کہا ہے اور ہر بات سچ بتا دی ہے تم اُن سے مشورے لیتے رہے ہو پھر اب کیوں کنفیوز ہو دماغ نے پھر دلیل دی مگر میں پھر کیا کروں۔ دل نے کہا تم کچھ نہ کرو جانے کا ملتوی کر کے اللہ پر بھروسہ رکھو آگے اچھا ہو گا ہو سکتا ہے اللہ پاک نے تمہیں اپنے نیک بندے کے ذریعے آنے والے خطرات سے آگاہی دے دی ہو تم پُرسکون ہو کر آنے والے وقت کا انتظار کرو۔ دماغ نے پھر مجھے سمجھایا۔ یہ دل و دماغ کی جنگ نہ جانے کب تک چلتی اچانک مجھے اپنے پاسپورٹ کا خیال آیا۔ پہلے مجھے دکان سے جا کر پاسپورٹ لے لینا چاہیے اگر شام کو ندیم بھائی سے مانگا تو ہو سکتا ہے وہ پھر مجھے باتوں سے پھسلائے لہٰذا ابھی لے آؤں جا کر میں اُن کے بھائی کی دکان پر جا کر پاسپورٹ لایا لا کر گھر میں رکھا میں کس سے بات کروں۔

اس مسئلے پر یہ ہی سوچ رہا تھا کہ راحیل کے آنے کا معلوم ہوا اُن دنوں میں دونوں ہی فارغ تھے اس لیے وہ تقریباً روزانہ میرے پاس آ جاتا تھا اور جب سے ملائیشیا کا چکر چلا تھا تب تو ہم دونوں روز گھنٹوں بیٹھ کر پلان بناتے رہتے تھے۔ میں باہر گیا سلام دعا کی۔

''کیا بات ہے آج تیرے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔'' راحیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اب پتہ نہیں اُس نے مذاق کیا تھا یا واقعی جو میرے ساتھ ہوا تھا کچھ دیر پہلے اُس نے حقیقت نے میرے چہرے پر بارہ بجا دیے ہوں۔

''ہاں یار ایک مسئلہ ہو گیا ہے تو بتا کیا کروں۔''

''ہاں بول کیا ہوا۔'' اُس کے بعد میں نے راحیل کو من و عن پوری بات جو نعیم بابا سے ہوئی وہ بتا دی وہ بھی میری وجہ سے غائبانہ اُن کو جانتا تھا اور اُن سے عقیدت رکھتا تھا۔

''اب تو کیا کرے گا؟'' اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یار تو ہی مشورہ دے میں تو بہت کنفیوز ہو رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یار فیضان دیکھ اگر یہ باتیں کوئی عام بندہ کرتا تو ہم ڈبل مائنڈ ہوتے تو سہی تھا مگر یہ سب حقیقت اُس انسان نے اللہ کے اُس نیک بندے نے تجھے بتائی ہے جس سے تو عقیدت رکھتا ہے اور تیرا آنا جانا ہے اُس کے پاس' اور تیرے علاوہ ایک خلقت وہاں ہوتی ہے ہر روز تو بھائی اُس کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کر لے۔ ہو سکتا ہے اللہ پاک نے تجھے آنے والے خطرے سے آگاہی دی ہو اُن کے ذریعے' اب تو خود فیصلہ کر۔'' اُس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار یا تو ہم لوگ کسی نیک بندے سے اتنی عقیدت رکھیں ہی نہیں اور اگر رکھیں تو جو وہ بولے اُس کو مانیں۔ بظاہر وہ اُس وقت ہمیں اپنے خلاف محسوس ہو مگر شاید آنے والا وقت اُن کی کہی ہوئی باتیں ہمارے حق میں ثابت کرے۔ میں نے کہا۔ راحیل بولا۔

''ہاں ایسا لگتا ہے اللہ پاک نے ہمارا روزگار وہاں نہیں لکھا پہلے میرا جانے کا منع ہوا اب تیرے لیے ایسی صورت حال خیر تو چل ابھی چل کر دکان سے پاسپورٹ لے لے' شام میں ندیم بھائی ہوتے ہیں وہ پھر اپنی باتوں سے گھیریں گے' اگر معلوم کریں تو بول دیں گے پیسوں کا بندوبست نہیں ہوا اس لیے پاپا نے پاسپورٹ منگوا لیا ہم سے۔'' راحیل نے مجھے کہا۔

''یار میں پاسپورٹ لے کر آ گیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''اچھا کیا چل تو آرام کر رات کو ملتے ہیں۔''
وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ میں گھر آ گیا دل و دماغ اب پُرسکون تھے جو جنگ دونوں کے درمیان کچھ دیر پہلے چل رہی تھی وہ ختم ہو چکی تھی نتیجہ دماغ کے حق میں آ چکا تھا واقعی اچھے دوست بھی قدرت کی طرف سے تحفہ ہوتے ہیں۔ راحیل بھی میرے ایسے ہی اچھے دوستوں میں سے ایک تھا۔ شام کو پاپا نے آفس سے آ کر بتایا۔
''بیٹا میں نے اپنے دوست سے پیسوں کی بات کر لی ہے وہ کل تک کر دے گا تم تیاری کرو۔''
واقعی اُس وقت پاپا نے میرے لیے قرضہ ہی لینا تھا کیونکہ آٹھ ماہ پہلے وہ بہن کی شادی کرنے کے بعد بالکل خالی ہاتھ تھے اور کسی رشتہ دار یا قریب کے جاننے والوں میں سے بولنا ہی بے کار تھا اس لیے پاپا نے اپنے دوستوں کو کہا ہو گا جس کا اُن کو مثبت جواب مل گیا تھا۔
''نہیں پاپا میں نہیں جا رہا ہوں میں نے کینسل کر دیا ہے پروگرام۔'' میری بات سن کر وہ حیران ہوئے۔
''کیوں بھئی کل تک تو تم اپنی ضد پر قائم تھے آج کیا ہو گیا تمہیں؟''
''بس پاپا ایسے ہی۔'' پھر میں نے اُن کو کسی طرح مطمئن کر دیا مگر نعیم بابا والی گفتگو نہیں بتائی بس سرسری ذکر کیا۔
''ٹھیک ہے بیٹا جیسے تمہاری مرضی' ویسے تمہارے جانے کے بعد میں بہت اکیلا پن محسوس کرتا اچھا ہوا تم نے کینسل کرا دیا۔'' پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
رات کو راحیل مجھے بلانے ایا کہ وہ صاحب (ندیم بھائی) یاد کر رہے ہیں پھر میں نے اُن سے کس طرح جان چھڑائی ورنہ وہ مجھے یہاں تک کہہ

غزل

چند لوگوں کے ریا کار ریگستاں پہ نہ جا
میرے محبوب غریبوں کے گریباں پہ نہ جا

زیست کے چار ہی ایام ملے ہیں تجھ کو
ذکرِ خالق میں بسر کر کسی شیطان پہ نہ جا

جس کے حالات نے گہنا دیے چہرے یکدم
گردشِ وقت تو اس بے سر و سامان پہ نہ جا

سچے انسان کے ماتھے پہ تو ہوں گی شکنیں
تو کسی جھوٹے بشر کے لبِ خنداں پہ نہ جا

اے قمر تجھ سے ہے اس چرخ کی زینت قائم
چاندنی کافی ہے تو زلفِ پریشاں پہ نہ جا

چوہدری قمر جہاں علی پوری' ملتان

''سچی کہانیاں'' اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے

ادارہ 'سچی کہانیاں' اپنے قارئین کی سہولت کے لیے دفتر میں ایک ڈیسک قائم کر رہا ہے۔ آپ کو اگر 'سچی کہانیاں' ملنے میں دشواری ہے تو بذریعہ فون یا میسیج ہمیں مطلع کریں آپ کہیں بھی رہتے ہیں ادارہ آپ کے گھر کے پتے پر بذریعہ وی پی 'سچی کہانیاں' ارسال کرے گا اس طرح آپ اور آپ کے پیارے 'سچی کہانیاں' کے درمیان جو دوریاں پیدا کر دی جاتی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ 'سچی کہانیاں' اب گھر بیٹھے حاصل کیجیے۔

فوری رابطہ 021-35893121-22-23

موبائل نمبر 0304-3168708

رہے تھے تم پیسے نہیں ہو رہے تو وہاں پہنچ کر دے دینا میں خرچہ کر دیتا ہوں مگر میں نے منع کر دیا اب میرا جانے کا ارادہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اب میں پُرسکون تھا۔ اب آپ اُن لوگوں کی نہیں جو گئے تھے تین ماہ بعد وہ واپس آ گئے تھے اور اُن کے ساتھ واقعی فراڈ ہوا تھا۔ لے جانے والا اُن کو غلط طریقے سے لے کر گیا تھا وہاں لے جا کر پاسپورٹ اپنے پاس رکھ کر کام پر بھی دور دراز جگہ پر لگوا دیا تھا۔ اپنے کہنے کے مطابق اپنے گھر میں رہائش نہیں دی تھی جب اُن کے گھر والوں کو اُن لوگوں نے رو رو کر اپنے اوپر گزرے حالات بتائے تو اُن کے گھر والوں نے انہیں کسی بھی طرح واپس آنے کا کہا کچھ لوگوں کے گھر والوں نے اُن صاحب کے گھر والوں سے جھگڑا بھی کیا مگر یہ غلط فہمی تھا اُن کے گھر والوں کا کہنا تھا

"آپ نے ہم سے معلوم کر کے ندیم کے ساتھ اپنے بچوں کو بھیجا تھا جواب آئے ہو۔" خیر یہ ایک الگ داستان ہے کہ وہ لوگ تین ماہ گزار کر واپس کس طرح آئے کبھی موقع ملا تو دوبارہ ان واقعات پر قلم اٹھاؤں گا کہ کس طرح لوگ فراڈیوں کی باتوں میں آ کر دیار غیر میں اپنا سب کچھ لٹا کر خالی دست واپس آ جاتے ہیں۔ میں تو اپنے رب پاک پروردگار کا آج بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس مہربان مالک نے کس طرح مجھے اپنے نیک متقی پرہیزگار بندے کے ذریعے آنے والے حالات سے آگاہی دے کر مجھے اس معاملے سے بچا لیا ورنہ میں بھی اُن لوگوں میں شامل ہوتا آج جو اپنے والدہ کے لیے ہوئے قرضے کو اتار رہا ہوتا یا اتارنے کی ترکیبیں کر رہا ہوتا کیونکہ اُن کی طرح لٹ لٹا کر آ جانا میں نے اس کے بعد فہیم بابا سے کئی بار معلوم کیا کہ آپ یہ سب کیسے جانتے تھے اور آپ نے مجھے کیوں روکا وہ ہر بار مسکرا دیتے تھے کہتے۔

"بیٹا اس گہرائی میں مت جاؤ بس اُس پروردگار کا شکر ادا کرو جو تم پر مہربان ہے ہمارا رب ہمارے لیے اچھا ہی کرتا ہے یہ تو ہم ناشکرے انسان ہیں جو کبھی سمجھ نہیں پاتے اور خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ واقعی اللہ پاک نے ایک بار پھر مجھ گناہ گار انسان کو اپنے فضل اور رحمت سے نوازتے ہوئے اپنے نیک عبادت گزار بندے کے ذریعے مشکل اور پریشانی سے بچایا تھا مجھ پر کرم کیا تھا اُس کا میں جتنا شکر ادا کروں کم ہے آج فہیم بابا جیسی ہستی ہم میں موجود نہیں مگر اُن کی وہ مسکراہٹ اور اُن کا مجھے بروقت بتانا کہ کیا ہوگا میرے ساتھ اس لیے میں نہ جاؤں وہ سب میرے دماغ میں روز اول کی طرح تر و تازہ ہے اور ہمیشہ رہے گا واقعی جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اُس کا ہو جاتا ہے اللہ پاک اپنے نیک بندوں کو ہماری رہنمائی اور مدد کے لیے ہمارے سامنے رکھتا ہے مگر ہمارے پاس اُن کو دیکھنے والی آنکھیں ہونی چاہئیں اللہ پاک ہمیں اپنے نیک متقی اور سچے بندوں کی صحبت اور سنگت عطا فرمائے اور ہمیں ہر مشکل و آفات سے محفوظ فرمائے آمین۔

قارئین آپ میں کسی کے لیے یہ عام اور سادہ سے واقعات ہوں گے مگر میرے لیے بہت خاص ہیں میں آج بھی ایسے بزرگوں کے درباروں اور اسے متقی پرہیزگار لوگوں کی صحبت کا طلب گار رہتا ہوں اور ملتا ہوں تلاش کرتا ہوں پتہ نہیں کب کس لمحے میں ہمیں کہاں اللہ کا کوئی نیک ولی مل جائے جو ہماری مشکلات و تکالیف میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی ہمیں اللہ کے حکم اور فضل سے آگاہی دے دے۔

☆☆.....☆☆

بیٹھے بیٹھے حاضری ہو گئی

یہ جو اشکوں میں روانی ہے میاں
یہ محبت کی نشانی ہے یہاں.....

جب لگن سچی ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے
ایسا ہی معنفہ کے ساتھ ہوا ایک غیر معمولی بلاوا.....

نفیسہ فضل محمود

کافی عرصے سے میرے دل میں بھی ہر مسلمان کی طرح خواہش پیدا ہوئی میں بھی خانہ کعبہ اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور رسول پاک ﷺ کے روضہ پاک کی زیارت کروں۔ مگر

حالات کو مدنظر رکھ کر دل مسوس کر رہ جاتی تھی ایک مرتبہ عمرہ کی غرض سے میرے بیٹے نے کمیٹی ڈالی اب ساتھ جانے کے لیے محرم کی ضرورت تھی اسی چکر میں پیسے خرچ ہو گئے پھر ہم رہے پیاسے کے پیاسے......

میری کزن اور بھانجی چھ ماہ پیشتر عمرہ کر کے آئیں میں مبارکباد دینے گئی میری بھانجی نے مجھے بوسہ دے کر کہا۔

''خالہ آپ بھی جائیں گی انشاء اللہ میں آپ کے لیے دعا کر کے آئی ہوں۔'' میں کچھ خوش کچھ افسردہ سی گھر چلی آئی۔ غالباً 24 مارچ کی بات ہے میں ڈائجسٹ سچی کہانیاں پڑھ رہی تھی کہ بڑے بھائی کا فون آیا۔

''جنگ اخبار منگوالو اس میں حج کے لیے اشتہار آیا ہے۔'' میں نے بھائی سے کہا۔

''آپ اخبار لیتے آنا۔ شام کو بھائی اخبار لے آئے۔'' امن فاؤنڈیشن کی طرف سے اشتہار تھا۔ 1000 افراد کو حج کراتے ہیں آخری تاریخ درخواست موصول ہونے کی 30 مارچ تھی۔ میں نے فوراً درخواست لکھی اور صبح پوسٹ کر دی تیسرے دن میرے پاس میرے موبائل پر امن فاؤنڈیشن سے ایس ایم ایس آ گیا کہ آپ کی درخواست مل گئی ہے۔ ایک جائزہ لے کر آپ کو بتائیں گے آپ یقین کریں کہ میرے دل کو یقین سا ہونے لگا کہ اللہ پاک نے مجھ گناہ گار کی سن لی دوسرے دن میں نے امن فاؤنڈیشن فون کیا۔ کوئی صاحب تھے بہت اچھی گفتگو کی پوچھا۔

''محرم کون جائے گا؟'' میں نے کہا۔

''میں تو افورڈ نہیں کر سکتی بیوہ عورت ہوں۔ میرا بیٹا طاہر بیمار ہے۔'' وہ بولے۔

''آپ کی درخواست پر مینجمنٹ سے بات کرتے ہیں۔'' دوسرے دن فون آیا۔

''آپ اپنا پاسپورٹ اور جس بیٹے کا پاسپورٹ ہے لے کر آ جائیں۔'' میں نے دو تین دن پہلے ہی پاسپورٹ کی فیس جمع کرائی تھی وہ صاحب بولے۔

''آپ رسید شناختی کارڈ لے آئیں۔'' ہم وہاں پہنچے کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ تمام اسٹاف بہت اچھا ہے۔ فیصل صاحب نے انٹرویو کیا۔ بہت مخلص خوش اخلاق انسان ہیں اللہ پاک ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ سب نے ہمیں دعاؤں کی تاکید کرتے ہوئے کھڑے ہو کر رخصت کیا۔ میرے تو خوشی سے آنسو نکل پڑے پیر تھے کہ زمین پر ٹک نہیں رہے تھے اپنی خوشی شیئر کرنے کے لیے بہن کے گھر گئی سب بہت خوش ہوئے۔ چار پانچ دن بعد ہمیں فون آیا پاسپورٹ وغیرہ لے کر نرسری پر ریچوئیل ٹورز آفس صبح دس بجے آ جائیں۔'' وہاں ہمیں بہت عزت و احترام سے بٹھایا گیا چائے سے تواضع کی جن صاحب نے انٹرویو لیا کافی دبنگ قسم کے انسان ہیں بعد میں ان کا اسم گرامی کیپٹن شاہد اعجاز معلوم ہوا حاجی صاحب اور یونس صاحب سے یہاں ہی ملاقات ہوئی۔

ثاقب محمود میرا چھوٹا بیٹا اس نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اچانک حج اکبر کرلے گا۔

پھر مئی کے پہلے ہفتے میں ہمیں پوری تفصیلی تحریری پروگرام کی کال آئے گی جس میں جانے کی تاریخ واپسی کی تاریخ کہاں کہاں ٹھہرائیں گے یہ سب ریچوئیل ٹورز لینڈ کی طرف سے کیپٹن شاہد اعجاز صاحب نے ہمیں معلومات فراہم کی

تھیں۔ تین ماہ میں نے عجیب سی بے چینی اور خوشی میں گزارے کہ کب ستمبر کا مہینہ آئے گا اور ہم خانہ کعبہ اللہ کا گھر جہاں ہر وقت رحمتوں کا نزول ہوتا ہے جائیں گے اللہ اللہ کر کے اگست کے دوسرے ہفتے ہمیں میسج ملا کہ ہم شارع فیصل پر شادی ہال ہے ٹیولپ لان میں صبح دس بجے پہنچیں۔

میں اپنے بیٹے ثاقب کے ساتھ وہاں گئی بہت زبردست انتظام تھا ایک سائیڈ پر خواتین دوسری جانب مرد حضرات تھے۔ مفتی صاحب کو بلایا ہوا تھا۔ انہوں نے دو گھنٹے تک ہمیں تفصیل سے تمام معلومات فراہم کیں۔ پھر سب نے نماز ظہر ادا کی اس کے بعد تمام حجاج کرام کو زبردست قسم کا کھانا اور کولڈ ڈرنکس دی ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم ولیمہ کی دعوت میں آئے ہیں زبردست اہتمام تھا اس کے بعد اناؤنسمنٹ ہوئی کہ تمام حاجی صاحبان تشریف رکھیں کیپٹن شاہد اعجاز صاحب اپنی دبنگ آواز میں نام لے کر بلاتے تھے ہر خاتون کو حج کا سامان اس کے محرم کے ہاتھ میں دیتے تھے۔ جس میں کپڑے رکھنے کا بیگ اس میں احرام بیلٹ پانی کی بوتل کاغذات رکھنے کا بیگ اور دعاؤں کی کتابیں تھیں ہم سب خوشی خوشی ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے اپنے گھروں کو چل دیے گھر آ کر میں نے دو نفل نماز شکرانہ ادا کیے۔ عذرا ثاقب کی بیوی نے ہمیں مبارکباد دی ہم نے بتایا سات ستمبر کو ہماری روانگی ہے سن کر جہاں وہ خوش ہوئیں کچھ افسردہ بھی ہوئیں کیونکہ 2 چھوٹے بچے ہیں بڑا بیٹا ارمان جو سات سال کا ہے بیمار رہتا ہے۔ اسے کھانسی سانس کی پرابلم ہے۔ ارمان پہلے بولا۔

''دادو جان مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔'' میں نے کہا۔

''بیٹا آپ نہیں جا سکتے۔'' اس پر کہنے لگا۔

''آپ وہاں جا کر اللہ میاں سے میرے لیے دعا کرنا اللہ میاں مجھے بالکل ٹھیک کر دیں۔'' یہ سن کر میرے آنسو نکل پڑے معصوم بچہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں میرے ذریعہ دعا کروا رہا ہے۔

قارئین کرام! آپ سب میرے پوتے اور بیٹے طاہر کی مکمل صحت یابی کی دعا کیجیے جزاک اللہ! ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ دن گن گن کے آخر سات ستمبر آ ہی گیا سب عزیز و اقارب ملنے کے لیے آئے میری بیٹی ہما بیٹا نادر پوتے معاذ تیمور' بڑا بیٹا طاہر' بہو رفعت اور پوتی سارہ گل ہمیں سی آف کرنے ایئرپورٹ تک آئے۔ ہم رات ساڑھے دس بجے ایمریٹس ایئرلائنز سے دبئی کے لیے روانہ ہوئے دبئی میں چار گھنٹے اسٹے تھا وہاں سے صبح پانچ بجے ہم پھر ایمریٹس ایئرلائنز کے ذریعے جدہ پہنچ گئے جدہ سے بذریعہ بس ہم شام پانچ بجے مکہ مکرمہ الایمان ہوٹل پہنچے کس طرح بس سے اس مقدس شہر کا نظارہ اپنی گناہ گار آنکھوں میں سموتی رہی ہوٹل میں پہنچنے والے ہم آخری گیارہ افراد تھے نو بزرگ ایک میرا ثاقب اور میں ہمارا شاندار استقبال کیا گیا۔ حاجی صاحب' حاجی یونس صاحب عبدالخالق صاحب نے خوش آمدید کہا اور فوری طور پر کھانے اور چائے کا آرڈر دیا۔ ہمیں ہمارے رومز میں پہنچایا ہم غسل اور کھانے سے فارغ ہوتے ہی حرم شریف جا پہنچے ہوٹل سے حرم پاک کا زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

اس لیے ہم پندرہ سے بیس منٹ میں حرم شریف پہنچ گئے۔ سبحان اللہ کیا خدا کی شان کیا نور و جلال میں تو مبہوت تھی۔ خانہ کعبہ پر نظر پڑتے ہی میں ساکت ہو گئی۔ پھر درود شریف کا ورد

کر کے دعا کی اے خدائے ذوالجلال میری تمام دعائیں جس جس کے لیے کروں قبول فرمانا آمین۔ اس کے بعد طواف کیا طواف کے دوران یہ ہی کلمات زبان پر آ رہے تھے کعبہ کی رونق کا منظر اللہ اکبر اللہ اکبر.....

ہم مکہ مکرمہ غالباً دس بارہ دن رہے ہم ہر روز خانہ کعبہ کی زیارت کرتے تھے پھر ہم سب کو عزیزیہ لے گئے عزیزیہ بلڈنگ میں اچھی رہائش بہترین ناشتہ اور کھانا ملتا تھا۔ وہاں سے 12 اکتوبر کو منیٰ کے لیے روانہ ہوئے پانچ دن وہاں رہے حج اکبر تھا سب لوگ بے حد خوش تھے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے سب ہی بہت خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو جو کہ ایک روپیہ بھی نہ خرچ کر سکتے تھے کس طرح حج اکبر جیسے عظیم فرض کی سعادت نصیب فرمائی لاکھ لاکھ شکر ہے احسان ہے اُس پروردگار کا ہماری تو استطاعت ہی نہیں تھی اور تا حیات دعا گو رہوں گی امن فاؤنڈیشن کے ٹرسٹی جناب عارف نقوی ان کے تمام اہل و عیال کے لیے اللہ رب العزت ان سب کو جزائے عظیم عطا فرمائے ان کے تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے آمین ثم آمین۔ ایک بات یاد آئی میدان عرفات میں دوران عبادت مجھے غنودگی ہوئی میں سو جاتی تب میں نے اللہ پاک سے دعا کی۔

''اے پروردگار مجھے کیوں بلایا تھا جبکہ میں تیری عبادت نہیں کر پا رہی ہوں آپ یقین کیجیے قارئین کرام کہ پانچ منٹ کے بعد ہی میں بالکل فریش تھی۔ میں وہاں کافی بیمار تھی وہاں پر تمام حاجی صاحبان ہی بیمار ہوئے ہیں مگر میں تو شوگر بلڈ پریشر اور ہارٹ پیشنٹ ہوں دوسری دعا کی کہ میں نے اللہ پاک مجھے مکہ مدینہ کی بارش دکھا تیرے رحمتوں والے شہر کی بارش دیکھنا چاہتی ہوں یقین کیجیے یہ دعا بھی اللہ پاک نے قبول فرمائی مکہ معظمہ کی بارش اولے مدینہ پاک کی بارش منیٰ کی رحمتوں سے بھرپور زبردست بارش' اللہ پاک نے دکھائی کس زبان سے شکر ادا کروں اس ذات باری کا آخر میں ریجنیل پرائیویٹ لمیٹڈ کے تمام ارکین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور اتنی بہترین کارکردگی پر سلام پیش کرتی ہوں ہاں جب خانہ کعبہ میں الوداعی طواف کے بعد خانہ کعبہ شریف کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھی نوافل کے بعد دعا کر رہی تھی میرا دل آنے کو دل نہیں کرتا تھا وہ منظر اب بھی آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ ایسا منظر جنت نظر آ رہی تھی نور کی بارش ہو رہی تھی چاروں اطراف نور ہی نور اتر رہا تھا اور وہاں کی رونق دیکھ دیکھ کر میں ہر تھوڑی دیر بعد مشہور نعت کے اشعار کعبہ کی رونق کعبہ کا منظر اللہ اکبر اللہ اکبر دہراتی آنکھوں سے اشکوں کی برسات جاری تھی۔ جب صبح وہاں سے واپسی ہوئی تو ہار ہار مڑ کے جب تک خانہ کعبہ نظر آتا رہا دیکھتی رہی اسی طرح جب روضہ پاک ﷺ سے رخصت ہوئی تو آنسوؤں کے ساتھ دل میں بیٹھا درد تھا کہ پھر آپ کے قدموں میں آنا نصیب ہوگا کہ نہیں اللہ پاک سے دعا گو ہوں سب کو حج و عمرہ کی سعادت نصیب فرمائے آمین اور مجھے بھی دوبارہ اپنے در مبارک پر بلائے۔ آمین ثم آمین۔ آخر میں پاکستان ڈسپنسری اور اسٹاف کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی با اخلاق اسٹاف ہے بہت توجہ سے مریض کو دیکھتے ہیں خاص طور پر کمپاؤنڈر ڈاکٹر عظمیٰ کا جواب نہیں اللہ کریم خوش رکھے آمین۔

☆☆.....☆☆

عورت پن کی بلی

کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا
اک اور گناہ کرلوں کہ توبہ کرلوں

وہ عورت تھی مجسم محبت مگر حسد نے اس کو انسانیت کے معیار سے بھی گرا دیا بچوں کی بلی دیتے دیتے وہ اپنے عورت پن کا قتل کر گئی.....

عمران مظہر

قبرستان کی ہولناکی کو آدھی رات کی سیاہی تھا تو صرف رقیہ کی بے ترتیب ہوتی ہوئی دھڑکن مزید بڑھا رہی تھی۔ ایسے میں کچھ سنائی دے رہا کی دھک دھک' چاند بھی آج ہونے والے گناہ

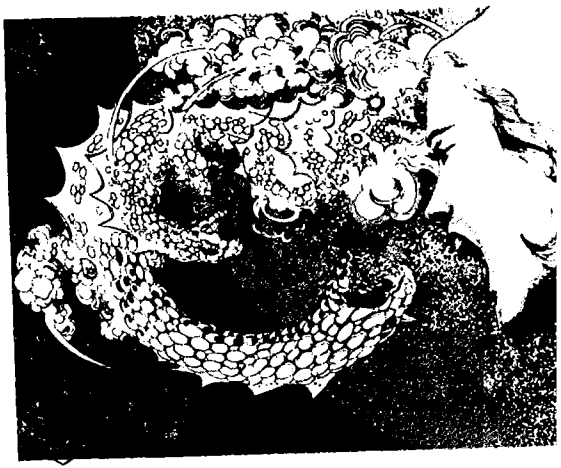

کے خوف سے چھپ گیا تھا۔ کہیں دور کوئی جھینگر بین کر کے کسی مسیحا کو آواز دیتے تھے کہ روک لو گناہ کو روک لو۔

قبرستان کے عین درمیان میں چھوٹا سا گڑھا کھودے رقیہ کی ساری توجہ اسی پر مرکوز تھی اُس کی اپنی حالت بھی اس گڑھے جیسی تھی کھلے بکھرے بال اُدھ ننگی دوپٹے سے بے نیاز ماتھے پر سندور کا تلک لگائے وہ شیطان کو بھی شرما رہی تھی۔ اُس کے عین سامنے ایک نومولود اپنی بے بسی اور انجام سے بے خبر میٹھی نیند میں فرشتوں کے ساتھ جھول رہا تھا۔

چندن اور کافور کی مہک نے ماحول کے سینے کو جیسے گندا کر دیا تھا۔ اُس کے سامنے دہکتے کوئلوں کا ڈھیر اپنی ناقدری پر غصے سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ رقیہ نے آنکھیں بند کیں اور ہندوؤں کے سے انداز میں ہاتھ باندھ کر دھیمی آواز میں تیز تیز کوئی جاپ کرنے لگی۔ وقفے وقفے سے وہ دہکتے کوئلوں پر چندن' کافور اور سندور چھڑک دیتی۔ کوئی بیس منٹ ہوئے تھے کہ سوئی ہوئی ہوا میں جیسے بھونچال آ گیا تھا۔

کتوں کے بھونکنے کی آواز کسی ڈھول کے زور زور سے پیٹے جانے کی طرح چاروں اطراف میں زہر پھیلا رہی تھی۔ رقیہ نے جاپ ختم کرنے کے بعد ساتھ پڑے تھیلے سے ایک چھوٹی سی مورتی نکالی اور سامنے رکھنے کے بعد ہاتھ باندھ کر جیسے اُسے سلام کیا۔

پھر اُس نے سوئے ہوئے نومولود کے کپڑے آہستہ آہستہ اتارے اور انہیں دہکتے کوئلوں پر ڈال دیا۔

دہکتے کوئلے مستی سے ناچنے لگے۔ اُس نے نومولود کو اٹھایا اور اپنی چھاتی سے لگا لیا لیکن شاید نومولود کو اپنے حلال جسم میں حرام رزق قبول نہیں تھا۔ وہ میٹھی نیند سویا رہا۔

رقیہ کو پہلے غصہ آیا پھر وہ طنزیہ مسکرائی۔ ماتھے پر لگے سندور کے تلک کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے رگڑ کر اُس نے نومولود کی پیشانی پر ملا تھا اور پھر زور سے چیختے ہوئے معصوم جسم کو دہکتے کوئلوں پر ڈال دیا۔ ایک معصوم سی دلخراش چیخ بلند ہوئی اور جیسے صدیوں کی بھوکی آگ حلال رزق ملنے پر تڑتڑانے لگی۔ جب نومولود کا وجود راکھ بننے کے قریب ہوا تو اس نے لات مار کر دہکتے کوئلوں سمیت اُسے گڑھے میں دھکیل دیا اور اوپر مٹی ڈالنے لگی۔

☆......☆......☆

انعم کو آدھی رات کو پیٹ میں شدید درد شروع ہوا تھا۔ اُس کا ساتواں مہینہ چل رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ اُس کا شوہر زاہد اُسے اسپتال تک لے جاتا اُس کے پیٹ سے خون بھل بھل کر گرنے لگا۔ وہ جان کنی کے عالم سے گزرنے لگی اور بے ہوش ہو گئی۔ زاہد اُس کی خراب ہوتی حالت دیکھ کر پریشان ہو اٹھا تھا۔

وہ کسی طرح اُسے اسپتال تک لے آیا۔ انعم کو جب ہوش آیا تو اُس کی ممتا کی دنیا راکھ ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر رابعہ اِس طرح بچے کے ضائع ہونے پر حیران تھی۔ ایسا کیس اِس سے پہلے انہوں نے کبھی ڈیل نہیں کیا تھا۔ کوئی خاص وجہ سامنے نہیں آئی تھی اور کوکھ میں پلتا وجود خون بن کر جنت کی طرف پرواز کر گیا تھا۔ بقول ڈاکٹر رابعہ انعم اب کبھی بھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

رقیہ اور انعم آپس میں جیٹھانی دیورانی تھیں۔ دونوں کے اپنے الگ الگ گھر تھے۔ رقیہ اکیلی رہتی تھی۔ اُس کے شوہر خالد پچھلے کئی سالوں سے

سعودی عرب میں کام کر رہے تھے جبکہ انعم کے شوہر زاہد نجی بینک میں کام کرتے تھے۔ انعم تعلیم یافتہ لڑکی تھی جبکہ رقیہ لوئر مڈل کلاس گھرانے کی ایک اَن پڑھ عورت تھی۔ شعور کا تعلق تعلیم سے شاید اتنا نہیں ہوتا جتنا تربیت سے' رقیہ کی تربیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کا بچپن اور لڑکپن جاہلانہ طرز زندگی میں گزرا تھا۔

وہ سمجھ دار تو ہرگز نہیں تھی۔ شادی کے چند ہی ماہ میں خالد کو اُس کی بے وقوفیوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اس سے اتنا بے زار رہنے لگا کہ اُس نے ملک ہی چھوڑ دیا۔ شادی کے دوسرے سال ہی رقیہ کو علم ہوا کہ وہ بانجھ ہے کچھ عرصہ تو وہ روتی دھوتی رہی۔ پھر وہ پیروں فقیروں کے چکر کاٹنے لگی۔ دنیا جہان کے دم تعویذ اُس نے استعمال کر کے دیکھ لیے تھے۔ وہ اولاد کے لیے ترسنے اور تڑپنے لگی۔

اُس کی تڑپ دن بدن دیوانگی بنتی جا رہی تھی۔ ایک طرف بے اولادی دوسری طرف شوہر کی دوری اور بے اعتنائی وہ پاگل سی ہو جاتی اور جب انعم کو ماں بننے کی نوید ملی تو وہ جیسے ذہنی طور پر مفلوج ہو گئی۔ زاہد جب انعم کے نخرے اٹھاتا اور انعم کے گھر والے اور آس پڑوس والے جب اُس کی ناز برداریاں کرتے تو رقیہ سلگ جاتی۔ حسد کا پھندا دن بدن اُس کی گردن کے گرد کستا جا رہا تھا۔ اُسے سانس لینا مشکل ہو گیا۔

وہ تب بنگالی مسیح کے آستانے پر آ پہنچی۔ اس کی فریاد یہ تھی کہ انعم کا بچہ ضائع ہو جائے اور وہ پھر کبھی ماں نہ بن سکے بنگالی مسیح نے اُسے پہلی اور آخری مرتبہ سمجھایا تھا کہ یہ کام خطرناک ہے۔ اس کے نتائج کچھ بھی ہو سکتے تھے لیکن جب عقل پر گرہیں پڑی ہوں تو صحیح غلط کی سوچ دم توڑ دیتی ہے۔ رقیہ ہر حد تک جانے کے لیے تیار تھی۔ وہ اس حد تک گر چکی تھی کہ اپنے مذہب کو داؤ پر لگانے کے لیے وہ تیار ہو گئی۔ انعم کی کوکھ اجاڑنے لیے اُس نے ایک اور ماں کی گود بھی سونی کی تھی۔ وہ کئی اسپتالوں اور میٹرنٹی ہومز میں پھری اور پھر ایک اسپتال سے اُسے ایک نومولود مل گیا جسے اُس نے نرس کو بھاری قیمت دے کر چرایا تھا۔ پھر بنگالی مسیح کے کہے کالے عمل کے مطابق مہینے کی پہلی جمعرات کو اُس نے اس گناہ کو سرانجام دیا تھا۔ اس گناہ کی سوچ اور عمل کے ساتھ ہی وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت کو بھی جیسے بیچ ڈالا تھا۔

انعم کا بچہ کیا ضائع ہوا وہ بالکل مرجھا کر رہ گئی۔ کوئی تسلی اُسے امید نہیں بخش سکتی تھی۔ رقیہ کو اُسے اس حالت میں دیکھ کر جیسے سکون ملا تھا۔ وہ اتنی گری ہوئی تھی کہ اُس نے انعم کے غم کو خوشی سمجھ کر منایا تھا۔ وہ انعم کے ساتھ بیٹھ کر اُس کی دلجوئی کرتی' تسلیاں دیتی اور اُس کی پیٹھ پیچھے خوش ہوتی۔ حسد کا ناگ ٹک کر نہیں بیٹھتا وہ کلبلاتا رہتا ہے۔ رقیہ کا حسد انعم تک محدود نہ رہا۔ اُس کی اپنی بہن دوسری بار امید سے ہوئی تو اُس نے پھر یہ گھناؤنا کھیل کھیلا' شیطان ہر گناہ میں لذت کے کٹورے بھر بھر کے انسان کو ہکاوے دیتا ہے۔ رقیہ کو بھی اب حسد سے زیادہ اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔ اس لیے جب اُس کی پڑوسن کو بچے کی امید ہوئی تو اِس بار یہ گندا کھیل جیسے دلچسپی کے لیے کھیلا گیا۔ وہ اخلاقی طور پر پست ہو چکی تھی وہ ذہنی مریضہ بن گئی تھی۔ تین کوکھیں اجاڑنے کے لیے اُس نے چھ ماؤں کی گودیں اجاڑی تھیں۔ وہ خود شیطان تھی پر شیطان کو بھی ایک حد رحمان نے دی ہے۔ اس حد کو شیطان بھی پار نہیں کر سکتا۔

رقیہ کے بھائی افضل کی بیوی آسیہ امید سے ہوئی تو رقیہ کے ذہن میں پھر کیڑے سے رینگنے لگے۔ وہ پھر بنگالی مسیح کے پاس جا پہنچی۔ اس بار بھی بنگالی مسیح نے اُسے سمجھایا کہ یہ شیطانی عمل ایک بار کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ وہ تین بار یہ عمل دہرا چکی تھی اور اب چوتھی بار اُس کے لیے رسک ہوسکتا تھا۔ لیکن اس بار بھی رقیہ نے بنگالی مسیح کو بھاری رقم دے کر خاموش کر دیا۔ ستمبر کی پہلی جمعرات کو آدھی رات کو رقیہ اپنے شیطانی کام کو سرانجام دیا ہی چاہتی تھی جب ایک بزرگ کی نظر اُس پر پڑی تھی۔ باریش بزرگ قبرستان سے کچھ ہی فاصلے پر بنی مسجد میں تبلیغی جماعت کے ساتھ دورے پر آئے ہوئے تھے۔ تہجد کی نیت سے اٹھے تھے کہ دل میں آیا قبرستان جا کر دعا کر آئیں۔ بزرگ نے رقیہ کو ایک نومولود کو کوئلوں پر پھینکتے دیکھا تو وہیں سے ضعیف آواز میں چلائے تھے۔ آدھی رات کو قبرستان کے دل چیر دینے والے سناٹے میں جب رقیہ نے ایک بارعب ضعیف آواز سنی تو پہلی بار اُس کا دل اور ہاتھ کانپے بچہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹا اور دہکتے کوئلوں میں گرنے کی بجائے سیدھا گڑھے میں جا گرا۔ اُس کی چیخیں قبرستان کے سناٹے کو چیرنے لگیں۔ عمل کے ادھورا رہ جانے کا اثر تھا شاید کہ رقیہ کے گال پر کسی نے زور سے تھپڑ مارا تھا۔ رقیہ ڈر کے بھاگ کھڑی ہوئی بزرگ تیزی سے گڑھے کے قریب آئے اور توبہ استغفار کرتے کرتے نومولود کو گڑھے سے نکال کر ساتھ لے گئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی یا بزرگ کی بزرگی کہ وہ بچہ جس طرح اپنی ماں تک پہنچا وہ ایک الگ کہانی ہے۔

ڈری سہمی رقیہ پھولتی سانسیں لیے آدھی رات کو سیدھا بنگالی مسیح کے پاس پہنچی تھی۔ عمل کے

التجا

اے میرے مالک!
اے میرے مولا!
جنہیں تیری رضا ملتی ہے
اُنہی کی خاطر
مجھے بھی اپنی رحمتوں کی
ردا میں رکھنا!
کیا ہے واجب جو تو نے سب پر
اُسی دائرہ شرم و حیا میں رکھنا
ہیں بہت زیادہ خطائیں میری
ہیں جن پہ جاری عطائیں تیری
اُنہی کے صدقے معاف کرنا سب سزائیں میری
میرے عمل کے سیاہ ہیں دفتر
رحیم ہے تو مجھ پر کرم کر
تیرے سامنے کیسے ہوں گی میں حاضر
رکھنا بھرم میرا بروز محشر
تجھ سے ہیں یہ التجائیں میری
بخش دینا سب خطائیں میری

زمر نعیم اجر

نشانہ باز

ایک ماہر نشانہ باز کی شہرت سن کر ایک اخباری نمائندہ اُس سے انٹرویو کرنے گیا۔ کمرے کی دیواروں پر بہت سی آنکھیں بنی ہوئی تھیں اور ہر آنکھ پر صحیح نشانہ لگا ہوا تھا۔ اخباری نمائندے نے نشانوں سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”آخر آپ اتنا اچھا نشانہ کیسے لگا لیتے ہیں؟“

”یہ کون سا مشکل کام ہے۔ پہلے ہم نشانہ لگاتے ہیں اور پھر اُس پر آنکھ بنا دیتے ہیں۔“ نشانہ باز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایم افضل خان۔ مانسہرہ

ناکام ہونے پر بنگالی مسیح نے اُسے سخت سنائی تھیں اور اُسے اگلی بار اپنے پاس آنے سے ذرا دھمکا کر منع کیا تھا۔ اگلی بار وہ کیا جاتی اُس شیطان کے پاس کہ وہ شیطان خود ہی وہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور بھاگ گیا تھا۔ کوئی مہینہ بھر ہی گزرا تھا کہ رقیہ کی حالت عجیب سی ہونے لگی۔ اُس کا دل بے چین سا رہنے لگا۔ کبھی کبھار اُس کا دم سا گھٹنے لگتا۔ وہ اکثر بے وجہ رونے لگ جاتی اور پھر روئے جاتی رات رات بھر وہ جاگتی رہتی لیکن اُسے نیند نہ آتی۔ اُس کے جسم پر کھجلی سی شروع ہو جاتی' وہ پاگلوں کی طرح بدن کھجلاتے کھجلاتے تھک جاتی پر اُسے آرام نہ آتا' کچھ عرصہ بعد اُس کے جسم پر پھوڑے نکلنا شروع ہو گئے۔ پھوڑے پیپ سے بھرنے لگے اور پھر ان پھوڑوں کے اندر کیڑے پیدا ہونے لگے۔ عجیب بات تھی کہ اُس کے ساتھ یہ سب ہو رہا تھا لیکن وہ علاج کی غرض سے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتی تھی۔ اُس کا دیور' دیورانی اور آس پاس کے لوگ اُسے سمجھا سمجھا کر تھک جاتے لیکن جیسے وہ سنتی ہی نہیں تھی۔ وہ بولتے رہتے اور رقیہ گم سم سی انہیں تکتی رہتی۔ لوگوں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا پہلے وہ کبھی کبھار نماز پڑھ لیتی تھی لیکن اب اُسے سجدے کا خیال ہی نہ آتا۔ توبہ کا خیال بھی نہ آتا۔ اُس سے توبہ دعا دواسب کی توفیق چھین لی گئی تھی۔ اُس کی حسیات سو چکی تھیں۔ اُسے یہ احساس ہی نہ ہوتا کہ وہ کسی گناہ کی مرتکب ہوئی ہے۔ اُس کا جسم جگہ جگہ سے گلنے لگ گیا۔ وہ اب اکثر انعم' اپنی بھابی اور پڑوسن کے پاس جاتی اور فخر سے انہیں بتا کر ہنستی جاتی کہ اُس نے ان کی کوکھ اجاڑی ہے۔ جانے خدا کی کیا مصلحت تھی کہ اُس کی خراب حالت اور لبوں سے نکلی سچائی کو وہ لوگ تسلیم نہ کرتے۔ اُسے پاگل سمجھتے بغیر دوپٹے کے اَدھ ننگی وہ گلیوں بازاروں میں پھرا کرتی بھوک پیاس سردی گرمی ہر چیز سے جیسے وہ بے نیاز ہو چکی تھی۔ اُس کے شوہر کو خبر کر دی تھی لیکن وہ تب بھی واپس نہیں آیا تھا۔ پھر رقیہ کہیں کھو گئی۔ کسی کو اُس کی خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں گئی۔ کوئی سال بھر بعد شہر سے قدرے باہر ایک گندے پانی کے جوہڑ کے قریب پڑے کچرے کے ڈھیر پر اُس کی آدھی ادھوری لاش ملی تھی۔ گلی سڑی اور جانوروں کی خوراک بنی وہ لاش جانے کب سے وہاں پڑی تھی۔ یہ بھی انسانیت کی بے حسی تھی کہ اُس کی لاش کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا نہ اُسے کفن نصیب ہوا۔ یہ انجام تھا اُس عورت کا جس نے اللہ کی مصلحت پر صبر سے کام لینے کی بجائے حسد اور شیطان کی پیروی کی اس حد تک کہ اپنے مذہب دنیا آخرت سب کو تیاگ دیا۔ کاش انسان وقت گزرنے سے پہلے سنبھل جائے۔

☆☆......☆☆

آج کا شاعر

شگفتہ شفیق

جولوگ پرانے گیت نظمیں اور غزلیں سننے کے رسیا ہیں انہوں نے یقیناً اپنے زمانے کے مشہور گلوکار طلعت محمود کی سریلی اور منفرد آواز میں یہ نظم ضرور سنی ہوگی جس کا ایک مصرعہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔

اس نظم کا عنوان 'آوارہ' ہے اور یہ نظم مجاز لکھنوی کی تخلیق ہے۔ کچھ ادب دوستوں کا کہنا ہے کہ اگر مجاز صرف یہی ایک نظم لکھ جاتے اور مزید کچھ نہ لکھتے تو بھی اردو ادب میں اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔

ممکن ہے اس تعریف میں کچھ مبالغہ ہو' لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ مجاز نے اس نظم کے علاوہ بھی متعدد بہترین نظمیں لکھی ہیں۔ آپ کے حافظے کو تازہ کرنے کے لیے ہم اُن کی ایک نظم کے چند مصرعے سناتے ہیں

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

کچھ یاد آیا سنی ہے نا یہ نظم؟ جی ہاں گلوکار محمد رفیع نے مجاز کی یہ مشہور نظم اپنے مخصوص انداز میں گائی ہے۔

نظموں کے علاوہ مجاز نے غزلوں میں بھی اپنا منفرد 'آہنگ' برقرار رکھا ہے جو صرف انہی کا حصہ ہے۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ انہوں نے قطعات اور چند گیت بھی لکھے ہیں۔

مجاز' فیض احمد فیض' ن م راشد اور مخدوم محی الدین کے ہم عصروں میں سے ہیں۔ یقیناً اسے اردو ادب کی بدنصیبی ہی کہا جاسکتا ہے کہ مجاز زیادہ نہ جی سکے۔ وہ 1911ء میں پیدا ہوئے اور 1955ء میں انتقال کر گئے' گویا صرف چوالیس سال کی عمر میں' کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہ جاتے تو شاید فیض احمد فیض سے بھی بڑے شاعر ہوتے۔ اس حقیقت کو سبھی تسلیم کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ مجاز اپنے عہد کا کریز تھے۔ عصمت چغتائی نے مجاز پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ ہمارے زمانے کی نوجوان لڑکیاں مجاز کے شعری مجموعے 'آہنگ' کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں کسی بھی شاعر کو اتنی کم عمری میں اس قدر شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ مجاز' اٹھارہ بیس سال ہی کی عمر میں ہندوستان گیر شہرت کے مالک بن چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اداکاروں کی بجائے شاعر' عوام کے ہیرو ہوتے تھے۔

اردو ادب کا کوئی بھی اہم اہل علم ایسا نہیں جس نے مجاز کی شاعری کو خراج عقیدت پیش نہ کیا ہو۔ یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں کہ اُن تمام اہلِ قلم میں سے صرف کچھ حضرات ہی کی آراء یہاں رقم کی جاسکیں۔ اس ضمن میں 'مجاز ایک آہنگ' کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے جسے ماہنامہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں مجاز پر لکھے جانے والے تمام مضامین یک جا کر دیے گئے ہیں۔ بہ قول بابا اردو مولوی عبدالحق اس کتاب کو مجاز کا انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔

مجاز کے شعر میں جو سرمستی اور کیف و سرور ہے اُسے جوش ملیح آبادی نے بھی ایک خوب صورت نظم لکھ کر خراج محبت پیش کیا ہے۔ جوش صاحب نے مجاز کو 'ترانہ بار' لکھا ہے اور خوب لکھا ہے اے مجاز اے ترانہ بار مجاز..... مجاز کا اسلوب شعر یقیناً اپنے عہد کے تمام شعرا سے مختلف' منفرد اور متاثر کن ہے۔ مجاز بلا کے ذہین اور شوخ تھے۔ اسی سبب بے شمار لطائف وظرائف اُن کی ذات سے منسوب ہیں۔

لکھنو کے ایک قصبے رودلی میں وہ پیدا ہوئے۔ مگر اُن کی زندگی کا زیادہ وقت لکھنو شہر اور پھر علی گڑھ میں گزرا۔ علی گڑھ سے اپنے قلبی تعلق ہی کے سبب انہوں نے ایک نظم 'نذرِ علی گڑھ' بھی لکھی۔ یہ نظم انہوں نے 1932ء میں لکھی تھی اور یہ بھی اُن کی بہترین نظموں میں شامل ہے۔

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سُنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن' میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

مجاز کی یہ نظم آج بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ کا 'ترانہ' ہے۔

مجاز کا پہلا شعری مجموعہ 'شب تاب' کے نام سے شائع ہوا تھا جو اب تقریباً نایاب ہے' لیکن جب اُن کا دوسرا شعری مجموعہ 'آہنگ' شائع ہوا تو 'شب تاب' میں شامل ہونے والا کلام بھی اس میں شامل کرلیا گیا۔ یوں گویا اُن کی تمام شاعری یک جا محفوظ ہوگئی۔

'آہنگ' کے پہلے ایڈیشن میں فیض احمد فیض کا دیباچہ شامل نہیں تھا۔

مگر جب مجاز ہی کی زندگی میں 'آہنگ' کا دوسرا ایڈیشن 1952ء میں شائع ہوا تو اِس کا دیباچہ فیض احمد فیض نے لکھا۔ اپنے شعری مجموعے 'آہنگ' کا انتساب مجاز نے اپنے عہد کے چار اہم شعراء کے نام کیا ہے۔ فیض اور جذبی کے نام جو میرے دل و جگر ہیں' سردار (جعفری) اور مخدوم (محی الدین) کے نام جو میرے دست و بازو ہیں۔ اسی مجموعے کا تیسرا ایڈیشن 1956ء میں مجاز کی وفات کے بعد شائع ہوا جس کے آخری چند صفحات مجاز کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل ہیں۔ جس عہد میں مجاز کی شاعری کو انتہائی مقبولیت حاصل ہوئی وہ عہد ترقی پسند تحریک کے عروج کا تھا۔ مجاز ہمیں اسی کارواں کی صفِ اول میں نظر آتے ہیں مگر اپنے ہم عصر انقلابی شعراء سے الگ' نمایاں اور منفرد فیض احمد فیض نے "آہنگ" کے دیباچے میں اسی نشان دہی اِن الفاظ میں کی ہے۔

مجاز کے شعر میں جھنکن نہیں' سرمستی ہے' اُداسی نہیں' سرخوشی ہے۔ مجاز کی انقلابیت' عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر' انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں' للکارتے ہیں' سینہ کوٹتے ہیں' انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ اُن کے ذہن میں آمد انقلاب' طوفان برق و رعد سے مرکب ہے' نغمۂ بہار اور رنگینی بہار سے عبارت نہیں۔"

فیض صاحب نے اپنے اسی دیباچے میں مجاز کی شاعری کے متعلق جو تفہیم کی ہے' ہم اسی پر یہ مضمون ختم کرتے ہیں۔ فیض صاحب نے لکھا ہے۔

"مجاز بنیادی طور اور طبعاً غنائی شاعر ہے' اس کے کلام میں خطیب کے نعلق کی کڑک نہیں' باغی کے دل کی آگ نہیں' نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

فیض صاحب کے دیباچے کی آخری سطور یہ ہیں۔

"مجاز' انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں' انقلاب کا مطرب ہے۔ اس کے نغمے میں برسات کے دن کی سی سکوں بخش خنکی ہے اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثر آفرینی......!

☆☆......☆☆

دہشت ناک رات

صحرا نہیں یہ شہر ہے اور بھی لوگ ہیں یہاں
چاروں طرف مکان ہیں اتنا ہے ہوش کب اُسے

ارواح خبیثہ مختلف اشکال میں آ کر انسان کو ڈراتی ہیں خادم حسین بھی ایسی ہی ایک بدروح کا اس دہشت ناک رات شکار ہونے چلا تھا۔

مقصود احمد بلوچ

خادم حسین اپنے گھر کی گاڑی چلانے کے لیے محنت مزدوری کرتا تھا۔ وہ ایک بہت ہی خوب صورت اور بہادر جوان تھا۔ محنت مزدوری کرنے کے لیے وہ صبح سویرے شہر چلا جاتا تھا اور پھر رات گئے واپس لوٹتا' اسی طرح زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے۔

ایک دن معمول کے مطابق خادم حسین کام پر گیا ہوا تھا۔ اس دن جمعرات تھی اور جمعرات والے دن تمام مزدوروں کو اُن کی ایک ہفتے کی محنت کے پیسے دیے جاتے تھے۔ باقی مزدوروں کی طرح اس دن خادم حسین کو بھی پورے ہفتے کے پیسے ملے۔ وہ پیسے لے کر خوشی خوشی بازار چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ اِن پیسوں سے اپنے گھر کے لیے راشن لے لیتا ہوں۔

اور پھر اس کے بعد گھر چلا جاؤں گا۔ راشن وغیرہ لیتے ہوئے خادم حسین کو شہر میں کافی دیر ہوگئی۔ اس نے جلدی جلدی وہاں سے سامان اٹھایا اور فوراً اپنے گاؤں جانے والی بس کے اڈے پر پہنچ گیا۔ لیکن کافی دیر ہونے کی وجہ سے اس کے گاؤں جانے والی بس چلی گئی تھی۔

اب خادم حسین پریشان حال اڈے میں کھڑا کسی ایسی سواری کا انتظار کر رہا تھا جو اسے فوراً سے پہلے گھر پہنچا دے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اُسے دور سے آتی ہوئی ایک ویگن نظر آئی۔ خادم حسین نے ویگن کو اشارہ دے کر روکا اور اُسے بتایا کہ میں نے فلاں گاؤں میں جانا ہے کیا آپ لوگ مجھے لے جاؤ گے۔ ویگن کے ڈرائیور نے کہا۔

''بھائی آپ بیٹھ جاؤ ہم نے آپ کے گاؤں کے ساتھ والے گاؤں میں جانا ہے راستے میں آپ کو اُتار دیں گے۔''

بس ڈرائیور کے منہ سے یہ بات سنتے ہی اگلے لمحے خادم حسین ویگن کے اندر بیٹھ چکا تھا۔ پندرہ سے بیس منٹ کی مسافت کے بعد ویگن نے اُسے راستے میں اتار دیا۔

وہاں سے خادم حسین کا گھر کافی دور تھا۔ اُس نے پیدل چلنا شروع کر دیا۔ ہر طرف سیاہ گھپ اندھیرا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور سردی بھی اپنا جلوہ دکھا رہی تھی دور دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

خادم حسین کو پیدل چلتے ہوئے تقریباً دس منٹ ہو گئے تھے اور اس کے اندازے کے مطابق دس منٹ کا راستہ اور تھا' پیدل چلتے چلتے وہ ایک قبرستان میں داخل ہو گیا۔ کیونکہ قبرستان سے گزر کر آگے کچھ فاصلے پر اُس کا گاؤں آتا تھا۔ خادم حسین جونہی قبرستان میں داخل ہوا تو اُسے دور سے آتی ہوئی ایک بکری محسوس ہوئی۔

اُس نے سوچا آدھی رات کا ٹائم ہے یہ کس کی بکری ہے جو قبرستان میں پھر رہی ہے۔ خادم حسین کے ذہن میں ایک خیال آیا اس نے سوچا اُس بکری کو پکڑ کر اپنے گھر لے جاتا ہوں۔

اور صبح ہوتے ہی مسجد میں اعلان کروا دوں گا۔ جس کی ہوگی وہ میرے گھر سے لے جائے گا۔ بس یہی بات سوچ کر اپنے سر سے پگڑی اتاری اور اس کپڑے سے بکری کو گلے سے باندھ لیا اور خود آگے چلنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے چلا تھا کہ اُسے ایسے محسوس ہوا کہ بکری رُک گئی ہے۔

اُس نے جب مڑ کر پیچھے دیکھا تو بکری کی ٹانگوں کی لمبائی تقریباً دس فٹ اونچی ہوگئی تھی۔ خوف کے مارے اتنی سخت سردی میں بھی اُسے پسینہ آنا شروع ہو گیا۔ اور پھر جب اس نے بکری کی آنکھوں کی طرف تکا۔ تو اس وقت وہ بہت ہی زیادہ گھبرا گیا کیونکہ اُس بکری کی آنکھیں آگ کی طرح جل رہی تھیں۔

اب خادم حسین کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ کوئی

بکری وغیرہ نہیں ہے۔

یہ تو کوئی چڑیل ہے یا کوئی جن ہے یہی بات سوچ کر خادم حسین وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ اتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا جیسے دو منٹ میں ہی گھر پہنچ جائے گا۔

بھاگتے ہوئے جب اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سیاہ بالوں والی عورت اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

اور اس کے دانت اتنے لمبے تھے جیسے ابھی وہ اُسے کھا جائے گی۔ جیسے ہی خادم حسین اپنے گاؤں میں داخل ہوا تو پیچھے سے آوازیں آنے لگیں۔

''آج تمہاری قسمت اچھی تھی جو تم بھاگنے میں کامیاب ہوگئے ہو میں تو بہت دن ہوگئے ہیں بھوک سے تڑپ رہی ہوں۔ آج تمہیں کھا کر اپنے پیٹ کی بھوک کو ختم کرتی۔ لیکن افسوس کہ تمہاری قسمت اچھی تھی۔

خادم حسین جب گھر پہنچا تو اس کی بیوی اُسے ایسی حالت میں دیکھ کر ڈر گئی۔ اور پوچھنے لگی۔

''آپ اتنی دیر سے کیوں آئے ہو اور آپ کو کیا ہوا ہے۔''

لیکن خادم حسین کچھ بتائے بغیر چارپائی پر لیٹ گیا۔ پوری رات بخار اور درد کی شدت میں گزری۔

جب صبح ہوئی تو اس نے وہ رات والی مکمل کہانی اپنی بیوی کو سنائی۔ خادم حسین کی بیوی بہت ہی سمجھدار خاتون تھی۔

وہ اس کی بات کو سمجھ گئی کہ رات کے وقت کوئی جن یا چڑیل اس کے پیچھے لگی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ڈر گیا ہے۔ خادم حسین کی بیوی لیضاں مائی اپنے شوہر کو ایک بہت ہی پڑھے لکھے عالم کے پاس لے گئی۔

اور وہ قبرستان والی ساری بات اُسے بتائی جب اس عالم نے فیضاں مائی کی بات سنی تو وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔

تم خوش قسمت ہو جو اس عورت نما آسیب سے محفوظ رہتے بیابانوں' جنگلوں اور قبرستانوں میں یہ بدروحیں اپنا ٹھکانا رکھتی ہیں اور موقع ملتے ہی انسان کے اندر سرایت کر جاتے ہیں کیونکہ انہیں ایک جسم کی ضرورت ہوتی ہے اپنے شیطانی مقاصد پورے کرنے کے لیے تم اللہ کا شکر ادا کرو کہ بچ گئے میں نے بھی ایک بار ایسی ہی صورت حال کا سامنا کیا تھا مگر میں ہر وقت کلام الٰہی کا ورد رکھتا ہوں اس لیے وہ مجھے نقصان نہ پہنچا سکی۔

بہرکیف میں تمہیں حصار دیں لے لوں گا اور ساتھ ہی ایک تعویذ بھی' اس تعویذ کو اپنے دائیں بازو میں باندھ لینا انشاءاللہ اللہ پاک کے کرم سے ایسی بلاؤں سے کبھی آپ کو خوف نہیں آئے گا اس کے باوجود جب کبھی دن کے نائم بھی خادم حسین کا گزر اس قبرستان سے ہوتا تو فوراً اسے وہ چڑیل یاد آجاتی۔

اس کا خیال ذہن میں آتے ہی خادم حسین فوراً درود پاک کا ورد کرنا شروع کر دیتا کیونکہ اللہ پاک کے کلام میں بہت طاقت ہے۔ درود پاک کے پڑھنے سے خادم حسین کا خوف ختم ہوجاتا۔ لازم ہے کہ انسان جب بھی کبھی کسی پرانے کھنڈرات' قبرستان یا اس کے علاوہ کوئی بھی ایسی بھاری جگہ ہو تو وہاں سے گزرتے وقت درود پاک پڑھنا شروع کر دے' میرا یہ ایمان کہ کوئی بھی بلا چڑیل یا کوئی جنات آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

☆☆.....☆☆

خوفناک منظر

زندگی سود و زیاں ٹھہری ہے
ایک نقطے پہ کہاں ٹھہری ہے

راحلہ کم عمر تھی ماں باپ کی لاڈلی تھی مگر موت کے سامنے سب بے بس ہیں وہ جب چاہے جس کو چاہے لے جائے' موت کا وہ منظر جو ہم سب کو دیکھنا ہے جلد یا دیر.....

مدیحہ گل

''راحلہ بیٹی..... اب بس کرو سو جاؤ.....'' جان نے تفکرانہ لہجے میں راحلہ کے سر پر ہاتھ رات کے بارہ بج چکے ہیں۔'' عقب میں امی رکھا۔

’’تھوڑی دیر میں سو جاتی ہوں...... بس ذرا یہ کہانی مکمل ہو جائے۔‘‘ رافعہ نے بال پوائنٹ ہاتھ میں تھامے ہوئے پہلے سر کھجایا اور پھر کہیں دور سے گونجتی ہوئی آواز میں بولی۔

’’تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں...... جب تک افسانہ مکمل نہیں ہو گا تم نے سونا نہیں۔‘‘ اماں نے رافعہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

’’نہیں اماں جان...... آج پکا وعدہ میں لازمی جلدی سو جاؤں گی۔‘‘ رافعہ نے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

’’ٹھیک ہے آج اپنا وعدہ یاد رکھنا۔‘‘ اماں اُسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

کمرے کے کونے میں فلور کشن پر ٹیبل لیمپ فرش پر رکھے بیٹھی رافعہ کے ارد گرد کاغذ کے اوراق بکھیرے تھے۔ ان میں کچھ پرنٹ شدہ کچھ لکھے ہوئے۔ باقی خالی تھے۔

رافعہ کی ماں روزانہ اس کے معمول سے واقف ہونے کے باوجود روزانہ اس کو متنبہ کر کے سونے چلی جاتی تھی۔ اماں کے جانے کے بعد رافعہ نے سر دیوار پر لگا لیا تھا اور اسی دنیا میں کھو گئی جہاں کہانی کی تلاش میں وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

تبھی ایک ہلکی سی آہٹ نے اُسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سامنے کئی غیر واضح چہرے تھے۔

کسی نے سفید چغے تو کسی نے سیاہ چغے پہن رکھے تھے۔ کمرے کی چھت گویا پھٹ گئی تھی اور یہ ہجوم یوں دھیرے دھیرے چلتا ہوا نیچے آیا جیسے ہوا نہیں بلکہ زمین پر چل رہے ہوں۔

کمرہ سفید دھند کی طرح بادل سے بھر رہا تھا۔ کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا‘ تیز روشنی سے رافعہ کی آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ تھا مگر وہ دیکھ نہ سکی۔ پتہ نہیں یہ کون سی مخلوق ہے اور میری طرف کیوں مدھم انداز میں چلی آ رہی ہے۔ خوف کے مارے رافعہ کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔

رافعہ جلدی سے کھڑی ہوئی اور ہجوم کے ساتھ چھوٹے سے راستے سے بھاگی اور اپنے والدین کے کمرے میں گئی مگر کمرہ خالی تھا۔ یقیناً وہ صبح کی سیر کرنے گئے ہوں گے۔

وہ چیختی چلاتی قریبی پارک میں چلی گئی جہاں اس کے والدین صبح سیر کے لیے روزانہ جاتے تھے۔

وہ سرپٹ بھاگتے گھوڑے کی مانند گلی جو کہ سنسان تھی سے نکل کر سڑک پر آ گئی علی الصبح ابھی بازار بند تھا سڑک پر اِکا دُکا لوگ بھی تھے اور وہ خود سڑک کے بیچوں بیچ اتنی رفتار سے بھاگ رہی تھی جتنی رفتار سے وہ بھاگ سکتی تھی۔

بہت سے لوگ اس کے ارد گرد اپنی دھن میں چلے جا رہے تھا۔ اتنی صبح ایک تنہا جوان لڑکی بنا دوپٹے اور جوتوں مدد کے لیے چلاتی ہے مگر کوئی نا سن رہا ہے‘ نا دیکھ رہا ہے۔ کیا سبھی اندھے‘ بہرے ہو گئے ہیں‘ نہیں یہ شاید اُسی مخلوق کی کارستانی ہے۔ رافعہ نے اپنے تئیں اندازہ لگایا۔

وہ اندھا دھند بھاگتی اور چلاتی پارک کے اُس کونے پر آ گئی جہاں اُس کے والدین بینچ پر بیٹھے آپس میں محوِ گفتگو تھے۔ وہ دور سے ہی انہیں دیکھ کر چلائی۔

’’رافعہ کے ابا! رات رافعہ پھر بہت دیر سے سوئی۔‘‘

معذرت

’الماس‘ کی رائٹر شازلی سعید مغل ان دنوں شدید علیل ہیں اسی لیے ’الماس‘ کی قسط لکھنے سے قاصر ہیں‘ انشاء اللہ اگلے ماہ سچی کہانیاں کے صفحات پر پانچویں قسط موجود ہوگی۔ **(شکریہ)**

’’اماں جان...... ابو جی...... گھر میں پتہ نہیں کون سی مخلوق گھس آئی ہے۔‘‘ اب باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔

’’نیک بخت! اُس کو سمجھایا کرو کہ صبح جلدی اٹھ کے نماز پڑھا کرے۔‘‘ ابا فکر مندی سے بولے۔ رافعہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں چلائی۔

’’اماں ابا...... میں کہہ رہی ہوں کہ گھر میں کوئی مخلوق گھس آئی ہے اور وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ آپ سنتے کیوں نہیں؟‘‘

’’میں گھر جا کے اُس کو سمجھاؤں گی...... اب چلیں رافعہ کے ابا......‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

’’میں کہہ رہی ہوں کہ گھر نہ جائیں...... وہاں بہت سے لوگ ہیں۔ وہ آپ کو بھی نقصان پہنچائیں گے۔‘‘ وہ جلدی سے اُن کے آگے آ کے کھڑی ہوئی مگر وہ آرام سے یوں گزرے گویا ہوا تھی اور وہ گزر گئے۔ رافعہ نے آوازیں دیں مگر وہ نہ رُکے‘ وہ اُسی بینچ پر بیٹھ گئی اور بے بسی سے والدین کو جاتا دیکھتی رہی۔

اچانک کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور خوف کے مارے اچھل پڑی۔

’’تم ڈرو نہیں...... میں تم سا ہی ہوں۔‘‘ وہ یہ کہتے ہوئے اُس کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا۔ رافعہ نے سر اُٹھا کے دیکھا تو وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

’’یہ سب کیا ہے‘ اگر اماں ابا کو کچھ ہو گیا تو......‘‘ رافعہ ایک دم سے پھٹ پڑی تھی۔

’’تم فکر نہ کرو...... وہ تمہارے والدین کو کچھ نہیں کہیں گے‘ وہ صرف تمہارے لیے آئے ہیں۔‘‘ وہ آدمی ہلکا سا مگر رنجیدہ سا مسکراتے ہوئے بولا۔

’’یہ سب نا مجھے دیکھ سکتے ہیں‘ نا سن سکتے ہیں اور نا ہی چھو سکتے ہیں‘ آپ یہ سب کچھ کیسے کر سکتے ہیں۔ آپ بھی اُن کا حصہ تو نہیں ہیں۔‘‘ رافعہ نے تشویشناک لہجے میں پوچھا تھا۔

’’نہیں بیٹی...... ہم میں اور اُن میں کچھ مشترک نہیں ہے۔‘‘ پھر چند لمحے توقف کے بعد بولے۔

’’تم وہ سامنے جامن کا درخت دیکھ رہی ہو‘ جس کے نیچے وہ لڑکا گھاس پر لیٹا ہے۔ وہ ٹھنڈی گھاس کا مزا لے رہا ہے۔ دراصل وہ زندہ نہیں ہے وہ بھی میری طرح ہے اور پھر اچانک وہ لڑکا اٹھا اور ایک جانب چل دیا۔

آسمان سے بادلوں کا ہیولہ سا بکھرنے لگا۔ اس کے دوش پر سفید و سیاہ فوج زمین پر اترنے لگی۔ وہ شخص جو بینچ پر ان کے ساتھ بیٹھا تھا اُٹھ کر ہجوم کی طرف چل پڑا۔

’’اب تم بھی اپنے گھر جاؤ...... تمہیں بھی سب سمجھ آ جائے گا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ بھی ہجوم کی طرف چل پڑا تھا۔

رافعہ شکستہ قدموں سے اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی گھر تک پہنچی اور اسے اچانک زور زور سے رونے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور بتدریج تیز ہونے لگی تھی۔ وہ پھر بھاگ کے گھر

کے اندر داخل ہوئی محلے کی خواتین گھر کے اندر آ اور جا رہی تھیں۔

سبھی اس کی آمد سے بے خبر تھے۔ صحن کے بالکل درمیان میں چارپائی پر کسی کی میت پڑی تھی اور چارپائی کے اردگرد لوگ موجود تھے۔ ماں اور ابا تو دھاڑیں مار کے رو رہے تھے۔ رافعہ چلتی ہوئی میت کے قریب پہنچی اور سر جھکا کر میت کا چہرہ دیکھا۔ وہ دوسرے ہی لمحے جھٹکے سے پیچھے کو ہٹی۔

رافعہ نے گردن موڑ کر کمرے میں جھانکا تو وہ سفید وسیاہ فوج بھی وہیں موجود تھی۔ اُن کی طرف جانے سے پہلے رافعہ اماں کی طرف آئی۔

وہ ماں کے گلے لگ کر رونا چاہتی تھی مگر وہ ایسا نہیں کر پا رہی تھی۔ کوئی اُسے دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔

رات کے سارے مناظر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھے کچھ دیر پہلے تک تو وہ اپنے والدین کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔

پھر کہانی مکمل کر کے سونا چاہتی تھی تو اب یہ سب کیا ہے اس کی شکل کی کون لڑکی میت کی شکل میں سامنے موجود ہے۔ ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ لمبے چغوں میں ملبوس لوگ آگے بڑھے اور اس کو کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ سارے منظر دھندلانے لگے اب صرف سفید دھواں تھا اور بہت ٹھنڈ......

پڑوسن رافعہ کی ماں کو بین کرتا دیکھ کر تاسف سے سر ہلا رہی تھی۔

''اللہ جوان اولاد کے دکھ سے محفوظ رکھے۔''

مگر یہی حقیقت ہے بس لمحوں میں جیتا جاگتا انسان جنازہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

☆☆......☆☆

غزل

مجھے جو دل نے دیا مشورہ غلط نکلا
میری زیست کا ہر فیصلہ غلط نکلا

کتاب زیست اتنی بھی مشکل نہ تھی
ترا سجایا ہوا حاشیہ غلط نکلا

مجھے نجوم ورمل کا علم آتا ہے
مگر یہ عشق ہے ہر زائچہ غلط نکلا

مثال دینے سے قاصر رہا جہاں سخن
ترے جمال کا ہر قافیہ غلط نکلا

جسے نبھاتے ہوئے عمر رائیگاں ٹھہری
وہی اصول وہی ضابطہ غلط نکلا

دستگیر شہزاد۔ٹوبہ ٹیک سنگھ

ایک صدی کا ساتھ تمام ہوا

ہم بہت دکھ سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ناصر رضا صاحب جو ادارہ سچی کہانیاں کے گروپ ایڈیٹر تھے۔ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوئے' ادارہ اُن کے اہل وعیال اور چاہنے والے ہمیشہ اُن کی کمی محسوس کرتے رہیں گے۔

آپ سے التماس ہے کہ اُن کے ایصال ثواب کے لیے ایک بار سورۃ فاتحہ ضرور پڑھیں۔

لکھ پاؤ گے۔''

اچھے برے کا کبھی ادراک نہیں ہوا۔ میں بس پھر لکھتا گیا۔ ایسے ہی تھے وہ ہر احوالی سے کہنے والے 'تم بھی کبھی کبھی لکھو' اور سچی کہانیوں کو ایک سے ایک رائٹرز ملتے گئے۔

ایک وقت تھا سلیم فاروقی' پروین بلگرامی اور ناصر رضا تینوں ایڈیٹرز اپنی کرسیوں پر براجمان تھے اور سچی کہانیاں جوبن پر تھا احوال چوپال سجا کرتے تھے۔ ایڈیٹرز کے گھٹے گھٹے جواب ساں باندھ دیتے تھے۔ پھر ناصر رضا صاحب کے ہاتھ میں سب آیا اور چار چاند لگ گئے' کون ایڈیٹر کون لکھاری؟ سب ایک تھے۔ کبھی کوئی تلخ بات اُن کے منہ سے نہیں سنی۔ جب تک وہ رہے میں برابر چھپتا رہا۔ کبھی انہوں نے میری کسی کہانی کو رد نہیں کیا۔ ہمیشہ بہتر مشورہ دیا۔ خلوص محبت اُن کے لہجے سے چھلکتی تھی۔ میں بہت چھوٹا ہوں پر وہ میرے ہر ایس ایم ایس پر کال کا جواب دیا کرتے تھے۔ کبھی مصروف ہوتے تو میسج آتا 'بیٹا میں کچھ مصروف تھا' اتنا مان' اتنا احترام یہ انہی کے بس کی بات تھی۔ پھر وہ چلے گئے لیکن میرے ساتھ اُن کا تعلق کبھی ختم نہیں ہوا۔ یہ تعلق صرف موبائل کی حد تک نہیں تھا جب بھی کراچی جانا ہوا اُن سے آفس میں ملاقات ہوئی چائے کے بغیر وہ جانے نہیں دیتے تھے۔ اُن کے چہرے سے عقیدت ٹپکتی تھی۔ اُن کی مسکراہٹ انسان میں جان پھر دیتی تھی۔ جب وہ سچی کہانیاں سے دور ہوئے کبھی انہوں نے مجھ سے رسالے یا اُس سے جڑے کسی شخص کی برائی نہیں کی۔ جب بھی بات ہوتی وہ رسالے کی تعریف ہی کرتے۔

کیا لکھوں کتنا لکھوں؟ جتنا لکھوں کم ہے۔

منزہ سہام صاحبہ نے جب بتایا ناصر رضا صاحب

گیلی مٹی

چاک سے دونوں ساتھ تھے اُترے
دونوں کی تھی گیلی مٹی
تھک کر بیٹھے تھے ستانے
سانس پہ تھوڑا قابو پانے
جوڑے تھے شانوں سے شانے
جڑ کے رہ گئے دو دیوانے
دونوں کی تھی گیلی مٹی
گیلی مٹی جڑ جاتی ہے
خشک ہوئی تو عشق تھا غالب
یک جاں کہلائے دو قالب

مقبول زیدی

نہیں رہے۔ ساعتوں کو یقین ہی نہیں آیا۔ لب لڑکھڑا گئے۔ کس طرح بات مکمل کی اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ بہت دیر تک اس کڑوی حقیقت کو تسلیم کرنے سے من انکاری تھا لیکن بہر حال تسلیم کرنا تھا۔ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں پیارے اور کس طرح چلے جاتے ہیں؟ بالکل اچانک.....

وہ چلے گئے ہیں لیکن وہ ہمیشہ رہیں گے ہر جگہ' ہمارے دلوں میں بہت ساری دعائیں اُن کے لیے اللہ تعالیٰ اُن کا آگے کا سفر سکون و آرام سے رکھے آمین۔

☆☆.....☆☆

آپ زندہ ہیں

خود فراموشی کی حد تک مسئلہ کچھ بھی نہیں
مسئلہ یہ ہے تجھے کیسے بھلانا چاہئے

اپنے ایڈیٹر کو رائٹر کا خراج تحسین

عمران مظہر

ایک جملہ جو آج بھی ساعتوں میں رس گھول دیتا ہے اور لب آپ ہی آپ مسکرا اٹھتے ہیں اور دل محبت و عقیدت سے بھر جاتا ہے۔

''عمران تم بھی کبھی لکھو مجھے یقین ہے تم اچھا

اسما کہاں گئی

لوٹ کر وہ کبھی آئے گا یہاں
میرے ہونٹوں پہ فغاں ٹھہری ہے

یہ معمہ کبھی حل ہی نہ ہوسکا کہ ایک جیتی جاگتی عورت اچانک کہاں غائب ہوگئی ان ماڈرن لوگوں کے لیے فکر انگیز تحریر جو روحوں اور شیاطین پر یقین نہیں رکھتے......

زین شمسی

رات کا آخری پہر تھا شدید پیاس سے اس کی آنکھ کھل گئی وہ کچھ دیر تو لیٹی چھت کو گھورتی رہی پھر ہمت کر کے بستر سے اٹھی پیروں میں چپل ڈالی اور اچھی طرح اپنے آپ کو چادر میں لپیٹ لیا۔

کامران نے کروٹ لے کر اس کو دیکھا اور پھر گہری نیند میں چلا گیا۔ اسما آج کل اپنے بھائی کی شادی میں مصروف تھی اکلوتا بھائی تھا اس لیے تمام ارمان نکالے جارہے تھے۔

رات بھی وہ دونوں میاں بیوی مہندی کے فنکشن سے لوٹے تھے حالانکہ اسما کے والدین نے انہیں وہیں رُکنے کو کہا مگر پھر بھی وہ دونوں چلے آئے البتہ بچے نانا نانی کے پاس ہی ٹھہر گئے۔ شاید تھکن کی وجہ سے وہ رات کو کمرے میں پانی کی بوتل رکھنا بھول گئی تھی۔ اسی لیے اب اٹھ کر نیچے آنا پڑا۔ اسما نے جیسے ہی کچن کی لائٹ کھولی اُسے لگا جیسے کوئی فریج کے پاس کھڑا تھا اور پلک جھپکتے ہی غائب ہوگیا۔

سخت سردی میں بھی اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا وہ کامران کو آواز دینا چاہتی تھی مگر آواز جیسے حلق میں پھنس گئی ہو۔

''اسماء کیا کررہی ہو یہاں کھڑی؟''
کامران کی آواز اس کو ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی۔

''میں پا...... پانی لینے آئی تھی۔'' اس کی آواز میں موجود کپکپاہٹ کو کامران نے صاف محسوس کیا۔

''تو پانی کیوں نہیں لیا سب ٹھیک ہے نا؟'' کامران نے اس کے ماتھے پر چمکتے پسینے کے قطروں کو حیرت سے دیکھ کر کہا۔

''کامران مجھے لگا جیسے کچن میں کوئی تھا۔'' وہ اب بھی شدید خوف زدہ تھی۔

''کہاں دیکھا تم نے؟'' یہ کہہ کر کامران نے کچن میں داخل ہوکر چاروں طرف نظریں گھمائیں۔

''کچھ نہیں ہے تمہارا وہم ہوگا' چلو سو جاؤ چل کرے۔''

اسما کمرے میں آتو گئی مگر نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اُسے یقین تھا کہ وہ وہم نہیں تھا کوئی تھا جو کچن میں موجود تھا اگلے کئی دنوں تک وہ شادی کے ہنگاموں میں مصروف رہی اور رات کے واقعے کو یکسر فراموش کر بیٹھی۔ شادی سے فرصت کے بعد آج وہ لوگ دو دن بعد گھر واپس لوٹے تھے۔ بچے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کامران اور اسما ٹی وی لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔

''اُف کامران میں تو تھک گئی سچ کہا ہے کسی نے اپنا گھر اپنا ہوتا ہے۔ اب تو امی ابو کے گھر پر بھی بے چینی سی رہتی ہے۔'' اُس نے اپنے پاؤں دباتے ہوئے کہا تو کامران ہنس پڑا۔

''اچھا بیگم صاحبہ چلیں اپنے گھر آنے کی خوشی میں چائے تو پلادیں۔'' کامران نے اسما کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا آپ گاڑی سے سامان نکال لائیں میں جب تک چائے بناتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کچن کی جانب چل دی۔

''یہ لیں جناب آپ کی چائے۔'' اسما نے چائے کا مگ کامران کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ جو ابھی ابھی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔

''یار یہ تو تم نے کمال کردیا بڑی طلب ہورہی تھی۔''

''اچھا آپ گاڑی سے بیگز لے آئے۔''

''ارے نہیں یار تمہیں اور بچوں کو اُتار کر مکینک کے پاس چلا گیا تھا گاڑی کچھ مسئلہ کررہی تھی چائے پی کر بیگ لے آؤں گا۔'' کامران کی یہ بات سن کر اسما کو شاک لگا۔

"کامران آپ اندر تو آئے تھے' آپ نے ہی تو چائے کا کہا تھا؟"

"کیا ہو گیا اسما میں کہہ تو رہا ہوں میں گاڑی چیک کروانے لے گیا تھا اندر آ جاتا تو پھر ہمت نہیں ہوتی۔"

مگر تم ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟" اسما کا چہرہ دیکھ کر اب کامران کو تشویش ہو رہی تھی۔ یہ دوسرا اتفاق تھا جب اسما کو اپنے گھر سے کچھ خوف محسوس ہوا۔

"کامران آپ مذاق کر رہے ہیں نا؟" وہ اب بھی بضد تھی۔ کامران اُس کی آنکھوں میں وحشت اور خوف دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"اسما تم تھکی ہوئی ہو جاؤ جا کر کچھ دیر آرام کر لو میں بچوں کو دیکھ لوں گا۔"

اسما کچھ دیر تک لاؤنج میں پڑے صوفے کو گھورتی رہی پھر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اگلے چند دن پُرسکون رہے بچوں کے اسکول اسٹارٹ ہو گئے تھے۔ اسما گھر اور بچوں میں بری طرح مصروف ہو گئی تھی۔

آج صبح الارم نہیں بجا اس لیے اسما کی آنکھ دیر سے کھلی جلدی جلدی بچوں کو تیار کر کے اس نے کامران کو اٹھایا۔

"کامران ویگن مس ہو گئی ہے آپ بچوں کو اسکول چھوڑ آئیں پلیز۔" اس نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابا چھوڑ آتا ہوں مگر اب تم مجھے آفس سے لیٹ مت کر دینا میرے کپڑے اور ناشتہ تیار رکھنا۔" یہ کہہ کر کامران بچوں کو چھوڑنے چلا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپس آ کر چینج کیا اور ناشتہ کر کے آفس کے لیے نکل گیا۔

ماسی کو گیارہ بجے تک آنا تھا اس لیے وہ تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئی۔ ابھی لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کی آنکھ بچوں کی آواز سے کھل گئی وہ نیچے لاؤنج میں کھیل رہے تھے۔ اسما جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آئی ابھی سیڑھیوں پر قدم ہی رکھا تھا کہ دونوں بچے بھاگتے ہوئے اوپر آ گئے۔

"ارے تم دونوں کیسے آ گئے اور اسکول سے کون لایا؟" اُس نے بچوں سے پوچھا۔

"ماما وہ ہماری پرنسپل کے ہزبینڈ کی ڈیتھ ہو گئی اس لیے اسکول بند کر دیا ہم وین میں واپس آ گئے۔"

"اچھا جاؤ کپڑے بدلو اور پلیز کمرہ گندا مت کرنا ابھی تک ماسی صاحبہ بھی نہیں آئی ہیں۔" اسما کو ماسی کی دیر سے آنے والی عادت سے چڑ تھی۔

"اب کسی غمزدہ کہانی کے ساتھ آئے گی۔" اسما بڑبڑاتے ہوئے چائے کا پانی کیتلی میں چڑھا کر اپنے لیے ناشتہ بنانے لگی تبھی ڈور بیل بجی۔ اس نے چولہے کا Flame ہلکا کیا اور دروازہ کھولنے چلی گئی۔

دروازے پر ماسی تھی۔

"سلام باجی....." نذیراں نے دانت نکال کر سلام کیا۔

"یہ وقت ہے تمہارے آنے کا نذیراں دیر سے آتی ہو اور جانے کی ہمیشہ جلدی رہتی ہے۔" اسما نے غصے سے نذیراں کو گھورا.....

"وہ باجی کل رات سے مُنے کو بخار تھا میں ساری رات کی جاگی ہوں بس اسی لیے دیر ہو گئی۔"

"اچھا نذیراں اب سب سے پہلے بچوں کا کمرہ صاف کر لو وہ آج جلدی اسکول سے آ گئے ہیں پھر میرا کمرہ صاف کر دینا۔ جب تک میں

ناشتہ کر لوں تم بھی آ کر چائے لے لینا....." اسما نے نذیراں کی سنگین شکل دیکھ کر اس کو چائے آفر کر دی۔

"جی باجی جی میں بس ابھی آئی۔" پانچ منٹ بعد ہی نذیراں نیچے آ گئی تب اسما چائے پی رہی تھی اور اپنا پسندیدہ پروگرام بھی دیکھ رہی تھی۔

"باجی آپ تو کہہ رہی تھیں بچے جلدی آ گئے پر بچے تو اوپر نہیں ہیں۔" نذیراں نے حیرت سے اسما کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو کمرے میں نہیں ہیں تو ٹیرس پر ہوں گے۔" اسما نے جواب دیا۔

"باجی میں نے پورا اوپر کا گھر دیکھ لیا ہے وہ کہیں نہیں ہیں۔" یہ سننا تھا کہ اسما کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا اور وہ بھاگ کر اوپر بچوں کے کمرے میں گئی کمرہ ویسے کا ویسا تھا جیسا بچے اسکول جاتے وقت چھوڑ گئے تھے۔ اس نے پاگلوں کی طرح سارے کمرے چیک کیے چھت تک دیکھ کر آ گئی اور پھر روتے ہوئے اس نے کامران کو فون کر کے ساری صورتحال بتائی۔

کامران بھی فوراً آفس سے گھر آ گیا مگر اس سے پہلے وہ بچوں کے اسکول گیا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ بچے اسکول میں ہیں وہ اب اسما سے بات کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔ کئی دنوں سے اسما کے رویے کو لے کر وہ پریشان ہو رہا تھا گھر پہنچ کر اس نے اسما کو بتایا کہ بچے تو اسکول میں ہیں پھر اسما سے پورا واقعہ سنا۔

"نذیراں تم نے بچوں کو گھر میں دیکھا؟" کامران نے چہرے پر ہوائیاں اڑتی نذیراں سے پوچھا۔

"نہیں صاحب جی مجھے تو باجی نے کہا کہ بچے اوپر ہیں مجھے وہ نظر نہیں آئے تو میں نے باجی کو بتایا۔"

"اسما تم نے خواب دیکھا ہوگا پریشان مت ہو۔"

"کامران میں سوئی ہی نہیں صرف لیٹی تھی اور بچوں سے میں نے بات کی ہے۔"

"اچھا جب تم نے دروازہ کھولا تو وین ڈرائیور اُن کے ساتھ تھا؟" کامران کے پوچھنے پر وہ بری طرح چونکی۔

"دروازہ تو میں نے کھولا ہی نہیں تو بچے اندر کیسے آئے؟" کامران اسما کی حالت کو لے کر واقعی میں پریشان تھا۔ پھر کامران سارا وقت اسما کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ عام گھریلو خواتین کی طرح اکیلے ہی گزارتی تھی۔ اسما کو بھی اب ہر چیز سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ کامران کو اس سے کوئی بھی کام کہنا ہوتا تو بار بار کہنا پڑتا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ سن ہی نہیں رہی۔ کامران نے اسما کی امی کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ دن کے لیے ان کے گھر آ جائیں۔ وہ بے چاری تو ساری صورت حال جان کر ویسے ہی پریشان ہو گئی تھیں فوراً ہی داماد کے ساتھ چلی آئیں۔ نانی کو دیکھ کر بچے خوش ہو گئے۔ اسما ماں کو یوں اچانک دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔

"امی آپ؟"

"کیوں میں نہیں آ سکتی۔" انہوں نے بناوٹی غصے سے کہا۔

"نہیں نہیں میرا وہ مطلب نہیں بس آپ اچانک آئیں اس لیے پوچھا۔" اسما نے ہنس کر ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تم لوگوں کی یاد آ رہی تھی سو چا اب تو بہو گھر پر ہے تو میں بیٹی کے گھر جا کر آرام کروں۔“ وہ خوشدلی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”اچھا بھئی اب باتیں ہی ہوں گی یا کچھ کھانے پینے کا بھی بندوبست ہے۔“ کامران نے اسما کو خوش دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔

”ہاں کیوں نہیں آپ لوگ فریش ہوں میں کھانا لگاتی ہوں۔“

بچے نانی کو اپنے کمرے میں لے گئے اور اسما کچن میں جا کر جلدی جلدی کھانے کو فائنل ٹچ دینے لگی۔

بہت اچھے ماحول میں کھانا کھایا گیا رات دیر تک کافی اور میوے انجوائے کیے گئے پھر سب سونے کے لیے چلے گئے۔ صبح کامران کی آنکھ کھٹ پھٹ کی آواز سے کھلی۔

”اسما سو جاؤ یار آج ہفتہ ہے بچوں کی چھٹی ہے۔“ کامران نے غنودگی میں اسما کو کہا۔

”آپ سو جائیں امی واک پر جاتی ہیں میں سوچ رہی ہوں اُن کے ساتھ واک پر چلی جاؤں۔“ یہ کہہ کر اسما کمرے سے نکل گئی۔ کامران کی آنکھ کسی کے جھنجھوڑنے پر کھلی۔ نیم وا آنکھوں سے دیکھا تو بیٹا فیصل کھڑا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”بابا مما کہاں ہیں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”بیٹا ابھی آجائیں گی نانی کے ساتھ واک پر گئی ہیں۔“ کامران نے بیٹے کو جواب دیا۔

”پر بابا نانی بھی مما کو ڈھونڈ رہی ہیں۔“ یہ سننا تھا کہ کامران کے سارے حواس یکدم بیدار ہوئے وہ بنا چپل پہنے تقریباً دوڑتا ہوا باہر آیا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اسما کی والدہ گھر پر ہی موجود تھیں۔

”امی آپ اسما کے ساتھ واک پر نہیں گئیں۔“ کامران نے حیرت سے اپنی ساس سے پوچھا اور ان کے جواب دینے سے قبل ہی اس کی نظر گھڑی پر پڑی جو صبح کے گیارہ بجا رہی تھی۔

”بیٹا رات دیر سے سوئی تھی اس لیے صبح آنکھ نہیں کھلی پھر تم بھی نہیں اٹھے تو میں یہی سمجھی کہ آج تمہارا آفس بھی نہیں ہے اس لیے خود ہی چائے بنا لی مگر جب کافی دیر ہو گئی تو بچوں کو بھیج کر تمہیں اٹھایا کیونکہ اسما تو اتنی دیر تک نہیں سوتی۔“ صورت حال تشویشناک تھی اسما نے کبھی ایسی حرکت نہ کی تھی۔ کامران نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گیا۔ کئی گھنٹے کے بعد جب اس کی واپسی ہوئی تو وہ اتنا ہی لاعلم تھا جتنا صبح گھر سے نکلتے وقت...... چند گھنٹوں میں سارے خاندان میں اسما کے لاپتہ ہونے کی خبر پھیل گئی۔ پولیس تھانہ سب کر لیا گیا تمام ملنے والوں سے بھی پوچھا گیا مگر سب بے سود......

اور پھر وقت گزرتا چلا گیا دن، مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلے بچے جوان ہو گئے اسما کے والدین بیٹی کے غم میں دنیا سے چلے گئے کامران کے گھر والوں نے دوست احباب سب نے کوشش کر لی کہ کامران دوسری شادی کر لے اور نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئے مگر وہ سب ہار گئے۔ اور کامران آج برسوں گزرنے کے بعد بھی وہ آخری منظر جب اسما کو اُس نے آخری بار دیکھا اور آخری جملہ ”کامران آپ سو جائیں امی واک پر جاتی ہیں سوچ رہی ہوں میں بھی چلی جاؤں۔“ بھول نہیں پایا۔ یہ بھی وہ سمجھ نہیں پایا کہ یہ کیا اسرار تھا؟ اسما کہاں گئی؟ کوئی نہیں جان پایا۔

☆☆......☆☆

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد......

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

”بس تھوڑا سا انتظار......“

نیا سلسلے وار ناول

ایک بہت ہی خاص' منفرد موضوع پر دلچسپ تحریر

ریشم سے کچے دھاگے

(تیسری قسط)

غیاث الدین غیاث کا خیال

تقاضہ وقت کا ہے یہ کہ لکھو
نہیں گے ہم کہ ہم راقم ہوئے ہیں

روشانے سبحین مہاردی

معید خان تقریباً بھاگتے ہوئے ہال کمرے میں پہنچا وہاں کا منظر عجب دل دہلانے والا تھا۔ چاچی جان ہوش و خرد سے بیگانہ پڑی تھیں اور خانم اُن کے پیروں کو مسلتے ہوئے اشک فشانی کر رہی تھیں۔

''او گاڈ... یکا یک یہ سب کیا ہو گیا؟'' وہ بڑبڑایا ایک گہرا اضطراب اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھا۔

''چاچی جان... ہوش میں آیئے...'' اُن کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامے وہ انتہائی متوحش ہو رہا تھا۔

زریں گل کے پپڑی زدہ ہونٹ اور زرد پڑتی رنگت اُن سب کو ہولائے دے رہی تھی۔

''کاش! بی بی جان اور آغا جان اس وقت یہاں ہوتا... امارے ساتھ اور... ہمارا بابا... امارا خاناں... تیمور... جانے کس حال میں ہوگا ہمارا بچہ... ہمارا تیمور خاناں... او ہمارے خدا... ام پر رحم کر۔'' انتہائی ضبط کے باوجود خانم کی سسکیاں نکل گئیں۔ کرب و پریشانی اُن کے جھریوں زدہ چہرے سے عیاں تھی۔

تیمور کے ذکر پر معید خان کے لب سختی سے بھینچ گئے اُسے شدت سے بی بی جان اور آغا جان کی کمی محسوس ہوئی۔

''خانم! پلیز خود کو سنبھالیے... یہ وقت یوں ٹوٹنے بکھرنے کا نہیں ہے' ہمیں ہمت رکھنی ہوگی۔'' بین کرتی خانم کو اُس نے نرمی سے ٹوک دیا اور ایک طائرانہ سی نگاہ قریب کھڑی پریشے خان پر ڈالی جس کی خطرناک حد تک سپید پڑتی رنگت معید خان کو مزید دلگرفتہ کر گئی۔

خانم کے یوں بین کرنے پر وہ بالکل ساکت ہو گئی تھی' معید خان کو لگا جیسے وہ ابھی ڈھے جائے گی اور پلک جھپکتے میں اُس کا خدشہ صحیح ثابت ہو گیا۔ وہ نیم جان سی ہو کر کاؤچ پر گر گئی۔ اُس کی پلکوں پر منوں بوجھ تھا' لیکن وہ

حواس کھونا نہیں چاہتی تھی۔
"ہاں...." درد کے بھنور میں ڈوبی ایک تڑپتی ہوئی سسکی اُس کے لبوں پر سرگوشی بن کر ٹھہر گئی ایک ایسی سرگوشی جس میں کرب کا گہرا ارتعاش تھا۔
بے اختیاری میں وہ چاچی جان کو چھوڑ کر اُس کی طرف لپکا۔
"پری...." اُس نے سختی سے اُسے جھنجھوڑ دیا۔ معید خان کو لگا کہ اُس کا دماغ مکمل طور پر ماؤف ہو گیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں جیسے سلب ہو گئیں۔ ایک طرف چاچی جان بے ہوش پڑی تھیں اور اب پریشے بھی اپنے حواس کھو رہی تھی۔
"تم ایسے نہیں ٹوٹ سکتی پریشے..... چاچی جان اور تیمور کو اس وقت تمہاری کتنی ضرورت ہے کیا یہ تمہیں بتانا ہوگا؟" اُس نے قدرے درشت لہجے میں اُسے ڈپٹا' تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ معید خان کے کھردرے لب ولہجہ پر خانم بھی بھونچکی رہ گئیں اور ایک ناراضگی بھری شکوہ کناں نظر اُس پر ڈال کر منہ پھیر لیا۔ معید خان نے خود کو سخت لاچار محسوس کیا۔
"آئی ایم سوری پری.... پلیز ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ..... ہمیں فوری ہاسپٹل پہنچنا ہوگا۔ چاچی جان کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔ شاید اِن کا بی پی بہت زیادہ شوٹ کر گیا ہے۔ اور پھر تیمور....." پشیمانی سے بات ادھوری چھوڑ کر وہ متفکر سا پریشے کی طرف دیکھنے لگا۔
وہ آنسو پونچھتے ہوئے محض سر ہلا کر رہ گئی' نازک طبع لڑکی سخت بے بسی اور یاسیت میں گھری ہوئی تھی۔
زریں گل Anxiety کی پیشنٹ تھیں اکثر اُن کا بلڈ پریشر زیادہ ہو جاتا تھا لیکن نوبت کبھی بے ہوشی تک نہیں آئی تھی۔
تیمور خان اُن کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا' اُس کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھے جانے کی خبر اُن کے اعصاب پر بجلی بن کر گری' اور اُن کا دماغ جیسے تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اُن کی اِس دگرگوں حالت پر اگر پریشے اور خانم کبیدہ خاطر تھیں' تو معید خان کے خود کے اعصاب بھی سخت کشیدہ ہو رہے تھے۔
"خانم! پلیز میری ہیلپ کریں۔" معید نے خانم کی مدد سے زریں گل کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھایا اور تیزی سے پورٹیکو کی طرف بڑھ گیا۔
بلیک نرم اونی شال میں خود کو لپیٹے مرے مرے قدموں سے پریشے خان آفریدی بھی اُن کے پیچھے ہولی۔ مسلسل گریہ وزاری سے اُس کی آنکھوں کے گلابی پپوٹے سوج گئے تھے۔
وہ گم صم سی جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔
کیسی انہونی ہو گئی تھی۔
جیسے کوئی ناگہانی آفتاد ٹوٹ پڑی ہو۔
یا کوئی عفریت جس نے لمحوں میں اُن کی خوش باش پُرسکون زندگی پر اپنا کالا سایہ ڈال دیا تھا۔
اُس کا دل و دماغ سوچوں کی بھول بھلیوں میں غلطاں تھا۔
گاڑی کا رخ قریبی ڈسپنسری کی بجائے DHQ اسپتال کی طرف تھا۔ خانم معید کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھیں' جبکہ وہ پچھلی سیٹ پر اماں کا سر اپنی گود میں رکھے مسلسل گم صم سی تھی۔

اب کی بار سرد موسم ٹھٹھرتی اُداسیاں اپنے ساتھ یوں لایا تھا کہ دل کے موسم بھی جیسے حزن و ملال کی سرکش لہروں کی زد میں تھے۔
خانم متورم آنکھوں اور کانپتے ہونٹوں کے ساتھ زیرِ لب 'آیت کریمہ' کا ورد کر رہی تھیں۔
معید خان مسلسل آدم خان کو کال کر رہا تھا لیکن اُن کا نمبر فی الوقت بند تھا۔ اُس کی بے قراری اور اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔
"اب چاچو سے کیسے کونٹیکٹ کروں؟" وہ بڑبڑایا۔ ماتھے پر پڑی سلوٹیں اُس کے ذہنی خلفشار کی واضح غماز تھیں۔
زریں گل کی حالت ہنوز تھی' باوجود انتہائی کوشش کے وہ ہوش میں نہیں آ رہی تھیں۔
گاڑی میں موجود تینوں نفوس کے درمیان خاموشی کی گہری چادر تنی ہوئی تھی۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ معید خان کا دھیان اِس وقت ڈرائیونگ پر مرکوز تھا لیکن دل و دماغ میں اٹھتے سوالوں کے گرداب اُس کا ارتکاز توڑ رہے تھے۔ دفعتاً اُس کے پاؤں کا دباؤ ایکسیلیٹر پر بڑھا اور گاڑی ہواؤں سے باتیں کرنے لگی۔
سڑک پر اکا دکا گاڑی تھی' ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی' لیکن بڑھتی ہوئی اسپیڈ نے خانم کو ہراساں کر دیا۔
"گاڑی کا اسپیڈ کم رکھو بچہ....." خانم نے خاموشی کا پردہ چاک کرتے ہوئے اُس کے شانے پر دھیرے سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
معید خان کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا' تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اُس نے گاڑی کی اسپیڈ کنٹرول کی۔
"خانم! چچا جان کا فون آپ نے ریسیو کیا تھا؟" وہ اُن کی طرف دیکھتا ہوا سنجیدگی سے بولا۔
"نہیں..... ام تو کچن میں تھا..... انہوں نے پری کے موبائل پر کال کیا تھا شاید۔" انہوں نے رنجیدگی سے کہتے ہوئے مڑ کر پریشے کو دیکھا جو ماں کو کسی قیمتی متاع کی طرح اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے تھی۔
معید خان نے بیک ویو مرر سے استفہامیہ نظروں سے پریشے کی طرف دیکھا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔
"بابا جان نے شاید ہاسپٹل کے نمبر سے کال کی تھی تیمور کی حالت بہت سیریس تھی۔ اس لیے وہ بہت عجلت میں تھے انہوں نے صرف اتنا بتایا کہ ایک حادثے میں تیمور کو گولی لگ گئی ہے اور وہ لوگ ہاسپٹل میں ہیں۔" ہونٹوں کو کچلتے ہوئے اُس نے مفصل جواب دیا۔
"حادثہ؟ کیسا حادثہ؟ اور تیمور کیسے زخمی ہو گیا۔" اس نے مزید استفسار کیا۔
"اور.... اُن کا نمبر بھی نہیں لگ رہا۔ میں مسلسل ٹرائی کر رہا ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔
"پتہ نہیں..... یہ سب کیسے ہو گیا..... بابا نے بھی مزید کچھ نہیں بتایا..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی یکایک حالات کیسے اتنے بگڑ گئے؟" وہ بولی تو اُس کی کمزور سی آواز اتنی دھیمی تھی گویا پاتال کی آخری تہہ سے نکلی ہو۔
معید خان خاموش نظروں سے اُسے دیکھ کر رہ گیا۔ اُس کے چہرے کے خدوخال پر مایوسی کی گہری چھاپ تھی۔
گھنیری پلکوں پر آنسو جیسے موتی بن کر ٹھہر گئے تھے۔ یاس کی دلدل میں پور پور دھنسی یہ پریشے خان آفریدی تو کوئی اور تھی وہ چنچل سی پری زاد کون تھی؟ جو سید و شریف اُن کی آبائی حویلی میں ہر پل چہکا کرتی تھی۔

سنہری روح والی لڑکی کا درد معید خان کی آنکھوں میں پانی بن کر ٹھہر گیا۔
خانم ابھی بھی زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ لمحے یونہی بوجھل گھمبیر خاموشیوں کی نذر ہونے لگے اور کچھ منٹوں کی مسافت کے بعد وہ ہاسپٹل پہنچ گئے۔
معید نے تیزی سے گاڑی کا بیک ڈور کھولا اور زرین گل کو اٹھائے تیزی سے ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھا۔ پریشے اور خانم بھی بے قراری سے اُس کی تقلید میں آگے بڑھیں۔
چاچی کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے معید خان کو لگا کہ یہ اُس کی زندگی کا مشکل ترین کٹھنائیوں سے بھرا سفر تھا۔ گویا پل صراط تھا جو وہ پار کر کے آیا تھا۔

☆......☆......☆

''ہیے......یو۔'' ہیری کی آنکھوں میں ایک پل کو شناسائی کی چمک ابھری اور دوسرے ہی پل نفرت کی تیز تند لہریں اُس کے پورے وجود میں اٹھنے لگیں۔
''مو......معز......'' وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ میں بولا۔ معز خان اپنے پورے قد کے ساتھ مضبوطی سے تنا کھڑا تھا۔
''ہمم......تو یہ تم ہو۔'' وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور اُس کے قریب جھک کر طنزیہ انداز میں کہا یقیناً وہ بے حد حیران تھا لیکن اُس نے اپنے استعجاب پر پورا قابو پالیا تھا۔
''ہاں......میں......معز خان......جسے تم اپنی زندگی میں کبھی بھولے نہیں ہوگے۔'' معز نے بھی اپنی اُلجھن کو چھپایا اور چبا چبا کر مضبوط دبنگ لہجے میں بولا۔ لیکن اُس کا ذہن سوچوں کے تانے بانے میں ہی اُلجھا ہوا تھا۔ اتنے سال بعد اُس کا یوں ہیری سے ٹکرانا......کیا محض ایک اتفاق تھا' یا پھر اُسے پلان کر کے ٹریپ کیا جارہا تھا اور اتنے سال گزرنے کے بعد ہیری کو اُس سے پرانا بدلہ چکانا اب یاد آیا تھا۔ معز خان اسی ادھیڑ بن میں تھا جبکہ دوسری طرف ہیری کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ جس آدمی کی مار کٹائی کرنے اور ہڈیاں توڑنے کا سودا انہوں نے 5000 پونڈ میں کیا تھا...... وہ معز خان ہوگا۔ وہ سخت کوفت کا شکار ہورہا تھا۔
ہیری کچھ سال پہلے ٹمیر دیلی یونیورسٹی میں چوری چھپے اسٹوڈنٹس کو ڈرگ سپلائی کرتا تھا۔ اُن دنوں اُس کا اثر ورسوخ اور طاقتور ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ تب مونٹی سے بھی کوئی علیک سلیک نہ تھی۔ وہ بس چھوٹے موٹے اسٹریٹ کرائمز اور ڈرگ ڈیلنگ کے کاموں میں ملوث تھا۔ اُسی دوران معز خان سے اکثر وبیشتر اُس کے آرگومنٹ رہتے اور ایک دن نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی جس میں معز خان نے مار مار کر اُس کا بھرکس نکال دیا۔ اِس سارے فضیحتے کی جڑ معز کا قریبی دوست ٹونی تھا جس کے سبب معز نے اُسے زمین کی دھول چٹوادی تھی۔
ٹونی ایک بروکن فیملی کا لڑکا تھا۔ وہ ہائی اسکول میں تھا جب اُس کی ماں اُسے چھوڑ کر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنے لگی تھی تب سے وہ نشے کی لت کا شکار ہوگیا تھا۔ اُس کے Drug Addict ہونے میں سب سے بڑا ہاتھ اُس کی بری صحبت کے ساتھ ساتھ ہیری کا بھی تھا۔ معز نے اُسے اِس لعنت سے بچانے کی بھرپور کوشش کی اور آخرکار کامیاب بھی ہوگیا' لیکن اِس سارے معاملے میں ہیری اور معز خان کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ معز خان کے بارہا منع کرنے کے باوجود بھی جب ہیری' ٹونی کو نشے کی پڑیاں دیتا ہوا پکڑا گیا تو معز کا ضبط جواب دے گیا اور

اُس نے ہیری کو خوب سبق سکھایا۔ سو ہیری کو اپنی سرگرمیاں محدود کرنی پڑیں۔ پھر اُس نے کوئین اور براؤن کی اسمگلنگ کے لیے اسکاٹ لینڈ کا رخ کیا۔ وہاں اُس کی ملاقات مونٹی سے ہوئی۔ جہاں دونوں نے انڈر ورلڈ میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کے لیے ایک باقاعدہ نیٹ ورک بنایا۔ لیکن وہاں ایک دوسرے گروپ کے ساتھ گینگ وار میں اُن کی جان پر بن آئی تب بمشکل جان بچا کر وہ دوبارہ انگلینڈ آئے اور ایلنگ کے قریب ایکٹن میں دوبارہ سے اپنا ایک منظم گروہ بنایا۔ لیکن اب کی بار انہوں نے بہت محتاط روش اپنائی' وہ اپنے جرم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے تھے۔ اپنے علاقے میں اُن کا اتنا اثر ورسوخ تھا کہ زیرِ زمین کوئی شخص اُن سے اُلجھنے کا سوچتا بھی نہ تھا۔ لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ اِس پورے عرصے میں ایک بار بھی اُس کا ٹکراؤ معز خان سے نہ ہوا تھا۔
ہیری کے ذہن سے وہ تقریباً محو ہو چکا تھا۔ اور اب تقریباً پانچ سال بعد اسے یوں اپنے سامنے دیکھ کر ہیری کے دل ودماغ سلگ اٹھے تھے۔ سالوں پہلے معز خان کے ہاتھوں ہوئی اپنی پٹائی اُسے تمام جزیات کے ساتھ یاد آنے لگی' تو طیش سے اُس کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔
وہ کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا جو طنزیہ نظروں سے اُسے ہی تک رہا تھا۔
''لگتا ہے......سب یاد آ گیا......'' کئی ساعتوں کے توقف کے بعد ہیری کے چہرے کے بدلتے زاویے دیکھ کر معز خان تمسخرانہ لہجے میں بولا۔
ہیری کو گویا کسی نے بھڑکتی آگ میں پھینک دیا تھا۔
''یو باسٹرڈ......'' ہیری کا زوردار پنچ معز خان کا جبڑا توڑ گیا وہ اِس صورت حال سے نپٹنے کے لیے مکمل طور پر تیار تھا لیکن ہیری سے فوری حملہ غیر متوقع تھا سو نتیجتاً اُس کا زور آور مکا معز کا منہ ٹیڑھا کر گیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔
''مجھے سب یاد دلا کر تم نے اپنی موت کو آواز دی ہے' مو...... معز خان......'' وہ خطرناک عزائم سے اُس کی طرف بڑھا۔
معز خان ایک طرف کو جھک گیا تھا...... ہونٹ بری طرح پھٹ گیا تھا لہو کی ایک لکیر اُس کے ہونٹوں کو بھگوتی ہوئی گریبان تک پہنچ گئی۔
وہ فوراً سیدھا ہوا...... لبوں سے بہتا ہوا خون اُس نے انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا' اُس کی رگوں میں خون کی جگہ گویا آتش دوڑنے لگا۔ ہیری کا تیاپانچہ کرنے کے لیے ایک زوردار کک مارنے کے لیے معز خان اپنی جگہ سے اچھلا' لیکن برق رفتاری سے بروقت جھکائی دے کر خود کو بچالیا۔
معز کی ٹانگ ہوا میں لہرا کر رہ گئی۔
''Come On Face Me۔'' ہیری کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی' اُس نے فی الفور پوزیشن لے لی وہ دونوں مکے تانے کھڑا تھا۔ اور آنکھ کے اشارے سے معز کو مقابلے کے لیے اُکسا رہا تھا۔
اپنا وار خالی جاتا دیکھ کر معز کا دماغ غصے سے آؤٹ ہوگیا وہ اِس بات سے یکسر انجان تھا کہ اِس عرصہ میں ہیری باکسنگ میں کس قدر ماہر ہو چکا تھا۔ اُس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ لڑائی مار کٹائی کے فن میں بہت مہارت حاصل کر چکا ہے۔
معز نے ایک جھٹکے سے اپنی جیکٹ کی زپ کھولی اور اُتار کر پرے اچھال دی۔ اسے سنبھلنے کے لیے چند لمحے

درکار تھے وہ سمجھ گیا تھا کہ اُسے جوش کی بجائے ہوش سے کام لے کر اپنے مخالف کو زیر کرنا ہوگا۔ وہ سرعت سے ہیری کی طرف بڑھا۔

اُس کے ساتھ خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے۔ ہیری کی اجازت کے بنا وہ اُن کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے تھے۔

ہیری بھی کسی بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح آنکھوں سے اُسے کچا چباتے ہوئے اُس کی جانب لپکا۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ گویا بظاہر طور پر دونوں حریف مقابلے کے لیے تیار تھے۔

اب ایک خطرناک فائٹ کا آغاز ہوگیا تھا۔

وہ گھمسان کا رن پڑا کہ الاماں.....!

دونوں بری طرح ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے تھے۔ دونوں اطراف سے لاتوں اور مکوں کی برسات ہورہی تھی۔

آخر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معیز نے اپنے داؤ پیچ کھیلے اور انتہائی چالاکی سے ہیری کو زیر کرلیا.....

اب اُس کی گردن معیز کے مضبوط بازو کے شکنجے میں تھی۔ معیز پر جیسے خون سوار تھا۔ اُسے قابو کرنے کے لیے اُس نے پوری قوت صرف کردی۔ لمحہ بہ لمحہ ہیری کا دم گھٹ رہا تھا۔ اُس نے ساری ہمت یکجا کرکے معیز کے پیٹ میں زوردار کہنی ماری۔ معیز کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اور ہیری قلابازی کھا کر دوسری طرف الٹ گیا۔ وہ بے دم سا ہوگیا تھا۔ لیکن معیز آج اُسے کوئی رعایت دینے کو قطعی تیار نہ تھا۔ اُس نے پلٹ کر ایک مکا اُس کی ناک پر رسید کیا اور اُسے ناک آؤٹ کردیا۔ وہ زمین پر گر گیا اور اُسے بے تحاشہ غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ معیز کی سانسیں بھی پھول گئی تھیں۔

''پکڑو اِس راسکل کو..... یہ جانے نہ پائے..... اِس کے جسم کی کوئی ہڈی سلامت نہیں رہنی چاہیے۔'' زمین پر اوندھے منہ گرے ہوئے اُس نے تقریباً حلق کے بل چلاتے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

وہ سب آل ریڈی تلملائے ہوئے تھے اور حکم کے منتظر تھے۔ وہ تیزی سے معیز خان پر پل پڑے اور لمحوں میں اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

''چھوڑو مجھے.....'' معیز جھٹپٹایا لیکن اُن سب نے اُسے یوں قابو میں لیا کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہل پایا۔

''اپنے آدمیوں سے کہو مجھے چھوڑ دیں۔''

''اگر تم میں ہمت ہے تو آمنے سامنے آکر میرا مردانہ وار مقابلہ کرو۔'' معیز نے تنفر و تحقیر کے ملے جلے احساس سے کہتے ہوئے ہیری کو للکارا۔ وہ جواب میں مغلظات بکنے لگا۔ اُس کی زبان چل رہی تھی اور اُس کے ساتھیوں کے ہاتھ..... وہ تعداد میں زیادہ تھے اور اُن کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ انہوں نے معیز خان کو مکمل طور پر بے بس کردیا۔

اب وہ اُن کی ٹھوکروں اور مکوں کی زد میں تھا۔ جواباً مزاحمت کرتے ہوئے اُس نے اُن میں سے ایک کو پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ وہ معیز کے بھاری وجود تلے دبا پڑا تھا۔ معیز نے اُس پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کردی۔

اسی اثناء میں سڑک کے پاس ایک گھر سے باہر آتی ایک لڑکی' جس نے براؤن فر کا کوٹ اور اونی ٹوپی پہن رکھی تھی' انتہائی انہماک سے اپنے گھر کا لاک بند کرتے ہوئے اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی کہ دفعتاً اُس کی نگاہ سڑک کے پاس کچھ لوگوں پر ٹھہر گئی۔ اسٹریٹ لیمپ کی مدھم روشنی کے باوجود وہ چہرے مہرے اور حلیے سے مشکوک لگ رہے تھے۔ یقیناً وہ یہاں کے رہائشی نہیں تھے اور ایک نوجوان لڑکے کو وہ بری طرح زدوکوب بھی کررہے تھے۔

''یقیناً یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔'' معاملے کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی لڑکی خوفزدہ ہوگئی اور سرعت سے واپس گھر کی طرف بھاگی برق رفتاری سے لاک کھلتے ہوئے اُس نے دروازہ کھولا اور بولٹ چڑھانے کے بعد سرپٹ داخلی راہداری کی طرف بڑھی۔

تیز ہوا کے باعث دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا تو اُس کی زوردار آواز سن کر ہیری کے ساتھی چھوبک گئے۔

''ہیری' شاید کسی نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔'' اُن میں سے ایک نے تیز لہجے میں ہیری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ جواب قدرے سنبھل چکا تھا اور معیز خان کو پٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جس نے انتہائی جارحانہ انداز میں اُن کے ایک ساتھی پر ہلہ بول دیا تھا۔

''اگر مرنا ہی ہے تو بزدلی کی موت کیوں مرو۔'' وہ بپھرا ہوا تھا لیکن ہیری کے ساتھیوں نے اُسے گن پوائنٹ پر لے کر ادھ موا کردیا تھا۔ وہ بے دم سا ہو کر زمین پر گر گیا۔

''زیادہ ہوشیاری دکھانے کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔'' ہیری نے تحقیر آمیز انداز میں معیز خان کی طرف تھوکتے ہوئے جیسے اپنے ساتھی کی بات ان سنی کردی۔

وہ اِس گمان میں تھا کہ اب وہ پہلے سے چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث اکیلا ہیری نہیں رہا۔ اپنی طاقت کے نشے میں چور وہ معیز خان کی درگت بنا کر پرانا حساب بے باق کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن اپنے غرور میں اُس نے معیز کو انڈر اسٹیمیٹ کیا اور ایک بار پھر معیز خان اُسے نیچا دکھانے میں کامیاب ہوگیا تھا لیکن اب اُسے سڑک پر یوں اوندھے منہ پڑا دیکھ کر بھی اُس کی تلملاہٹ کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

''ہیری! ہمیں یہاں سے فوری نکلنا ہوگا ورنہ ہم سب پولیس کے شکنجے میں چڑھ جائیں گے۔'' ہیری کے ایک ساتھی نے اُس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو وہ یکدم جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آگیا۔

''بھاگو جلدی.....'' ہیری تیز تیز قدموں سے قریباً بھاگتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھا تو وہ سب بھی بجلی کی سی تیزی سے اُس کے پیچھے لپکے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی سب اپنی سیٹیں سنبھال چکے تھے۔ گرگراہٹ کی آواز کے ساتھ 4X4 گاڑی کا انجن بیدار ہوا۔ ٹوڈرائیور نے پوری اسپیڈ سے گاڑی بھگا دی۔

پولیس کی گاڑی کے تیز بجتے ہوئے سائرن کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی جارہی تھی۔ لڑکی کی کال پر صرف چند منٹوں کے توقف کے بعد ہی وہ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے تھے۔

مارتھا نامی لڑکی کا گھر ہارورسٹریٹ کے سامنے تھا۔ جس نے 911 پر کال کرکے پولیس کو اِس حادثے کی اطلاع دی تھی۔

''ہیلو..... آفیسر..... میں مارتھا بات کر رہی ہوں..... یہاں اپنے گھر کے سامنے میں نے کچھ خطرناک لوگوں کو دیکھا ہے۔ وہ لوگ ایک لڑکے کو بری طرح سے پیٹ رہے تھے اور شاید اُن کے پاس گنز بھی تھیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ لوگ مجھے بھی کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ یقیناً انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا ہے..... پلیز آپ فوراً یہاں آ جائیں۔'' وہ سہمی ہوئی تھی اور پھر آفیسر کے استفسار پر اُس نے اُنہیں ساری ڈیٹیل فراہم کرنے کے بعد ایڈریس سمجھایا۔

معیز کے بدن میں اٹھنے والی بے انت ٹیسوں نے اُسے نڈھال کر دیا تھا' وہ اپنے حواس قائم رکھنے کے لیے بار بار سر کو اِدھر سے اُدھر جھٹکے دے رہا تھا' لیکن اِس کے باوجود اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اُس نے ہیری اور اُس کے ساتھیوں کا بھرپور مقابلہ کیا تھا' لیکن اُن چاروں کے مقابلے میں اکیلا ہونے کی وجہ سے وہ مات کھا گیا تھا' وہ Strong Built کا ہونے کے باوجود نیم جان ہو رہا تھا اگر اُس کی جگہ کوئی کمزور اعصاب کا مالک ہوتا تو یقیناً اب تک ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا ہوتا۔ اُس نے ساری ہمت مجتمع کر کے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن لڑکھڑا گیا۔

اُس کا سر بری طرح لہو سے لتھڑا ہوا تھا۔ اور ہونٹوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ پسلیوں پر پے در پے پڑنے والی ضربوں سے شاید فریکچر ہو گیا تھا۔ سر پھٹنے کی وجہ سے اِس کی حواسوں میں رینگنے کی تگ و دو بے سود ہو رہی تھی۔ ہیری اور اُس کے ساتھیوں کے جانے کے محض چند منٹ بعد ہی اُسے پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا تو اُس کی لحہ بہ لحہ کھونے والی حسیات یکدم الرٹ ہو گئیں۔

اُس نے پوری قوت سے اٹھنے کی پھر سے کوشش کی لیکن اُس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا اور وہ دنیا و مافیہا سے گویا بے نیاز ہو گیا۔

جائے وقوعہ پر پہنچتے ہی پولیس اہلکار تیزی سے گاڑی سے اترے اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں ایک شخص سڑک پر اوندھے منہ نظر آیا تو وہ سرعت سے اُس کی طرف لپکے۔

''اوہ..... یہ تو شدید زخمی ہے..... اور بے ہوش بھی۔'' محتاط انداز میں معیز خان کی طرف بڑھتے ہوئے ایک اہلکار نے اُسے سیدھا کیا اور اُس کی کلائی تھام کر نبض چیک کرتے ہوئے تشویش زدہ انداز میں بولا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بھی قدرے جھک کر بغور اُس کا جائزہ لیا۔

''اس کا کافی خون بہہ رہا ہے..... کال دا ایمبولینس۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے چیخ کر اپنے ساتھی کو کہا جو فوراً وائرلیس پر ایمبولینس کال کرنے لگا۔

ہیڈ کانسٹیبل مارک انتھونی 42 سالہ قدرے فربہ جسم کا مالک رحمدل آدمی تھا۔

''He Looks Like An Indian Fellow۔'' ایک کانسٹیبل انتھونی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو زیرک نگاہوں سے گرد و نواح کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ہمم.....'' اُس کی طرف سے مبہم سا جواب آیا۔

''یقیناً یہ گاڑی بھی اسی لڑکے کی ہے۔'' وہ قریب کھڑی گاڑی کی طرف بڑھا جس کا ایک نائر فٹ پاتھ پر چڑھا ہوا تھا۔ اور ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ گرے موبائل کی مسلسل بجتی رنگ ٹون نے انتھونی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''نرمالہ کالنگ.....'' اسکرین پر بلنک ہوتا نمبر شاید کسی لڑکی کا تھا۔ انتھونی نے یس کا آپشن آن کیا تو ایک پریشان نسوانی آواز اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''ہیلو..... معیز..... تم کہاں ہو۔ میں کب سے تمہیں کال کر رہی ہوں' لیکن تم فون پک نہیں کر رہے' از ایوری تھنگ آل رائٹ؟'' نسوانی آواز نے کال ملتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''اوہ گاڈ.....'' انتھونی کا منہ بن گیا۔

شاید یہ اسی لڑکے کا فون تھا' جو اُس کی پاکٹ سے گر گیا تھا۔ اور یہ لڑکی اُسی کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔

''Listen Girl Take It Easy..... انتھونی اسپیکنگ..... مجھے تحمل سے بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' انتھونی نے رسانیت سے کہا۔ معیز کا فون کسی اجنبی کے پاس.....

نرمالہ کا دل یکبارگی ڈوب گیا۔

''کیا وہ کسی مشکل میں تھا؟'' وہ مضطرب ہو گئی۔

''معیز کہاں ہے..... اور تم کون ہو؟'' وہ ہراساں ہو کر ایکدم چلائی۔

''میں ہیڈ کانسٹیبل مارک انتھونی ہوں۔ ہمیں یہاں ہارو اسٹریٹ کے قریب ایک لڑکا زخمی حالت میں ملا ہے۔ مجرم موقع واردات سے فرار ہو گئے ہیں لیکن ہم جلد اُن تک پہنچ جائیں گے اور یہ موبائل بھی اسی لڑکے کی گاڑی سے برآمد ہوا ہے۔'' انتھونی نے اسے مفصل انداز میں بتاتے ہوئے انتہائی تحمل سے نرم لہجہ میں کہا۔ وہ اُس کی پریشانی کا اندازہ کر سکتا تھا۔

''آفیسر..... وہ ہم..... میرا..... دوست ہے..... معیز خان۔'' وہ لڑکھڑاتے لہجے میں کہتی ہوئی بری طرح رو دی۔

''لیکن وہ اِس حالت میں کیسے؟'' انتہائی پریشانی میں بھی وہ تحیر زدہ تھی کہ معیز کی ایسی حالت کا ذمہ دار کون ہو سکتا تھا اُس کی تو کسی کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہ تھی۔

''کار روائی پوری ہونے تک میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' انتھونی نے کندھے اچکائے۔

اُس کے ماتحت ساتھی معیز کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''فی الوقت ہم زخمی کو ہاسپٹل لے جا رہے ہیں تم بھی وہیں آ جاؤ..... ہمیں تم سے کچھ معلومات بھی درکار ہیں اور تمہارا اسسٹنٹ بھی لیتا ہو گا مس نرمالہ۔'' انتھونی نے سنجیدگی سے اُسے سمجھاتے ہوئے فون بند کر دیا اور گاڑی کے Glove Box میں سے ڈاکومنٹس چیک کرنے لگا' گاڑی کے پیپرز کے علاوہ لائسنس اور ایک کارڈ بھی ملا جس پر اُس کے سارے کوائف درج تھے۔ وہ معیز خان ہی تھا۔

نرمالہ اشکوں کی بوچھاڑ کو گلابی ہتھیلیوں سے روکتے ہوئے تیز قدموں سے بھاگتی ہوئی پارکنگ میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھی۔

''کاش میرے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر تم تک پہنچ جاؤں۔'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اُس نے اپنے مسلسل بہتے آنسوؤں کو ایک بار بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اِن گزرے چند لمحوں میں اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اُس کی رگ و جاں سے بھی زیادہ قریب تھا۔

''معیز تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ بابا جی...... پلیز...... ساڈی مدد کرو۔'' اُس نے پوری شدت سے دعا مانگی۔

☆......☆......☆

آپریشن تھیٹر کے سامنے بے قراری سے ٹہلتے آدم خان گویا پل صراط پر چل رہے تھے۔ زندگی کبھی اس موڑ پر بھی لے آئے گی انہوں نے سوچا تک نہ تھا۔ اُن کا اکلوتا نورِ نظر آپریشن تھیٹر میں زندگی اور موت کے درمیان جھول رہا تھا۔ دو موٹے موٹے آنسو اُن کی براؤن آنکھوں کے کناروں پر ٹھہر سے گئے۔ شاید ہی وہ عمر بھر بھی روئے ہوں لیکن ظالم وقت نے دشمن روپ دھار کر اُن کے کلیجے پر وار کیا تھا۔

''یا خدا...... میرے بیٹے کا قصور کیا تھا؟'' اُس کی بچپن سے لے کر جوانی تک کی ساری زندگی کسی فلم کی طرح آدم خان کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ وہ اونچا لمبا زندگی کی حرارتوں سے بھرپور کھلکھلاتا ہوا لڑکا بند آنکھوں سے اب دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ حسرتیں آدم خان کے دل پر پاؤں رکھ کر انہیں کچلنے لگیں۔

وہ زخم زخم ہو گئے۔

''اوئے تیمور خاناں...... میرا بچہ...... تجھے کچھ ہو گیا تو تیرا بابا جی نہیں پائے گا۔'' متورم سوجی آنکھوں اور شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے OT کے سامنے لکڑی کے بینچ پر بیٹھتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے۔

کبھی وہ مضبوط اعصاب کے مالک ہوا کرتے تھے لیکن اس وقت تو وہ ایک بے بس اور بوڑھے باپ تھے جو اس غم میں نچڑے پڑے تھے کہ کہیں اپنے اصولوں کی جنگ میں وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو تو نہیں دیں گے۔

''کیا ایمانداری کی قیمت چکانا اتنا مشکل ہے۔'' غم و غصہ اُن کے رگ و پے میں اتر کر اُن کے پورے وجود کو آرے کی طرح چیرنے لگا۔

وہ انہی سوچوں میں مستغرق تھے کہ ایک انتہائی کم سن نرس' جو سفید یونیفارم میں ملبوس تھی اُن کے قریب آئی اُس کے چہرے پر انتہائی کرختگی اور آنکھوں میں سرد مہری تھی۔

''آپ آدم خان ہیں؟'' اُس نے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''جی ہاں......'' آدم خان خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے غائب دماغی سے سر ہلانے لگے۔

''آپ کے لیے کال ہے'' لڑکی موبائل اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے انتہائی سرعت سے تقریباً بھاگتے ہوئے واپس جانے کو لپکی۔

اُس کے اس عجیب و غریب رویے پر آدم خان ہونقے رہ گئے۔

''میرے لیے کس کی کال ہو سکتی ہے..... اور یہ موبائل فون...... ؟'' وہ اچنبھے سے موبائل کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دفعتاً موبائل تھرتھرانے لگا' کسی نے اُسے وابریشن پر کیا ہوا تھا۔

کسی پرائیویٹ نمبر سے کال آ رہی تھی۔ آدم خان جیسے مخمصے میں پھنس گئے۔ آخر کچھ سوچ کر انہوں نے کال آن کی۔

''ہیلو......'' وہ متفکر انداز میں بولے۔

''ہیلو...... آدم خان...... کیسا ہے اب آپ کا بیٹا تیمور خان......؟'' طنزیہ لہجے میں ڈوبا انداز کچھ جانا پہچانا سا تھا۔

آدم خان کا دماغ اتنا ماؤف ہو رہا تھا کہ اُن کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مکمل طور پر سلب ہو رہی تھیں۔

''کک...... کون؟ کون بات کر رہا ہے؟'' وہ سخت لہجے میں کہتے ہوئے لڑکھڑائے۔

''اتنی جلدی بھول گئے اپنے خیر خواہ کو؟'' مدمقابل زہریلی ہنسی ہنسا۔

آدم خان کے اردگرد گویا دھماکے ہونے لگے۔

تنفر سے اُن کی رگوں میں لہو لاوے کی طرح ابلنے لگا...... اور قوتِ گویائی جیسے سلب ہو گئی۔

''سکتہ کیوں طاری ہو گیا آدم خان؟ میرے لوگوں سے آپ کی ملاقات کو اتنی دیر تو نہیں ہوئی کہ آپ سب بھول جائیں۔'' اب کی بار اُس کے لہجے میں سانپ کی پھنکار تھی۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا...... '' آدم خان اردگرد کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے بلند آواز سے دھاڑے۔

کئی لوگ بیک وقت اُن کی طرف متوجہ ہوئے لیکن انہیں کوئی ہوش نہیں تھا' وہ مزید کسی خسارے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

''آپ مجھ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے آدم خان......'' سرد و تند لہجے میں تنبیہ چھپی ہوئی تھی۔

آدم خان کا فشارِ خون بلند ہونے لگا...... بے بسی سے وہ لب کچل کر رہ گئے۔ لہو کی کئی بوندیں اُن کے ہونٹوں سے چھلک گئیں۔

''اگر عافیت چاہتے ہیں...... تو وہ کاغذات ہمارے حوالے کر دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں ہم آپ کو کبھی بھی کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اور نہ ہی آپ کے خاندان پر کوئی آنچ آنے دیں گے...... ہم سے دوستی کر لیں آدم خان...... ہم آپ کو آپ کی سوچ سے بڑھ کر نوازیں گے۔'' دھمکی آمیز لہجہ آخر میں مکارانہ حد تک مصالحانہ انداز لیے ہوئے تھا۔

آدم خان جان گئے تھے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ وگرنہ مخالف شخص شاید کبھی بھی اتنی مفصل گفتگو کا عادی نہ رہا تھا۔

''چاہے تم مجھے جان سے مار دو' لیکن آدم خان کبھی بھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرے گا۔'' وہ چبا چبا کر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔

''بے وقوف' ضدی آدمی...... یہ مت بھولو کہ تمہارا اکلوتا بیٹا ابھی بھی ہماری دسترس سے دور نہیں ہے۔'' وہ حقارت سے بولا تو آدم خان یکدم چونک گئے۔

''DHQ میں تمہارے پاس اتنے قریب آ کر اگر تم تک موبائل پہنچایا جا سکتا ہے۔ تو تمہارے بیٹے تک رسائی کیا مشکل ہو گی ہمارے لیے؟'' وہ شاطرانہ انداز میں آدم خان کو چاروں طرف سے گھیر رہا تھا۔ وہ آدمی یقیناً بہت بڑا گیم چینجر تھا' مقابل کے دماغ سے کھیلنے والا اور اب بھی وہ اپنا داؤ کھیل گیا تھا۔

آدم خان کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ موبائل اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ انہوں نے تیزی سے چاروں اطراف نظریں گھمائیں لیکن وہ موبائل تھمانے والی نرس انہیں کہیں دکھائی نہیں پڑی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے تیزی سے اُس کوریڈور کی طرف بڑھے جہاں وہ لڑکی واپس پلٹ کر گئی تھی لیکن وہ کوریڈور بالکل خالی تھا۔

وہ لڑکی تھی یا چھلاوا؟ جو چند منٹوں میں منظر سے غائب ہو گئی تھی۔

یوں تیزی سے بھاگنے کی وجہ سے اُن کی سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے واپس پلٹے تو اُن کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ ڈگمگا گئے۔ لیکن اِس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن کھو کر زمین بوس ہوتے دو مضبوط بازوؤں نے اُنہیں اپنی آہنی گرفت میں لے کر فوراً سہارا دیا۔

کتنا شاسا سانس تھا اُن کی بند ہوتی آنکھیں یکبارگی کھل گئیں۔

''معید۔۔۔'' صدمے سے نیلے پڑتے ہونٹوں سے نحیف سی آواز نکلی۔

''عم جان..... پلیز ہوش کریں..... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' معید خان کے بعد دیگرے پڑنے والی مصیبتوں پر بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ ابھی تو تیمور خان والا صدمہ ٹل نہیں ہوا تھا کہ چچی جان کے بعد عم جان بھی اپنے حواس کھو رہے تھے۔

''اوہ گاڈ۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟'' وہ سخت گھبراہٹ کا شکار تھا۔ اس کبیدہ صورت حال میں وہ بالکل تنہا پڑ گیا تھا۔ تیمور آپریشن تھیٹر میں۔۔۔ چاچی جان ایمرجنسی میں اور اب عم جان بھی..... وہ اُنہیں سہارا دے کر قریبی بینچ پر لے آیا۔ وہ اپنے قدموں پر بمشکل وزن ڈال کر چل رہے تھے۔ انہوں نے بے بسی سے معید کے کندھے سے سر ٹکا دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگے گویا صدیوں کی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ معید کو اِس ایک لمحے میں وہ سالوں کے بوڑھے لگے۔ اُن کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں اتنی گہری تھیں کہ معید خان کا دل بھی یکبارگی ڈول گیا۔ بے بسگی میں اُس نے اُن کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور قریب سے گزرتے وارڈ بوائے کو اشارے سے پانی کا گلاس لانے کو کہا جسے تھامتے ہی آدم خان ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گئے۔

''عم جان..... یہ سب کیا ہو گیا..... تیمور کو گولی کیسے لگی؟ اور آپ یہاں اِس حال میں؟'' چند ساعتوں کے توقف کے بعد معید نے بے قراری سے مستفسر ہوتے ہوئے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اِس سے زیادہ وہ اپنے صبر پر بند نہیں باندھ سکتا تھا۔ پریشانی سے اُس کے اندر عجیب کھد بد مچی ہوئی تھی۔

''معید..... بچہ! پری اور تمہاری چچی جان کہاں ہیں؟'' اُس کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ مضطرب سے ہو کر اٹھے۔ اُن کے چہرے سے بے چینی ہویدا تھی۔ اُن کے دماغ پر صرف تیمور کی فکر سوار تھی' لیکن معید کو دیکھتے ہی انہیں پریشے اور زرین گل کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ کہاں تھیں؟ اور اُن پر کیا قیامت بیت رہی تھی۔

معید پہلو بدل کر رہ گیا۔ عم جان اُس کے سوال کو یکسر نظر انداز کر گئے تھے۔ اُس کے عصاب کشیدہ ہونے لگے۔ اُس نے اپنے اندر چیخ چیخ کر شور مچاتے سوالوں کو بری طرح جھڑک دیا۔ اور خود کو کمپوز کرنے کے لیے ایک گہرا سانس لیا۔

عم جان کی حالت کے پیش نظر وہ اُن کے ساتھ کسی بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

''عم جان! چچی جان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا..... وہ ایمرجنسی میں ہیں پریشے اور خانم اُن کے پاس ہیں۔'' اُس نے آہستگی سے بتایا۔

چچی جان کو ایمرجنسی میں ایڈمٹ کروا کے وہ خانم اور پریشے کو اُن کے پاس رُکنے کا کہہ کر ریسپشن سے آدم خان اور تیمور کی بابت دریافت کرتا ہوا آدم خان تک پہنچا تھا۔

''کیا ہو گیا زرین گل کو؟'' وہ متفکر سے ہو اٹھے۔

''تیمور کی خبر سنتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔'' اُس نے سنجیدگی سے بتایا۔

''لیکن آپ پریشان مت ہوں' ڈاکٹر سے میری بات ہوئی ہے اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔'' ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھتے ہوئے اُن کی تشفی کے لیے اُس نے مفصل جواب دیا۔

''بابا.....'' پریشے انہیں دیکھتے ہی تیزی سے اُن کی طرف یوں لپکی' جیسے صدیوں کی بچھڑی ہو۔

''بابا..... آپ کیسے ہیں؟ آپ کو کچھ ہوا تو نہیں..... اور تیمور وہ کہاں ہے؟'' وہ اُن کے سینے کے ساتھ لگی یوں بلک بلک کے رونی کہ آدم خان کو اُسے چپ کروانا مشکل ہو گیا۔ وہ جو کب سے محض اماں کی خاطر مضبوط بنی بیٹھی تھی بابا کو دیکھتے ہی اپنا ضبط گنوا بیٹھی' معید بے چارگی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''پری خود کو سنبھالو میری بیٹی.....'' آدم خان محبت سے محبت کا سر تھپکتے ہوئے بولے تو پریشے کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ وہ بچوں کی طرح اُن کے مشفق سینے سے لگی کھڑی تھی۔

بابا کا وجود اُن کا یہاں اُس کے ساتھ ہونا' اُسے تحفظ کے مضبوط احساس سے ہمکنار کر گیا۔

''پریشے! تم میری بہادر بیٹی ہو..... تیرے بابا کے ہوتے تمہارے بھائی پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ تمہیں اِس مشکل وقت میں اپنی اماں کو سنبھالنا ہو گا بس.....'' انہوں نے ناصحانہ انداز میں اُسے سمجھاتے ہوئے آہستگی سے خود سے الگ کیا۔ تو وہ سر ہلا کے رہ گئی۔

''لیکن بابا! تیمور کہاں ہے؟ اور یہ حادثہ کیسے ہو گیا؟'' اب وہ خود کو قدرے سنبھال چکی تھی۔ سوا ستفہامیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

''وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ گولی اُس کے سینے میں لگی ہے۔ لیکن ہمیں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' وہ بیٹی کے سامنے ایک لمحہ کو بھی کمزور نہیں پڑے تھے۔

آپ کیسا ''سچی کہانیاں'' چاہتے ہیں؟

قارئین کرام اور لکھاری دوستو! سچی کہانیاں آپ کا اپنا ماہنامہ تھا' ہے اور رہے گا۔ آپ سچی کہانیاں میں کیا تبدیلی یا اضافہ چاہتے ہیں؟ فوری طور پر خط تحریر کر کریں یا دفتری نمبرز پر گروپ ایڈیٹر سے فوراً رابطہ کریں۔ ہم آپ کی قیمتی آراء اور مشوروں کے منتظر ہیں۔

پر بیٹھے کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا وہ سہم گئی۔

''بابا تیمور کی حالت سیریس ہے ناں؟ ہمارا تیمور خطرے میں ہے؟'' انجانے وسوسوں میں گھر کے وہ ہذیانی ہو کر بولی۔ آنکھوں کے سامنے ہنستے مسکراتے تیمور کی شبیہ جیسے ٹھہر سی گئی۔

''میرا بھائی..... میرا تیمور.....'' وہ سسکی۔

وہ بہت حساس اور نازک مزاج تھی اِس حادثے کے پیچھے کیا وجوہات تھیں آدم خان معاملے سب گول کر گئے تھے۔ اور حالات کی نزاکت کو جانتے ہوئے پریشے نے بھی مزید کریدنا مناسب خیال نہیں کیا۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو بیٹی! ہمارے تیمور کو کچھ نہیں ہوگا۔'' انہوں نے مضبوط انداز میں کہا۔ وہ مایوسی کو خود پر غالب نہیں ہونے دے سکتے تھے۔ پریشے لب بھینچ کر رہ گئی۔

''تمہاری اماں کہاں ہیں؟ اُن کی طبیعت میں کچھ سنبھالی آئی؟'' وہ گھمبیر لہجے میں بیٹی سے مستفسر ہوئے۔ جس سے وہ کوریڈور میں ہی مل لیے تھے۔

''اماں کو ہوش آ گیا ہے..... لیکن اُن کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ بار بار تیمور سے ملنے کی ضد کر رہی ہیں۔'' وہ مایوسی و دلگرفتگی سے بولی۔

''زرین گل.....'' آدم خان بڑبڑائے۔ بیوی کا تیمور سے والہانہ لگاؤ اُن سے چھپا نہ تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

ایک اور امتحان آدم خان کا منتظر تھا۔

''تم کہاں جا رہی تھی پری؟'' اب کی بار معید پری سے مستفسر تھا۔

''اور..... چچی جان کو تنہا کیوں چھوڑا؟'' وہ فکرمندی سے اُسے دیکھنے لگا۔

''میں ڈاکٹر سے ملنے جا رہی تھی کہ اماں کو روم میں شفٹ کریں اور انہیں کوئی سکون آور انجکشن دیں' وہ پھر سے Anxiety کا شکار ہو رہی تھیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں' تم چچی جان کے پاس جاؤ۔'' معید نے قدم بڑھائے۔

''میں بھی ساتھ چلوں؟ اماں کے پاس خانم ہیں انہیں اماں کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے آئی ہوں۔'' وہ تیزی سے بولی تو معید کے اٹھتے قدم رک گئے۔

''شاید وہ چچی جان کے لیے اتنی حساس ہو رہی تھی کہ کسی پر بھروسہ نہیں کر پا رہی تھی۔'' معید نے ایک لمحہ کو سوچا اور بے اختیار آدم خان کی طرف نگاہ اٹھی۔ انہوں نے تائید طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔

''آؤ.....'' مختصر سا جواب عجب سپاٹ انداز لیے ہوئے تھا لیکن پری کے پاس اِس وقت اُس کے لہجے پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا۔

''بابا آپ اماں سے مل لیں..... میں ڈاکٹر سے بات کر کے آتی ہوں۔'' وہ بابا کا ہاتھ دبا کر کہتی ہوئی معید کے پیچھے ہولی۔

آدم خان نپے تلے قدموں سے اندر داخل کی طرف بڑھے۔ اور اُن کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔

(اس دلچسپ ناول کی چوتھی قسط آئندہ ماہ پڑھیے)

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند' آپ کا انتخاب

مرتب: اشعر جواد

قیمتی جواہرات

اللہ تعالیٰ نے اس امت کی رہنمائی کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار کم و بیش انبیاء کرام کو اس عالم میں مبعوث فرمایا۔ سب سے آخری لاڈلے پیغمبر' مہ جبین پیغمبر محمد رسول ﷺ کو مکہ مکرمہ میں مبعوث فرمایا۔ آقا ﷺ کی ولادت باسعادت ماہ ربیع الاول میں ہوئی ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ رب العزت نے ہر صفات و کمالات سے کامل مکمل بہترین دلنشین جملہ اوصاف حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ پیدا فرمایا۔ آپ ﷺ کی زندگی امت کے لیے آئیڈیل نمونہ بنایا۔ آپ ﷺ کے نقش قدم پر ہی جنت کا عکس نظر آتا ہے' آپ ﷺ کی ادائیں نرالی' آپ ﷺ کی گفتگو شیریں' آپ ﷺ کے ارشادات' کمالات کے مالک' آپ ﷺ کا اٹھنا بیٹھنا' شگوفے کا پھوٹنا' آپ ﷺ کی تعلیمات' ارشادات' سنتوں میں' اطاعت خداوندی' رضائے الٰہی' انعام باری تعالیٰ پنہا ہے۔ آپ ﷺ سے عشق و محبت' اطاعت و الفت' دخولِ خُلد بریں کا باعث ہے آپ ﷺ کے اصحابؓ جو عشق و محبت کی بے مثل' بے مثال لاانظیر داستان رقم کیں' کتب سیر میں ایسے واقعات و لطائف بھریں ہوئے ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ جب خلیفہ بنے تو جمعہ کے لیے منبر پر آئے' کھڑے ہوئے تو حیران ہو گئے کتنی دیر کھڑے رہے اور پھر اتنا کہا۔ ''اس منبر پر میرا محبوب خطبہ دیتا تھا۔'' اتنا کہا پھر منبر سے گر گئے۔

کہنے لگے کہ صدیق ہے اور محبوب نظر نہیں آ رہا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ چیخیں نکلیں اور مسجد میں کہرام مچ گیا۔ فرمایا آج میں کیسے اِس منبر پر کھڑا ہوں جس منبر پر میرا محبوب کھڑا ہوتا تھا۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ بارش شروع ہوئی تو مسجد نبوی کی چھت ٹپکنے لگی' پانی اندر آ گیا غالباً حضرت عمرؓ اٹھے' کہنے لگے حضرت آپ اِس چھت کو بدلیں' یہ چھت پرانی ہو چکی ہے۔ پانی بہہ رہا ہے۔ صدیق خطبہ چھوڑ کر چلے آئے وہ کپڑے اپنے منہ پر ملنے لگے' کپڑوں پر ملنے لگے' بار بار دیکھتے تھے کہ یہ پانی وہاں سے آ رہا ہے جہاں میرے محمد ﷺ کے ہاتھ لگے تھے۔ جہاں حضور ﷺ نے چھڑیاں رکھی تھیں یہ پانی نہیں میرے محبوب کی نشانی ہے یہ عاشق رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نبی اکرم ﷺ سے مومنین اولین صحابہ کرام جیسی سچی محبت نصیب فرمائے آمین۔

بحوالہ خطبات دیوبند (ابوالحسن مولانا شہید الاسلام مصری)

خیال آرائی

انسانی زندگی کے ہزاروں واقعات ایسے ہیں جو عقل کی محدود چار دیواری سے گزر کر ملک دل کی لامحدود وسعتوں سے تعلق رکھتے ہیں ہم دنیا کے ہر واقعے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں ہمارے لیے بعض اوقات نہایت ہی معمولی باتیں طلسم بن کر رہ جاتی ہیں اس لیے کہ جو حرکات وسکنات ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں ہمارے لیے معمہ بن جاتی ہیں۔ آج کل کی ماؤں کو قرون الوطنی کی ایک بہادر ماں کی تمنائیں اور دعائیں کس قدر عجیب معلوم ہوتی ہوں گی اپنے جگر کے ٹکڑوں کو آگ اور خون میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کی آرزو انہیں کس قدر بھیانک معلوم ہوتی ہوں گی اپنے بچوں کو بلی کا خوف دلا کر سلانے والی مائیں اُن کے متعلق شیروں کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے خواب کب دیکھتی ہوں گی ہمارے کالجوں ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں پلے ہوئے نوجوانوں کا علم اور عقل پہاڑوں کی بلندی اور سمندر کی گہرائی کو خاطر میں نہ لانے والے مجاہدوں کے دلوں کا راز کیسے جان سکتی ہے۔ رباب کے تاروں کی جنبش کے ساتھ لرز جانے والے نازک مزاج انسانوں کو تیروں اور نیزوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے والے جواں مردوں کی داستانیں کس قدر حیرت ناک ہوتی ہوں گی گھونسلے کے گرد چکر لگانے والی چڑیا عقاب کے انداز پرواز سے کس طرح واقف ہوسکتی ہے۔

............*

حسنِ انتخاب

کوئی بزم کیا سجاؤں میرا شہر جل رہا ہے
کھلا کیسے مسکراؤں میرا شہر جل رہا ہے
ترے شہر میں بہاریں میرے شہر میں خزاں ہے
کوئی پھول کیا کھلاؤں میرا شہر جل رہا ہے
تیرے شہر میں چراغاں میرے شہر میں اندھیرا
کوئی دیپ کیا جلاؤں میرا شہر جل رہا ہے
ترے شہر میں ہے ساون میرا شہر تشنہ لب ہے
میں یہ کیسے بھول جاؤں میرا شہر جل رہا ہے
اسی آگ میں جلوں گا اسی خاک میں ملوں گا
اسے کیسے چھوڑ جاؤں میرا شہر جل رہا ہے
وہاں قہقہوں کی گونجیں یہاں ماتمی فضائیں
کوئی گیت کیا سناؤں میرا شہر جل رہا ہے
میرے شہر کے بدھاسی ابھی سو رہے ہیں عارف
انہیں کس طرح جگاؤں میرا شہر جل رہا ہے

حسن انتخاب: فیضان حسین عثمانی۔ حیدرآباد

گردہ

''صاحب میرا بچہ بیمار ہے کچھ مدد کرو۔'' صبح صبح یہ جملے سیٹھ کو ناگوار گزرے۔ اس نے چائے کے کپ سے سر اٹھایا۔

''شرم کرو ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو۔''

آدمی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

'' بھکاری نہیں ہوں صاحب' رکشا چلاتا ہوں۔'' سیٹھ نے جھنجلا کر کہا۔

'' تو جاؤ رکشا چلاؤ' میرا دھندا کیوں خراب کر رہے ہو؟''

'' رکشے کی آمدنی سے بیٹے کا علاج ممکن نہیں۔''

سیٹھ کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

'' تو بھائی' اپنا ایک گردہ بیچ دو۔'' آدمی کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

'' صاحب' ایک گردہ تو... پہلے ہی بیچ چکا ہوں۔'' سیٹھ پر کپکپی طاری ہو گئی ساری چائے کپڑوں پر گر گئی۔

............*

بھول

'' بیٹا کسی لڑکی کو پسند کرتے ہو؟'' اُن دنوں امی نے میرا سہرا سجانے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔

'' آپا ثریا کی بیٹی کو۔'' میں نے تھوڑی جھجک کے بعد بتایا۔

یوں تو آپا ثریا کی کئی بیٹیاں تھیں مگر مجھے صرف وہی بھائی تھی۔ باقی تو بالکل الٹ تھیں۔

بالآخر آج ہم سفر بننے کے بعد ملن کی گھڑی تھی۔ نئی زندگی کا باقاعدہ آغاز اضطرب نقطہ عروج پر تھا۔

گھونگھٹ اٹھایا تو چکرا کر گرتے گرتے بچا۔

'' میں امی کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ میں تیسرے نمبر کی بیٹی کو پسند کرتا ہوں۔''

............*

برداشت

گل زمان ہماری بلڈنگ کا گارڈ تھا۔ ہر صبح برف مانگنے آجاتا۔

میں غصہ کرتا تو وہ سر جھکا لیتا۔

''سرد علاقے سے ہوں صاحب' گرمی برداشت نہیں ہوتی۔''

ایک صبح میرا موڈ خراب تھا۔ اُسے کھری کھری سنادیں۔ پھر وہ گاؤں لوٹ گیا۔ کچھ ماہ بعد کام کے سلسلے میں میرا کوئٹہ جانا ہوا۔

ایک رات سائٹ لوٹتے گاڑی برفانی طوفان میں پھنس گئی۔ ٹھنڈ ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ کچھ دور روشنی دکھائی دی۔ کوئی ریسٹ ہاؤس تھا۔

میں ٹھٹھرتا ہوا پہنچا گھنٹی بجائی دروازہ کھلا تو......

گل زمان سامنے کھڑا تھا۔ پہلے خاموشی رہی۔ پھر میں نے سر جھکا کر کہا۔

'' میں گرم علاقے سے ہوں گل زمان' ٹھنڈ برداشت نہیں ہوتی۔''

انتخاب: اقبال خورشید

دکھی باپ کا بیٹے سے مکالمہ

لرزتے کانپتے ہونٹوں سے ایک بزرگ نے دی صدا
بتاؤ مجھے لخت جگر کیوں دے رہے ہو مجھے اتنی سزا
تمہیں کھلونے دلانے کیلیے میں بیاری میں مزدوری کرتا تھا
لاڈ پیار تمہارا دیکھا تمہارے نام کی تسبیح ہر وقت پڑھتا تھا
بتاؤ تو میرے لاڈلے کب تمہیں باپ نے تنہا تھا چھوڑا
بیوی بچوں کے لیے آج جس سے اپنا ہر ناطہ تم نے توڑا
اچھا کھلایا پلایا پیار اپنایا چھوٹے ہونے کے ناطے بےحد پیار کیا
آج اسی کے لقمے گنتے ہو تم جس نے اپنا آپ تم پر نثار کیا
مجھے باسی روٹی بھی کئی کئی دن تک کھانے کو نہیں ملتی
بھوک ہے نصیب میرا اس کے علاوہ کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی
تم سے بات کرنے کو میرا اول روز ترستا تڑپتا بلکتا ہے
میرا اونچا سننے سے تم اُکتاتے ہو تمہارا کلیجہ منہ کو پڑتا ہے
اتنی باتیں سنیں تو بیٹا غم و غصے سے چیخا
تدفین کے پیسے تمہاری کھانسی پر لگ گئے اس نے اپنا سر پیٹا
پالتے ہیں سارے باپ ایسے ہی انوکھا کام کون سا تم نے کر ڈالا
میں کوئی یتیم نہیں تھا جسے بڑا کر کے احسان مجھ پر تم نے کر ڈالا
رال بہتے منہ سے مجھے کراہیت بہت آتی ہے سمجھو ابا
ہر بات پھر تم دہرا دہرا کر پوچھتے ہو ستاتے اتنا ہو کیوں ابا
ماں بھی برسوں پہلے قبر میں سوئی تم بھی مر کیوں نہیں جاتے
اتنی گولیاں ملاتا ہوں نیند کی تم ابدی نیند سو کیوں نہیں جاتے
بات صاف ظاہر ہے مجھے تم سے بس یہی ایک گلہ ہے
بچاسی برس کے اوپر کے ہو کے ابھی زندہ ہو تم نے آب حیات پیا ہے
جھریوں زدہ چہرے سے باپ بولا ایک دن تم بڑا پچھتاؤ گے
لکھ رہے ہو میرے پہ جو کہانی اولاد سے وہی سن پاؤ گے
مجھے تو میرا اللہ اس فانی دنیا سے ایک دن نکال دے گا
مگر تجھے جہنم کی باقی و دائمی دنیا میں ڈال دے گا
نحیف ہاتھوں سے پسینہ پونچھتے دکھی باپ سب اتنا پھر بولا

میں تو تیری جنت تھا بیٹے تو نے جسے اپنے ہاتھوں سے ہے کھویا

انتخاب: اینلا طالب۔ بھدے شریف' گوجرانوالہ

شاہد خان آفریدی

شاہد خان آفریدی ایک جارح مزاج بلے باز اور شاطر گیند باز ہے اُس نے دنیائے کرکٹ کو ایک نیا اسٹائل دیا! اکثر اوقات وکٹ پر جاتے اُسے خارش شروع ہو جاتی ہے ہر گیند کو چھیڑنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور گیند پر اتنا ظلم ڈھاتے ہیں کہ اُس بے چاری کی چیخیں تک نکلوا دیتے ہیں' اندھا دھند مار دھاڑ میں وہ بعض اوقات اونچے اونچے چھکے رسید کرتے ہیں وہ چھکے لگاتے ہیں تو ہوا میں کھیل کر اور آؤٹ ہوتے ہیں تبھی ہوا میں کھیل کر ایسا لگتا ہے کہ اُن کی ہوا سے گہری دوستی ہے گیند کو اسٹیڈیم بدر کرنے کے چکر میں وہ اُن کی وکٹ اکثر اوقات دو فرلانگ دور جا پڑتی ہے ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں آفریدی گردی کو بھی امریکہ دہشت گردی قرار دے کر اُس کے خلاف بین الاقوامی پابندیاں نہ لگوا دے سنا ہے کہ لڑکیاں کرکٹرز کو چھیڑتی ہیں آفریدی نے چھیڑنے میں لڑکی کو پہل کر کے اس فرسودہ روایت کو توڑ ڈالا بے دانش ضد کر کٹر ہمیشہ بال کو میریٹ پر کھیلتا ہے مگر موصوف انڈے پر آؤٹ ہو کر یوں خوش ہوتے ہیں جیسے غریب بازار جانے سے پہلے خوش ہوتا ہے مگر انہوں نے اپنی غیر ذمہ دارانہ رویہ نہ بدلا تو پھر لڑکیاں انہیں چھیڑنا شروع کر دیں گی اور انہیں برقعے کی تلاش میں مارے مارے پھرنا ہو گا۔

خیال آرائی: چوہدری قمر جہاں۔ ملتان

باتوں سے خوشبو آئے

☆......غیبت کرنے والا اور غیبت سننے والا برابر کے گناہ گار ہیں۔

☆......دوسروں کی غیر موجودگی میں اُن کے متعلق اچھے الفاظ استعمال کرو تمہاری غیر موجودگی وہ تمہارا تذکرہ اچھے لفظوں میں کرے گا۔

☆......اُجلے کپڑے پہننے سے رنج و غم دور ہو جاتے ہیں اور نماز قبول ہوتی ہے۔

☆......جو شخص یہ چاہے کہ اُس کی عمر دراز ہو تو اُسے چاہیے کہ ناشتہ سویرے کرے اچھا پہنے۔

☆......جسے زیادہ غصہ آتا ہے اُس کے دوست کم ہوں گے۔

☆......جسے قرض لینے اور خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں وہ سب سے بڑا مالدار ہے۔

☆......پڑھنے سے انسان 'بیدار' ہوتا ہے بولنے سے گفتگو کی 'تمیز' آتی ہے لکھنے سے ذہن ہو کر معاشرے کے لیے 'بہتر انسان' بنتا ہے۔

☆......غمگین کے سامنے ہنسنا بے ادبی ہے کسی کو اعلانیہ نصیحت کرنا برائی کا پیش خیمہ ہے۔

☆......ہر بلا مصیبت کے پس منظر میں رحمت و نصیحت ہے۔

☆......جو لوگ تمہارے دوست بننا چاہتے ہیں ان کے دوست بنو۔

☆......اپنی زیادہ تعریف کرنا 'ہلاکت' کا باعث ہے۔

☆......نصیحت وہی کارگر ہوتی ہے جو عمل کی زبان میں ہو۔

☆......اگر تو امانت کی حفاظت ضروری نہ سمجھے گا تو تیری آنکھ میں غفلت کا پانی اتر آئے گا اور حق تعالیٰ اپنی رحمت کا دروازہ تجھ پر بند کر دے گا۔

☆......اے عمل کرنے والے 'اخلاص' پیدا کر ورنہ مشقت فضول ہے۔

☆......'موت' کو یاد رکھنا نفس کی تمام برائیوں کی دعا ہے۔

☆......'مومن' بات کم کرتا ہے عمل زیادہ منافق عمل میں گیا گذرا ہوتا ہے اور اپنی نیکیوں کی تشہیر زیادہ کرتا ہے۔

☆......اس شخص کے ساتھ دوستی کرو جو نیکی کر کے بھول جاتا ہو۔

☆......حقیقی تصوف یہ ہے کہ قرآن پاک دائیں ہاتھ اور سنت رسول کی باتیں بائیں ہاتھ میں دو شمعوں کی مانند پکڑے اور ان دونوں کی روشنی اور رہنمائی میں چلے تاکہ گمراہی کے گڑھے میں نہ گر جائے بدعت کی تاریکی سے محفوظ رہیں۔

☆......گناہ کے بعد ندامت کا آنسو بھی توبہ کی ایک شکل ہے۔

☆......کردار ایک ایسا 'ہیرا' ہے جو پتھر کو کاٹ سکتا ہے۔

انتخاب: مسز نگہت غفار۔ کراچی

باپ ایک انمول رشتہ

دوستوں کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اللہ پاک نے ہم پر کتنی برکتیں نازل کی ہیں۔ اس نے ہمیں خوبصورت رشتے عطا فرمائے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو ہم اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کرتے۔ ان میں سے خوبصورت ترین رشتہ والد کا رشتہ بھی ہے۔ جو بچپن سے لے کر ہمارے ناز نخرے اٹھاتا ہے۔ لیکن اُف تک نہیں کرتا باپ سارا دن محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کے لیے روزی کماتا ہے تاکہ میری اولاد آج بھوکی نہ سوئے۔ باپ وہ لفظ ہے جس کو ادا کرتے ہوئے دونوں ہونٹ خوبصورتی سے آپس میں مل جاتے ہیں۔ باپ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ اپنا ٹھکانا جنت میں بنائے تو وہ جنت کے اس دروازے (باپ) کی قدر کرے۔ اگر کوئی اپنے باپ کو بیماری اور کمزوری کی حالت میں پائے تو اسے بھی وہی سہارا محبت اور چاہت دے جو اُس نے اپنی جوانی میں دی۔ اس کے کمزور کندھوں کے ساتھ اپنے کندھوں کو اس طرح ملائے کہ اسے محسوس نہ ہو کہ بڑھاپے نے اس کے کندھوں کی طاقت چھین لی ہے۔ ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھیں کہ باپ کی ناراضگی اللہ پاک کی ناراضگی ہے۔ باپ جس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے اپنی اولاد کو پالا اور اعلیٰ تعلیم دلائی کہ وہ معاشرے میں باعزت مقام بنا کر سر اٹھا کر جی سکیں۔ وہی اولاد جب ترقی کی دوڑ میں شامل ہوتی تو اس دوڑ میں اسے یہ تک یاد نہیں رہتا کہ دو آنکھیں اس کی راہ تک رہی ہیں کہ میری اولاد میرا حال دریافت کرنے کے لیے میرے پاس آئے۔ بعض باپ اس انتظار میں آنکھیں بند کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ تب جا کر اولاد کو احساس ہوتا ہے کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں سوائے ندامت آنسو اور پچھتاوے کے ہوا۔ بعد میں اولاد سوچتی ہے کہ کاش ہم اپنی جنت کی قدر کرتے۔ دوستو کیا آپ کو پتہ ہے کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ باپ کی نافرمانی ہے اس کے سامنے اُف تک نہ کہو۔ بلکہ اس کی دعائیں لو اس کی عزت و احترام کرو یہ وہ نعمت ہے جو ایک بار چھین لی جائے تو دوبارہ نہیں ملتی صرف ایک بار ملتی ہے۔ چنانچہ آپ آج سے ہی اپنے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا شروع کر دیں۔ اس سے آپ اُس کی دعاؤں کے حصار میں رہیں گے۔ باپ اول تو اپنی اولاد کو کبھی بس بددعا یا آہ نہیں دیتا۔ اور اگر وہ اپنی اولاد سے تنگ آ کر بددعا یا آہ دے دے تو

وہ کسی رکاوٹ کے بغیر سیدھی آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔لہٰذا باپ کی بددعا اور آہ سے بچنا چاہیے' میں آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے باپ کی عزت کریں۔ (مذمت) اللہ پاک ہم سب کو باپ کا فرمان بردار بنائے آمین اور ہمیں ہر وقت اس کے حق میں ہر وقت دعا کرنی چاہیے۔

یاد رکھیں' یہ بات ثابت ہے کہ جیسا آپ اپنے باپ کے ساتھ سلوک کریں گے ویسے ہی آپ کی اولاد آپ کے ساتھ سلوک کرے گی۔ فیصلہ آپ کے ساتھ میں ہے۔

............*

ماں ایک عظیم ہستی

'م' سے شروع ہونے والا لفظ ماں محبت احساس اور غور کے الفاظ سے بنی وہ تسبیح ہے جسے انسان آخری وقت تک پڑھتا رہتا ہے۔ ماں ایک دعا سایہ پھول اور مشعل کا نام ہے۔محبت کا ایسا چشمہ ہے جسے دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دلوں میں ڈھیروں سکون اترتا ہے۔اپنے آپ کو لٹا کر اولاد کی تربیت کرتے ماں سورج کی روشنی میں شجر سایہ دار' پریشانی اور تھکن کی دھوپ میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ماں ہی تو ہے۔ماں ممتا کا گھنا درخت جس کی چھاؤں میں دکھوں کی تپش کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ان ماؤں نے انتہائی خراب و خستہ حالات میں سخت محنت کرکے ایسے سپوت ملت اسلامیہ کو دیے۔ جن کی خدمات تاریخ ساز ہیں اور آفرین بھی ہیں اللہ پاک نے ماں کی خدمت کو حصول جنت کا راستہ بتایا ہے۔ ماں ایک لفظ نہیں بلکہ محبتوں کا مجموعہ ہے۔ماں کا لفظ سنتے ہی ٹھنڈی چھاؤں اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ایک عظمت کی دیوی اور بہت کچھ قربان کردینے والی ہستی کا تصور ذہن میں آتا ہے ماں' محبتوں کی چاشنی ہے۔انجانی سی خوشیوں میں نرم گرم وجود میں مہکی آغوش میں پُرسکون نیند میسر آتی ہے۔انسان دنیا میں دولت' طاقت' ذہانت اور فراست سے سب کچھ حاصل کرسکتا ہے مگر انسان اپنی ماں کو کھو کر دوسروں کی ماں نہیں خرید سکتا۔ ایسا بے لوث رشتہ دنیا میں آج تک قائم نہیں ہوا۔ ماں اور اولاد کی محبت انمول ہے۔ ماں کا رشتہ اٹوٹ رشتہ ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔اسی لیے کہ ہمارے ہر دن کو ہماری ماں کی دعاؤں کے سامنے ہی طلوع ہونا چاہیے۔ کیونکہ ماں کا تقدس ہم سب پر لازم ہے۔ ماں کے لبوں سے نکلنے والی دعاؤں کی وجہ سے ہماری ہر کامیابی کا راز ہے۔آپ اپنی ماں کی اہمیت' شخصیت کو اسلامی نقطہ نظر سے اس کے رشتے کو اتنا بلند کریں کہ ماں کے پیار کا پیمانہ چھلک جائے اس کی دعائیں ہمیشہ کی طرح عرش کو پار کرکے آپ کے لیے جنت کا ذریعہ بن جائیں۔ ماں' ایک ایسا لافانی لاجواب لفظ ہے جس کی عزت و ادب کرنا بہت بڑا فرض ہے۔ جس کا بدلہ کامرانیوں اور جنت کے سوا کچھ نہیں' عالمی ادب میں ممتا کے جذبات کے اظہار کے لیے ہزاروں شہ پارے موجود ہیں۔ ماں اگر پھول ہے تو اسی کا پیار پھولوں کی خوشبو اور مہک ہے۔ ماں پُرخلوص اور بے لوث جذبات کا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔دنیا کا بدقسمت اور بدنصیب وہ شخص ہے جو اپنی ماں کے ساتھ بڑا سلوک کرتا ہے۔آیئے' ہم سب ماں کی خدمت اور احترام کریں اور اللہ پاک ہمیں ایسا کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔یاد رکھیں ماں کی خدمت میں ہی جنت ہے مائیں تو بہت ہیں مگر نیک ماں بہت مشکل سے ملتی ہے کیونکہ اولاد کی صحیح تعلیم تربیت ایک نیک ماں ہی کرسکتی ہے۔

............*

میرے بھائی میرے سائبان

دوستو! بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جو بہت احترام کا مقام رکھتے ہیں ایسے ہی احترام کا مقام رکھنے والے میرے بڑے بھائی مرحوم جناب شیخ شوکت الٰہی بھی ہیں۔جنہیں میں کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔ بھائی شوکت کا انتقال حال ہی ہوا ہے۔وہ کافی عرصہ سے سخت علیل تھے۔یہ ایک ایسا سانحہ ہے جو عمر بھر بھلایا نہیں جاسکے گا۔ کیونکہ والد محترم جناب شیخ نصیب الٰہی کی وفات کے بعد صرف میرے یہی بھائی تھے جنہوں نے مجھے سنبھالا تھا۔ انہوں نے مجھے دنیا کی اونچ نیچ سکھائی' روزہ' نماز کا پابند بنایا' برے دوستوں سے دور اور اچھی صحبت میں بیٹھنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔وہ مجھے اکثر کہا کرتے تھے کہ معظم' دنیا ایک گنبد کی مانند ہے لہٰذا تم جو بھی آواز اپنے منہ سے نکالو گے اسی کی گونج تمہیں ضرور سنائی دے گی۔لہٰذا تم اپنے منہ سے جو بھی بات نکالو تو سوچ سمجھ کر نکالو۔ ان کی پھولوں کی طرح مہکتی مسکراہٹیں' پیاری عادتیں اور اس کے ساتھ مسکراتے گزرتے لمحات بہت یاد آتے ہیں۔ بہت مشکل ہے یہ سب کچھ بھلانا اور پھر اس سوچ کے ساتھ کہ بھائی شوکت الٰہی کی زندگی کے لمحات کو یاد کرنا جو انہوں نے ہم سب گھر والوں یعنی میرے میری بہنوں اور میری بھابی کے ساتھ گزارے یہ ایک ایسا غم ہے جو آناً فاناً بجلی کی طرح نمودار ہوا اور سب کچھ مٹی کا ڈھیر بنا گیا۔زندگی ان کے بغیر اُداس اور ویران ہوگئی ہے۔میرے خاندان میں اب کوئی بزرگ نہیں رہا جو میرے سر پر ہاتھ رکھ سکے۔ ہمارے صرف یہی بھائی تھے جو ہم سب بھائی بہنوں کا بہت خیال رکھتے تھے بھائی شوکت الٰہی نے اپنی ساری زندگی انسانی خدمت میں گزار دی۔وہ اپنے محلے کے ہر آدمی کے دل میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے وہ لوگوں کے غموں اور دکھوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اللہ پاک میرے بھائی کو اپنی رحمتوں کے سائے تلے رکھے اور ان کے درجات کو بلند کرے آمین۔

انتخاب: شیخ معظم الٰہی' لاہور

غزل

تجھے عشق ہو خدا کرے
کوئی تجھ کو اس سے جدا کرے
تیرے ہونٹ مسکرانا بھول جائیں
تیری آنکھیں پُرنم رہا کریں
تو اس کی باتیں کیا کرے
تو اس کی باتیں سنا کرے
اسے دیکھ کر تو ٹھہرے
وہ نظر جھکا کر چلا کرے
تجھے ہجر کی ایسی جھڑی لگے
تو ملن کی ہر پل دعا کرے
تیرے خواب بکھریں ٹوٹ کر
تو کرچی کرچی چنا کرے
تو نگر نگر پھرا کرے
تو گلی گلی صدا کرے
تجھے عشق ہو پھر یقین کرے
اسے تسبیحوں پر پڑھا کرے
میں کہوں عشق ڈھونگ ہے
تو نہیں نہیں کہا کرے
تجھے عشق ہو خدا کرے

............*

سنہرے اقوال

انسانیت وہ چیز ہے جو دشمن کو بھی سہارا دیتی

ہے اور احساس وہ چیز ہے جس میں غیر کا دکھ بھی اپنا لگتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا۔

"جنت کی خوشبو پانچ سو میل تک آئے گی لیکن دو لوگوں کو نصیب نہیں ہوگی ایک وہ جن لوگوں نے ماں باپ کی نافرمانی کی ہوگی اور دوسرا جن لوگوں نے رشتہ داری اور دوستی ختم کی ہوگی۔"

زندگی ایسی اذان سے شروع ہوتی ہے جس کی نماز نہیں اور ختم ایسی نماز پر ہوتی ہے جس کی اذان نہیں ہوتی۔

جب جب ہم خاموش رہ کر سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں تو دنیا کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ مگر ایک آدھ بھی حقیقت بیان کر دی تو سب سے برے لگتے ہیں۔

خضر حیات۔ خوشاب

غزل

کسی کی آس بن کر پھر اُسے تنہا نہیں چھوڑا کرتے
بھلا کتنی بھی مشکل ہو مگر ایسا نہیں کرتے
محبت میں شکایات کا کہاں دستور ہوتا ہے
گلہ کر کے محبت کو کبھی رسوا نہیں کرتے
وفائیں تو حقیقت میں بڑی انمول ہوتی ہیں
کبھی اپنی وفاؤں کا صلہ مانگا نہیں کرتے

..........*

دوست

دوست دوست نہیں دل کی دعا ہوتا ہے محسوس
تب ہوتا ہے جب وہ جدا ہوتا ہے بنا دوست کے
جینا بھی سزا ہے اگر دوست خدا کی طرف سے
نعمت عطا ہے۔ دوست ایک سائے کی طرح ہے
جب تک روشنی میں رہے ساتھ رہتا ہے اور جب
اندھیرا ہو جاتا ہے تو ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اپنی
زندگی میں ایسے دوست بناؤ جو آئینہ اور سایہ بن کر
آپ کے ساتھ رہیں کیونکہ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا

اور سایہ ساتھ نہیں چھوڑتا۔

محمد دانیال۔ خوشاب

غزل

دل یہ چاہتا ہے مقدر سے چرا لیں تم کو
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سجا لیں تم کو
اپنی آنکھوں کے دریچوں میں چھپا کر رکھیں
دل کی دھڑکن کے کسی تار پہ گا لیں تم کو
چاہتے ہیں تری چاہت میں مٹا دیں ہستی
زندگی کی کسی قیمت پہ کما لیں تم کو
پھر وہی عشق کی بازی وہی دیوانہ پن
پھر وہی ضد کہ کسی موڑ پہ پا لیں تم کو
بتا خوف میں ہر بار کیے دیتا ہے
ایک دھڑکا ہے کہیں پھر نہ گنوا لیں تم کو
آج تک ار کا موسم ہے بساط دل پر
دور کر دیتی ہیں ہر وقت کی چالیں تم کو
مٹ گئے ہیں تو یہ مٹی سے ہنر سوچتے ہیں
اپنی تصویر بنا رکھیں یا دُعائیں تم کو
اب کسی موڑ پہ ہم بھول تمہیں جائیں گے
اس مقدر سے لڑیں یا کہ سنبھالیں تم کو

اشعر ظفر۔ کراچی

تمہاری باری

دانیال: "میں اپنی دادی سے بہت تنگ تھا، جب بھی کسی کی شادی ہوتی وہ میرے گال پکڑ کر کہتیں، اب تمہاری باری ہے۔ پھر میں نے ان کی یہ عادت ختم کروا دی۔"

مجاہد نے پوچھا: "وہ کیسے؟"

دانیال: "جب کوئی فوت ہو جاتا تو میں اپنی دادی کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہتا: دادی امّاں! اب تمہاری باری ہے۔"

ایشا شایان۔ کراچی

☆☆.....☆☆

نقشِ قدم

ماہنامہ 'دوشیزہ' بہت جلد اپنے صفحات پر ایک نئے سلسلے 'نقشِ قدم' کا آغاز کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اُن خواتین کے انٹرویوز شامل ہوں گے' جو زندگی کے مختلف شعبوں کے علاوہ سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں منتظم کے فرائض انجام دے رہی ہیں..... 'نقشِ قدم' سلسلہ ہے اُن خواتین کی صلاحیتوں کے اعتراف اور تشہیر کا' جو مردوں کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے صرف معاشرے کی فلاح و بہبود میں ہی اپنا کردار بہت مثبت انداز میں ادا کر رہی ہیں' ساتھ ہی زندگی اور بندگی کا حق بھی ادا کر رہی ہیں۔

چڑھتے سورج کو سلام

مشہور فاتح جرنیل نپولین بوناپارٹ کو جب جنگ میں شکست دینے کے بعد انگریزوں نے ایک دور دراز جزیرے میں نظر بند کردیا تو فرانس کے شاہ پرست اخباروں نے اُس کے خلاف زہر اگلا اور خوش ہوئے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد نپولین اِس جزیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تو انہوں نے اس واقعے پر یہ سرخی لگائی۔ ''وحشی درندہ اپنے قید خانے سے بھاگ نکلا۔'' نپولین نے فوج جمع کرنے کے بعد فرانس کی طرف پیش قدمی کی تو اخباروں نے لکھا۔ ''قاتل فرانس کی طرف نکلا ہے۔'' اور جب نپولین فرانس میں داخل ہوگیا تو انہوں نے یہ سرخی جمائی۔ ''نپولین بوناپارٹ فرانس میں داخل ہوگیا۔'' اور جب وہ پیرس سے چند میل کے فاصلے پر رہ گیا تو اُن اخباروں نے جلی حروف میں اطلاع دی۔ ''عالی مرتبت' جہاں پناہ' شہنشاہِ فرانس کل پیرس میں جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔''

معذرت

میں معذرت چاہتا ہوں کہ میری مرغی آپ کے لان میں نئے نکلنے والے پودے کھا گئی ہے۔''

''معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا بلا آپ کی مرغی کو کھا گیا ہے' حساب برابر ہوگیا۔''

''میرے خیال میں یہ کہنا مشکل ہے۔ ابھی میں گھر آرہا تھا' اچانک آپ کا بلا میری گاڑی کے نیچے آکر کچلا گیا۔''

مرسلہ: علی رضا' حیدر آباد۔

تجزیہ

ایک صاحب ایک تحریر کا نمونہ لے کر اس کا تجزیہ کرانے ماہرِ تحریر شناس کے پاس پہنچے۔ وہ تحریر کا تجزیہ کرنے کے بعد بولے۔ ''یہ الفاظ لکھنے والا شخص انتہائی تحمل مزاج' صابر' شائستہ اور بامروت ہے۔''

''بس......بس......ٹھیک ہے۔'' وہ صاحب مطمئن ہوکر بولے۔ ''دراصل میں جس کالونی میں شفٹ ہوا ہوں' یہ وہاں کے جنرل اسٹور کا مالک ہے۔ میں اس سے ادھار سودا لینا شروع کررہا ہوں۔''

مرسلہ: اعجاز شاہ' نواب شاہ۔

یک نہ شد......!

ایک ہیلتھ کلب میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک باڈی بلڈر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''کیا آپ کے پاس چالیس کلو ویٹ ہے؟''

باڈی بلڈر نے کہا۔ ''ہاں ہے۔''

دوسرے صاحب نے کہا۔ ''اٹھا لیجیے۔''

یہ جواب سن کر باڈی بلڈر کو بہت غصہ آیا۔ اس نے ٹیلی فون ایکسچینج سے اس فون کے متعلق پوچھا۔

آپریٹر بولا۔ ''اِن باتوں کو کتنی دیر ہوگئی ہے؟''

''تقریباً پانچ منٹ۔'' باڈی بلڈر نے کہا۔

آپریٹر بولا۔ ''آپ تھک گئے ہوں گے لہٰذا ویٹ رکھ دیجیے۔''

مرسلہ: محمد سلیم' کراچی۔

غزل

آنکھوں سے میرے اس لیے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی
اَب عمر نہ موسم نہ وہ رستے کہ وہ ملتے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی
مانگے تو اگر جان بھی ہنس کر تجھے دے دیں
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی
ہم جان سے جائیں گے تبھی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

(وصی شاہ) حسنِ انتخاب: ایم شاہد' سارو کی۔

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو جمادی الاول کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ جمادی الاول کے لفظا معنی ہیں سختی اور قحط...... جب زمین بارش کے لیے ترستی ہے۔ بارش کا نہ برسنا تمام جانداروں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے اور اللہ کی ناراضگی کو بھی ظاہر کرتا ہے' ہم لوگ بھی اس ناراضگی کے سبب بارش کو ترستے ہیں پھر بھی اپنے اعمال درست نہیں کرتے' اللہ ہم سب کو معاف فرمائے اور ہمارا شمار اپنے مقرب بندوں میں کرے آمین۔

□ راشدہ شکیل۔کراچی

o بابا جی! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ آپ سے دانتوں کے لیے دوالی تھی مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ میری اتنی پرانی اور گندی تکلیف دور ہوگئی۔ دانتوں سے خون اور پیپ آنا بند ہوگیا ہر قسم کا درد ختم' بد بو بھی نہیں آتی اب میں سب کچھ کھا سکتی ہوں۔ بابا جی اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ دوا جاری رکھوں یا بند کردوں اور کیا کسی اور کو بھی دے سکتی ہوں۔ میری فیملی میں اکثر لوگوں کو دانتوں کے مسائل ہیں۔

☆ بیٹی راشدہ! خوش رہو میں نصیحت کروں گا کہ دوا جاری رکھو۔ کم از کم تین ماہ تا کہ تکلیف پلٹ کر نہ آئے۔ یہ دوا بچے بڑے سب استعمال کر سکتے ہیں۔ بلکہ جن بچوں کے دانت میٹھا کھانے سے خراب ہوگئے ہیں وہ بھی استعمال کریں تو سیاہی اور درد سب دور ہوجائے گا اور نئے دانت اچھے نکلیں گے۔

□ ناعمہ۔چکوال

o بابا جان السلام علیکم! میں نے اپنی بچی کے آپریشن کے ٹانکے بگڑنے پر آپ سے دوالی تھی وہ چھ ماہ سے جس اذیت میں تھی میں بتا نہیں سکتی مگر دوا کے استعمال کے تین دن بعد ہی زخم مندمل ہونے لگا اور اب تقریباً خشک ہوگیا ہے بابا جان وہ اتنی تکلیف اٹھا چکی ہے کہ دوا ترک نہیں کرنا چاہتی کیا وہ یہ دوا ہمیشہ جاری رکھ سکتی ہے۔

☆ بیٹی ناعمہ! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے شفا عطا کی بندہ تو خود اس کا محتاج ہے۔ دوا ایک ماہ مزید استعمال کرواؤ پھر روک دو' بلاوجہ دوا کا استعمال کرنا بھی درست نہیں۔

□ فضل اللہ۔پشاور

o بابا صاحب! میں نے اپنی والدہ کے کہنے پر آپ سے بیرون ملک نوکری کے لیے تعویذ لیا تھا۔ الحمدللہ میرا ویزہ آگیا ہے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تعویذ یہیں رہنے دوں یا اپنے ساتھ لے کر جاؤں اور جو دعا آپ نے بتائی تھی وہ جاری رکھوں؟

☆ بیٹے اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات نسخے کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

چہرے پر رونق نہیں ہے' کیل مہاسے' جھائیاں ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے دوا بچی کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

پابندی رکھنا اور درود شریف پڑھتے رہنا' تعویذ جانے سے پہلے تلف کردینا ورد جاری رکھو اللہ سب خیر رکھے گا۔

□ فاخرہ حبیب۔لاہور

o بابا جی میں بہت پریشان ہوں۔ میرا کوئی کام بھی پورا نہیں ہوتا۔ پڑھائی بھی پوری نہیں کرسکی نوکری کی کوشش کررہی ہوں مگر کوئی جاب ہیں ملتی۔ رشتے بہت آتے ہیں مگر انکار ہوجاتا ہے یا جواب ہی نہیں دیتے۔ میری وجہ سے گھر والے بھی پریشان رہتے ہیں اور اب تو مجھے بھی بروقت بہت غصہ آتا ہے۔ مجھے کوئی ایسی دعا بتائیں جس کی برکت سے میں اس کیفیت سے نکل آؤں اور تمام رکاوٹیں بھی دور ہوجائیں۔

☆ بیٹی فاخرہ! تم جانتی ہو کہ تمہارے معاملات میں رکاوٹ کی اصل وجہ بدنظر ہے۔ تم بدنظر کا شکار ہو اس لیے تمہارے کام ہوتے ہوتے رک جاتے ہیں اکثر لوگوں کو پتہ ہی نہیں ہوتا اور ساری زندگی مسائل ہی میں گزر جاتی ہے۔ نماز کی پابندی رکھو درود شریف بہت پڑھو اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد بہت کرو۔ والدین سے کہو حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالا کریں۔

□ رعنا طاہر۔فیصل آباد

o بابا جی! میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اولاد نرینہ کے لیے آپ سے تعویذ لیا تھا۔ رب العزت نے مجھ پر ایسا کرم کیا اور میں جڑواں بیٹوں کی ماں بن گئی۔ ہمارے خاندان کے یہ پہلے بچے ہیں صحت مند اور خوبصورت ہیں میرے سسرال اور میکے والے سب بہت خوش ہیں۔ بابا جی میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں سمجھ نہیں آتا۔ اللہ آپ کو اسی طرح ہمارے سروں پر قائم رکھے' بابا جی تعویذ کا کیا کروں؟

☆ بیٹی رعنا! اللہ کا شکر ادا کرو میں تو خود اس کا محتاج ہوں۔ ہاں رب کا شکر ادا کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اس کے بندوں کی مدد کیا کرو۔ اس عمل سے آنے والی تمام مشکلیں ٹل جاتی ہیں۔ تعویذ پانی میں بہادو۔

□ زینب۔کھاریاں

o بابا جان میں اپنی بچیوں کے رشتوں کو لے کر بہت پریشان ہوں بیوہ عورت ہوں ہر ضرورت کے لیے بیٹے کی طرف دیکھتی ہوں چاہتی ہوں اپنی زندگی میں بچیوں کی شادی کردوں۔ میرے بعد تو بھاوج نوکرانی بنا کر رکھے گی۔ میری زندگی میں ہی اس کا رویہ بہت برا ہے۔ بیٹا بھی بیوی کی باتوں پر زیادہ یقین کرتا ہے۔ مجھے پریشانی سے رات بھر نیند نہیں آتی۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں میرا یہ مسئلہ حل کردیں جو کہیں گے میں وہ کروں گی۔

☆ بیٹی زینب! تم ماں ہو تمہاری پریشانی بجا ہے مگر بیٹی یاد رکھو اس قدر پریشان رہنا کہ راتوں کو جاگنا ثبوت ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل اعتقاد نہیں ہے۔ ایک بار اپنے معاملات اس پر چھوڑ کر دیکھو سب ٹھیک ہوتا چلا جائے گا۔ نماز کی پابندی رکھو' درود شریف بہت پڑھو نماز عشا کے بعد ایک ہی نشست میں بیٹھ کر گیارہ سو مرتبہ سورۃ بقرۃ آیت 652 پڑھو اول و آخر پہلا کلمہ انشاء اللہ 21 دن میں ہی اچھی خبر ملے گی۔

□ کامران اختر۔U.K

o بابا صاحب! میرے ایک جاننے والے نے آپ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ میں 40 سال

سے لندن کے ایک مضافاتی علاقے میں مقیم ہوں۔ پچھلے چار سال سے میں اپنے گھر میں کسی کی موجودگی محسوس کرتا ہوں۔ دھویں کی شکل میں وہ ہر وقت گھر میں وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ میرے کپڑے بھی پہن کر گھومتی ہے۔ بیوی کا برقعہ بھی پہن لیتی ہے مگر یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب گھر میں کوئی نہ ہو سوائے میرے شروع میں بیوی کو بھی نظر آتی تھی پر اب نہیں' بچے کبھی کبھی کہتے ہیں کہ رات میں دو آنکھیں انہیں گھورتی ہیں۔ بابا صاحب گھر میں نماز روزہ کی پابندی ہے۔ میں بہت پابندی سے خیرات بھی کرتا ہوں۔ اس مسئلے کی وجہ سے کافی پریشانی ہے آپ رہنمائی کیجیے۔

☆ بیٹے کامران! اللہ تعالیٰ کی اس دنیا میں انسانوں کے علاوہ جنات بھی بستے ہیں اور بالکل انسانوں کی طرح ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی جو برے ہیں وہ شیاطین کہلاتے ہیں۔ تمہارے گھر میں بچہ ہے جو فی الحال تو باعث نقصان نہیں مگر بعد کا نہیں کہا جاسکتا۔ مناسب ہوگا مجھ سے گھر میں رکھنے اور گھر کے تمام افراد کے لیے تعویذ منگوالو تاکہ حفاظت رہے۔ صبح و شام آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر اور گھر کے دیگر افراد کے اوپر ضرور دم کیا کرو۔ اللہ سب خیر رکھے گا۔

□ شاہد برکی۔ کراچی۔

○ باباجی! السلام علیکم! ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں آپ کا کالم پڑھا' جس طرح آپ دُکھی انسانوں کی خدمت کرتے ہیں' اللہ آپ کو اس کا اُجر دے۔ (آمین!) باباجی! میں نے دو سال پہلے کرائے کی دُکان لی' دُکان میں' میں نے بچوں کی چیزیں ٹافی' چاکلیٹ' بسکٹ وغیرہ رکھے ہیں۔ دُکان کا کرایہ 1,500 نکال کر میرے پاس 1,000 روپے بچتے تھے۔ میں نے دُکان میں پی سی او بڑھایا تاکہ میری

بالوں کا گرنا' خشکی' بے جان بال ان سب کے لیے جڑی بوٹیوں سے تیار 150 سو سال پرانا نسخہ...... اب آپ بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ رابطہ
......35893121-35893122

آمدنی زیادہ ہو۔ پہلے پہلے یہ کام خوب چلا پھر ٹھنڈا ہوگیا۔ رمضان میں عید کارڈز لگائے کہ ان میں کچھ بچت ہوجائے لیکن وہ بھی نہیں چلے۔ باباجی! سردی کے مہینے میں چکن سوپ لگایا' ایک ہفتے تک تو آٹھ کلو سوپ روز نکل جاتا تھا لیکن اَب دو کلو سوپ بھی نہیں نکلتا تھا۔ باباجی! اَب میں دُکان میں مال بڑھانے سے بھی ڈرتا ہوں کہ جتنا بھی مال بڑھالوں' بچت وہی کرایہ نکال کر 1,000 سے 1,500 روپے تک ہی ہوتی ہے۔ باباجی! میری روزی میں رکاوٹ ہے یا کسی نے بندش کروائی ہے؟ آپ استخارہ کرکے بتائیں اور جو بھی وظیفہ دیں' اس کے پڑھنے کی تعداد کم ہو جو میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ باباجی! ہمارا گھر عین صرافہ بازار میں ہے۔ اَب میں سوچتا ہوں کہ میری امی گھر میں کھانا بنادیں تو میں دُکانوں میں ٹفن دے آؤں' لیکن باباجی! ڈر لگتا ہے کہ اگر سوپ کی طرح ٹفن بھی نہیں چلے تو ہمارا سارا پکا ہوا کھانا بےکار جائے گا۔ باباجی! میں اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا ہوں۔ میں نے انٹر کا امتحان دیا ہے۔ دُعا کریں' میرا رزلٹ اچھا آئے۔ باباجی! اگر تعویذ کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتادیں کہ تعویذ کس طرح منگواؤں؟ باباجی! وظیفہ زیادہ بڑا نہ ہو' اتنا ہو کہ میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ میری روزی کے دروازے چاروں طرف سے کھل جائیں تاکہ میں اپنے والدین کو حج پر بھیج سکوں۔ (آمین!)

☆ بیٹے شاہد! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت

اندرونی اور بیرونی زخموں' آپریشن کے بعد ٹانکوں کا کچا رہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب ہے۔ جن گھروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر میں خون جمنے نہیں دیتی' دوا حاصل کرنے کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

پڑھو۔ بیٹے! تعویذ منگوانے کے لیے تفصیل درکار ہوتی ہے۔ تم مجھے اپنا مکمل نام مع والدہ اِرسال کرو۔ جوابی لفافے پر واضح پتا لکھو تاکہ تمہیں تفصیل اِرسال کی جاسکے۔

□ رحمان۔ مقام نامعلوم۔

○ باباجی! دُعا کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں۔ باباجی! بات کچھ اس طرح سے ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے دُکھوں کو اپنے اردگرد گھومتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اللہ نے ہمارے باپ اور چچا کو اتنی دولت دے رکھی ہے کہ ان کو خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس کتنی دولت ہے؟ مگر اس کے باوجود وہ اتنے کنجوس ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا۔ باباجی! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جہاں پر اس نے ہمیں اتنا کنجوس باپ دیا ہے' وہیں پر اس نے ہمیں پہاڑ جیسا حوصلہ رکھنے والی ماں بھی دی ہے۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے باپ کے خلاف اتنا کیوں ہوں؟ تو بات یہ ہے کہ ان کے پاس دولت تو ہے مگر ہمارا گھر اتنا خراب ہے کہ میں بتا نہیں سکتا تو پھر میں یہ سوچتا ہوں' یہ دولت کس کام کی ہے؟ آج تک کسی اولاد نے اپنے باپ پر لعنت نہیں بھیجی ہوگی مگر میں اپنے باپ پر اور اس کی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ بات بات پر میری ماں سے جھگڑتا ہے جس کی وجہ سے میری ماں نے کئی مرتبہ خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اللہ نے اس کو بچالیا ہے۔ باباجی! میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ہماری ماں کو کچھ ہوگیا تو میں اپنے باپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ برائے کرم آپ مجھے کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیں کہ جس کے کرنے سے ہم اپنا گھر بنانے میں کامیاب ہوجائیں بلکہ ہمارے باپ اور چچا کے دل کو اللہ نرم کردے اور باباجی! آپ بھی ہمارے لیے دُعا کریں کہ اللہ ہمیں بھی خوشی کے دن دکھائے۔ (آمین!)

☆ بیٹے رحمان! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہمارا مذہب ہمیں توازن کی نصیحت کرتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال کا راستہ اپنانا چاہیے۔ ہم سب کو یہی دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ اپنے تمام بندوں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ کچھ بھی ہے' وہ تمہارے والد ہیں' ان کے بارے میں برا مت سوچو۔ والدہ کو سمجھاؤ' زندگی اللہ کی اَمانت ہے' اس کی حفاظت کریں۔ رزق کا وعدہ اللہ کا ہے لہٰذا بےفکر رہو۔ والد اور والدہ دونوں کا خیال رکھو اور اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ والدہ سے کہو' نماز فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار سورۃ فاتحہ پڑھیں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فرح رضوان۔ لاہور

○ السلام علیکم! باباجی! اس سے پہلے بھی میں نے خط لکھے اور آپ نے میرے مسائل کو حل کیا۔ باباجی! میری عمر 40 سال ہے' اچانک میرے منہ پر داڑھی اور مونچھوں والی جگہ بال نکل رہے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بال مستقل ختم کرنے کا نسخہ بتائیں تاکہ میں اس پر عمل کروں۔ اگلے شمارے میں ضرور میرے لیے نسخہ لکھ دیجیے گا۔ بہت بہت شکریہ!

بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکسیر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے' اپنا آرڈر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

☆بیٹی طلعت! تمہارا مسئلہ شدید نوعیت کا نہیں۔ کسی اچھے پارلر سے رابطہ کرو۔ اِس مسئلے کے لیے خواتین گرم ویکس استعمال کرتی ہیں مگر تجربے کار خاتون سے ہی رجوع کرو۔

□ طاہرہ رئیس۔ چیچہ وطنی

○ بابا جی! السلامُ علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی! میری عمر 18 سال ہے۔ میں چیچہ وطنی سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو چاہتی ہوں۔ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی اور کو چاہتا ہے اور میں اس کی چاہت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اس لڑکے پہ اس کی چاچی نے کافی جادو تعویذ وغیرہ کیے ہیں اور وہ اسی کی باتوں پر عمل کرتا ہے۔ بابا جی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو میں چاہوں تو میری شادی اس کے ساتھ ہو جائے۔ یہ وظیفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ کر سکوں گی۔ بابا جی! میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتی رہوں گی۔ بابا جی! میرا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میرے ابو بہت سخت ہیں' وہ ذرا ذرا سی بات پہ ہماری بے عزتی کر دیتے ہیں۔ بابا جی! مجھ کو ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ ہم سے پیار کریں اور انہیں کوئی اچھی سی نوکری مل جائے۔ میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔

☆بیٹی طاہرہ......! جہاں تک پسندیدگی کا تعلق ہے تو بیٹی یہ معاملہ اپنے والدین پر چھوڑ دو وہ تمہارے لیے بہتر فیصلہ کریں گے۔ اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بہ کثرت پہلے کلمے کا ورد کرو۔ مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد 99 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ رزق میں برکت کے لیے یَاغَنِیُّ یَامُغْنِیُّ کا بہت ورد کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ رُقیہ احمد۔ کراچی۔

○ محترم بابا جی! اَلسلامُ علیکم! میرا یہ پہلا خط ہے اور میرا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ میری شادی کو 12 سال ہو گئے ہیں اور میں اولاد کی نعمت سے اَب تک محروم ہوں۔ ہم میاں بیوی تمام ٹیسٹ کروا چکے ہیں۔ میں اپنی جگہ ٹھیک ہوں' خرابی میرے شوہر میں ہے۔ انہوں نے کافی علاج کرایا لیکن بات نہیں بنی۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں' میں اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی ہوں اور اُن کو الزام نہیں دیتی' بس صبر کرتی ہوں۔ میرے شوہر بھی اِس بات پر بہت پریشان ہیں۔ اتنی ٹینشن ہے کہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر جیسے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ میں اُن کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہوں۔ آپ کے بارے میں پڑھ چکی ہوں کہ آپ خلقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں' سو اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی اچھا سا وظیفہ ارسال کر دیں۔ زندگی بھر دُعاؤں میں یاد رکھوں گی۔ میرے اور میرے شوہر کے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ (آمین!) میرا دوسرا مسئلہ میرے بہنوئی کا ہے۔ میرے بہنوئی کی کوئی مستقل سروس نہیں ہے۔ فی الحال سروے کا کام کرتے ہیں۔ تنخواہ بھی زیادہ نہیں۔ دو بچے ہیں۔ گزارہ بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ مہینے کا آخر تو ہمیشہ اُدھار پر چلتا ہے۔ اُن کے لیے بھی کوئی اچھا سا وظیفہ دیں۔ ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

☆بیٹی رُقیہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ جو شخص اللہ کو راضی کر لیتا ہے' وہ کامیاب رہتا ہے۔ بیٹی! اولاد کے لیے تعویذ دیتا ہوں' تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو' میں تفصیل ارسال کر دوں گا۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بہن سے کہو' نماز فجر' ظہر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح یارزاق پڑھے۔ اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ گل بانو۔ مقام کراچی۔

☆بیٹی گل! تم نے جو اپنی کیفیت لکھی ہے' وہ معدے کی خرابی کی وجہ سے ہے۔ پانی بہت پیا کرو۔ ہری سبزیاں اور پھل بہ کثرت استعمال کرو۔ بعد نماز فجر ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھ کر پانی پر دَم کر دیا کرو اور یہ پانی دن بھر استعمال کرو۔ استخارہ کا شف والدہ ثریا کے حق میں ہے۔

□ سعدیہ۔ ثمینہ۔ بہار کالونی۔

☆بیٹی سعدیہ! اللہ تمہاری والدہ کو اولاد کا سکھ نصیب کرے۔ بیٹی! تمہیں براہِ راست بھی خط لکھا ہے مگر تم خط پر پتا نامکمل لکھتی ہو۔ شہر کا نام نہیں ہوگا تو خط کیسے پہنچے گا؟ بہرحال بیٹی! دو بہنیں سورۃ اَحزاب فجر کے بعد پڑھیں اور دو بہنیں بعد عشاء پڑھیں' انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ رفعت۔ کراچی۔

☆بیٹی رفعت! آیت الکُرسی پڑھتی رہو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 روز ہے۔

□ کوکب۔ عمرکوٹ۔

☆بیٹی کوکب! تمہارے حالات جان کر بہت دُکھ ہوا۔ ہمت اور صبر سے حالات کا مقابلہ کرو۔ تمہیں اَب اپنی اولاد کی خاطر ڈٹ کر کھڑا رہنا ہے۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی رکھو اور جس قدر ممکن ہو' یَااللّٰہ یَارَحمٰن کا ورد کیا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ بہ روزِ جمعہ بعد نماز ظہر ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ مدت 41 روز ہے۔

□ گلنار۔ فیصل آباد۔

☆بیٹی گلنار! اللہ تمہیں بے شمار خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو اور بہ کثرت یَامُجِیبُ کا ورد کیا کرو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ مدثر پڑھو اور حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ یہی وظیفہ بعد نماز عشاء کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ طلعت الماس۔ کراچی۔

☆بیٹی طلعت! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹی! نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں کم از کم 3 بار آیت الکُرسی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کر لیا کرو یعنی ہر نماز کے بعد ضرور آیت الکُرسی پڑھو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ ر۔ مقام نامعلوم۔

☆بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے کا تعویذ تم احتیاط سے رکھو' ورد جاری رکھو۔ بیٹے سے کوئی بات باہر جانے کے بارے میں مت کرو۔ بیٹے تیمور کا تعویذ تلف کر دو کیونکہ وہ ضعیف ہو چکا ہے۔ صدقہ خیرات خوب کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ فرح۔ لاہور۔

☆بیٹی فرح! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! تمہارے گھریلو حالات جان کر بہت دُکھ ہوا۔

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

میری دُعا ہے کہ اللہ سب کو اپنی ذمے داریاں بخیر و خوبی پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بیٹی! تم نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 111-111 بار پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ریحانہ۔اٹک۔

o باباجی! میں آپ کی بہت بدنصیب بیٹی ہوں۔ 32 سال کی زندگی میں اتنے دکھ دیکھے ہیں کہ اَب زندگی سے خوف آنے لگا ہے۔ اللہ نے مجھے 4 بچے دیئے ہیں۔ مجھے اپنی اولاد سے بہت محبت ہے مگر باباجی! مالی حالات اتنے خراب ہیں کہ میں اور بچے اکثر بھوکے ہی رہتے ہیں۔ شوہر میرا سال بھر پہلے حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ اس کی زندگی میں تو روکھی سوکھی مل ہی جاتی تھی مگر اَب تو حالات بہت خراب ہیں۔ میں اَن پڑھ عورت ہوں' رشتے دار بھی میرے جیسے ہی غریب ہیں۔ چار بچے کون پال سکتا ہے؟ باباجی! میری ماں کہتی تھی' اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے اور یہ اچھے لوگوں کی وجہ سے ہی چل رہی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ سب اچھے لوگ میری ماں کے ساتھ ہی مر گئے۔ اب صرف برے لوگ ہی زندہ ہیں کیونکہ میں جس کے پاس بھی گئی مدد مانگنے' سب نے منع کر دیا۔ میں یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ اللہ کرے' آپ کو میری بات سمجھ آ جائے۔ مجھے کوئی ایسی دُعا بتائیں جس کے پڑھنے سے اللہ مجھ سے راضی ہو جائے اور میرے بچے بھی سب کے بچوں کی طرح پیٹ بھر کر روٹی کھا سکیں۔

☆ بیٹی ریحانہ! اللہ تمہاری مشکلات دور فرمائے۔ بیٹی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اللہ تم سے راضی نہیں؟ اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ بیوہ اور یتیم کا خیال یقیناً وہی لوگ رکھتے ہیں جو جنت میں گھر بنانا چاہتے ہیں۔ یقین رکھو' دنیا میں بہت اچھے لوگ موجود ہیں' اسی لیے یہ دنیا قائم بھی ہے۔ مایوس مت ہو' کڑا وقت سدا نہیں رہتا۔ صبر اور مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 33-33 بار اَلحمد شریف پڑھو اور دُعا کرو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ اپنا مکمل پتا مجھے اِرسال کرو۔

□ سیمن۔لاہور۔

o باباجان! میری عمر 21 سال ہے۔ پچھلے 2 سال سے میرا وزن بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے حالانکہ میں کھانے میں بہت احتیاط کرتی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ اگر وزن اسی طرح بڑھتا رہا تو جوڑوں کے درد میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ وزن کی دوائی دیتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے بھی طریقہ کار بتا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ باباجان! دوسرا مسئلہ میری نند کا ہے۔ اس کے چہرے پر بہت دانے نکل رہے ہیں' اس کے لیے بھی دوا دے دیں۔

☆ بیٹی سیمن.....! مجھے اپنی عمر اور وزن ضرور تحریر کرو۔ دوا میں تیار کر دوں گا۔ اس کے لیے مجھے اپنا پتہ اِرسال کرو۔ ادویات کتنے عرصے کے لیے چاہئیں' یہ بھی تحریر کرو۔ انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

□ قاسم شیراز۔ صوابی۔

o باباجی! میں ایف۔اے میں پڑھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ بہت تعلیم حاصل کروں مگر جو بھی پڑھتا ہوں' بھول جاتا ہوں۔ ٹیچر کے سوال کا جواب بھی نہیں دے پاتا حالانکہ جواب آتا ہے۔ بہت جلدی گھبرا جاتا ہوں اور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔ لڑکے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ باباجی! اگر یہی حالات رہے تو میں کیسے پڑھ سکوں گا؟ شاید میرا مسئلہ آپ کو بہت اہم نہ لگے مگر میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔

☆ بیٹے قاسم......! میں جانتا ہوں کہ تمہارا مسئلہ بہت اہم ہے کیونکہ اِس پر تمہارے مستقبل کا دارومدار ہے۔ تم سب سے پہلے تو اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اگر دن میں 4 گھنٹے پڑھتے ہو تو اَب 8 گھنٹے پڑھو یعنی دوگنا وقت دو۔ نماز پابندی کے ساتھ اَدا کیا کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو۔ نہار منہ 4-3 بادام اچھی طرح چبا کر کھالیا کرو۔
نَصرُ مِنَ اللّٰهِ فَتح "قریب کا بہت ورد کیا کرو۔

□ فرزانہ۔ حیدرآباد۔

o باباجی! مجھے کسی سے پتہ چلا کہ آپ ذیابطیس کی دوا دیتے ہیں۔ میرے گھر میں، میں، میرے شوہر اور بڑی بیٹی اِس مرض میں مبتلا ہیں۔ دنیا کا علاج ہوچکا ہے مگر وقتی فائدے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اَب ہم لوگ علاج کرا کر تھک چکے ہیں، نہ ہمت ہے اور نہ پیسا۔ اَب آپ ہی سے امید ہے کہ آپ ہماری مدد کریں گے۔

☆ بیٹی فرزانہ! اللہ تم سب کو شِفا دے۔ اپنا پتہ اِرسال کرو۔ میں دوا تیار کردوں گا اور انشاءاللہ، جلد افاقہ ہوگا۔

□ صابر شاہ۔ پشاور۔

o باباجی! میں پہلی بار آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ میری عمر 25 سال ہے اور میرا سر تقریباً گنجا ہوچکا ہے۔ پورے سر میں خشکی بھری رہتی ہے حالانکہ میں سرسوں کا تیل بھی لگاتا ہوں۔ بال کم ہونے کی وجہ سے اپنی عمر سے بہت بڑا لگتا ہوں۔ میں نے پڑھا ہے کہ آپ بالوں کی دوا دیتے ہیں۔ پلیز، مجھے جلدی سے دوا بھیجیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہوسکے۔

☆ بیٹے صابر! خط میں اپنا پتہ ضرور لکھا کرو۔ میں دوا کے ساتھ طریقۂ استعمال بھی اِرسال کردوں گا۔

☆☆......☆☆

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!
اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔
☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔
☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
☆ اگر آپ دانتوں کی گوناگوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔
☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔
آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

II 88-C۔ فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

خزانہ

اُس کو مری وفاؤں پر آیا نہیں یقین
ظالم! سمجھ گیا کہ یہ شطرنج چال ہے

انگریزی ادب سے ایک ہوشربا تحریر......
خاص سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے......

نجیب عمر

رچرڈ ہارینگر خوشیوں سے بھرپور زندگی گزار رہا تھا۔ مایوس اور ہار مان لینے والوں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ جیسا کہ بائبل میں مذکور ہے کہ اس دکھوں سے بھری دنیا میں ایسے لوگ بہت تھوڑے

ہیں جو خوش رہنے کا ہنر جانتے ہیں جبکہ رچرڈ ہارینگر کو یہ ادراک تھا۔ واقعتا یہ ایک کمیاب ہنر ہے۔ از منۂ رفتہ میں درمیان کی راہ اپنانے والے اسے بڑی اہمیت دیتے تھے لیکن اب یہ قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ جو لوگ اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے ہیں وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں جو خود پر قابو پانے اور صبر و ضبط کرنے کو نیکی جانتے ہیں۔ ہارینگر خیالات کو جھٹکتے ہوئے سوچتا رہا۔ لوگوں کو خطروں سے کھیلنے دو۔ خوبصورت نگینے کی طرح چمکتے شعلے کو پکڑنے کے شوق میں ہاتھ جلا لیتے ہیں۔ تاش کی بازی میں لوگ ایک پتے کی دستیابی سے اپنی قسمت باندھ لیتے ہیں۔ تنی ہوئی رسی پر چلتے ہوئے یا منزل پا لیتے ہیں یا قبر میں اتر جاتے ہیں یا کسی مہم جویانہ اور جذباتی ہدف کو پانے میں اپنی زندگی داؤ پر لگا لیتے ہیں۔ وہ کسی کی شہرت سے کبھی حسد نہیں کرتا اور ناسمجھی اور بے راہروی سے تباہ ہونے والوں سے کوئی ہمدردی بھی نہیں رکھتا تھا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ ہارینگر ایک خود غرض یا ظالم شخص تھا۔ وہ نہ ظالم تھا اور نہ خود غرض بلکہ لحاظ کرنے والا اور لوگوں کے کام آنے والا تھا۔ ہمیشہ دوسروں کا خیال کرنے والا۔ وہ ذاتی حیثیت میں اس قابل تھا کہ دوسروں کی مدد کر سکے اور ایسا کر کے خوش ہوا کرتا تھا۔ اس کی اپنی دولت بھی تھی۔ ہوم آفس کی ملازمت سے اسے مناسب آمدنی تھی۔ یہ کام اسے پسند تھا اس کے لیے یہ مستقل ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ روزانہ دفتر سے نکل کر کلب جایا کرتا جہاں چند گھنٹے برج کھیلنا اس کا معمول تھا جبکہ ہفتہ اور اتوار کو وہ گولف کھیلا کرتا۔ وہ چھٹیوں میں باہر جایا کرتا۔ معیاری ہوٹلوں میں قیام کے ساتھ۔ چرچ، گیلریز اور عجائب خانوں کا دورہ وہ شوق سے کرتا۔ وہ تھیٹر اور فلم کا پہلا شو دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ کھانے اور کھلانے کا شوقین تھا اس کے دوست اسے پسند کرتے تھے۔ وہ مجلک اور دقیع باتوں کا خوگر نہیں تھا' وسیع مطالعہ، وسیع معلومات کی بنا پر وہ ملنے والوں کو خوش کرنے کا فن جانتا تھا۔ نہ وہ جاذبِ نظر، نہ وہ غیر معمولی وجیہہ تاہم وہ ابھرے بدن کا، طویل القامت اور سیدھی کاٹھی رکھنے والا شخص تھا۔ اس کا چہرہ بھرا بھرا نہیں تھا لیکن ذہانت ٹپکتی تھی۔ پچاس کی عمر تک پہنچتے اس کے بال پتلے ہونے لگے تھے۔ اس کی بھوری آنکھیں اپنی چمک برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ دانت سارے اصلی تھے۔ فطرت سے خود کو سنوارتا، ہر دم اپنا خیال رکھنے والا تھا وہ ہر لحاظ سے آسودہ حال تھا اگر اس میں خود پسندی کا شائبہ تھا تو یہ اس کا حق تھا۔

اس کے نصیب اچھے تھے کہ اس کی شادی کا سفینہ خطروں اور مشکلات سے بخوبی گزر رہا گیا جبکہ بہت سے دانشمند اور اچھے لوگوں نے اس سفینے کو غرقاب کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی بیس سال پر محیط شادی شدہ زندگی کے اوائل میں، محبت کے لیے شادی اور پھر خوشی اور انبساط کے لیے بہت کچھ کرنے کا جذبہ وہ اور اس کی بیوی چند سال ہر لحاظ سے کامیاب و کامران لیکن پھر دریا کے دو کناروں کی طرح الگ ہوتے گئے اگرچہ ان میں سے کوئی بھی دوسری شادی کا خواہاں نہیں تھا لہٰذا طلاق کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور ہارینگر کے لیے سرکاری ملازمت میں اسے پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن سہولت کے پیش نظر، خاندانی وکیل کے ذریعے انہوں نے قانونی علیحدگی اختیار کر لی تاکہ دونوں کو اپنی اپنی زندگی اپنی منشا اور مرضی کے مطابق گزارنے کا حق حاصل ہو اور دوسرے کی جانب سے کسی مداخلت کا امکان بھی نہ رہے لہٰذا دونوں نے باہمی رضامندی اور نیک نیتی سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ہارینگر نے اپنا ذاتی مکان سینٹ جان ووڈ والا فروخت کر دیا کہ اب اتنے بڑے مکان کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہائٹ ہال کے قریب ترین علاقے میں فلیٹ لے لیا تاکہ پیدل دفتر آنے جانے کی سہولت حاصل رہے وہاں ایک بیٹھک تھی جسے اس نے اپنی کتابوں سے سجا لیا۔ ایک کھانے کا کمرہ جسے اس نے اپنے مزین فرنیچر سے آراستہ کر لیا ایک کشادہ بیڈروم اس کے ذاتی استعمال کے لیے۔ باورچی خانہ سے ملحقہ چند کمرے ملازمین کے لیے۔ اس نے اپنے باورچن کو وہاں دوبارہ بلا لیا، وہ گزشتہ کئی سال سے سینٹ جان وڈ میں اس کے ساتھ رہ چکی تھی۔ باقی ملازمین کی اسے اب ضرورت نہیں تھی اس نے ذاتی پارلر میڈ کے لیے متعلقہ محکمہ میں درخواست دے دی۔ اسے اپنی ضرورت کا ادراک تھا لہٰذا اس نے ایجنسی کے سپرنٹنڈنٹ کو مکمل احتیاجات سے آگاہ کر دیا تھا اسے ایک ایسی پارلر میڈ چاہیے تھی جو کم عمر نہ ہو...... اس کی پہلی وجہ تو یہ کہ نوخیز لڑکیاں آنکھوں میں خواب بسائے ہوتی ہیں اور جذباتی بھی۔ دوسری وجہ یہ کہ اب وہ مناسب عمر کا اصول پسند شخص تھا لوگ باتیں کریں گے کوئی اور نہیں تو پورٹر اور دکاندار قسم کے لوگ اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے وقار کے لیے نہیں چاہتا تھا کہ ایسی باتیں کی جائیں۔ اور اس سے بھی زیادہ ایک عمر تک پہنچ کر اس ملازمہ میں آزادانہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور پھر اسے ایک ایسی ملازمہ چاہیے تھی جو چاندی کے ظروف کو چمکائے رکھنے کا فن جانتی ہو چونکہ اس کی زندگی میں چاندی کے ظروف بلکہ چمکتے ہوئے چاندی کے ظروف کی بڑی اہمیت تھی اور یہ مطالبہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ کوئین این کے زمانے کے ان کانٹوں اور چمچوں کو نزاکتِ طبع اور تمام تر احترام سے صاف کرے۔ مہمان نوازی کی عادت کی بنا پر اس کے پاس ہفتے میں ایک مرتبہ کم از کم چار یا زیادہ سے زیادہ آٹھ افراد کی دعوت تو لازمی تھی۔ وہ اپنی باورچن پر پورا بھروسہ کرتا تھا کہ وہ مہمانوں کے لیے ایسی ڈشیں تیار کرے جسے مہمان شوق سے تناول فرمائیں اور اس کی پارلر میڈ صبر و تحمل سے انتظار کرے اور سرو کرے اور مشاق بیرے کی طرح مہمانوں کی خدمت کرے اور ایسا لباس استعمال کرے جو اس کی عمر اور موقع کی مناسبت سے ہو اور انہیں ڈھنگ سے سنبھالے۔ وہ پتلون اور ٹائی کو استری کرنے کا فن جانتی ہو۔

وہ اپنے جوتوں کو خوب چمکتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے پاؤں چھوٹے تھے لہٰذا وہ آرام دہ اور مناسب تراش خراش کے جوتے استعمال کیا کرتا تھا اس کے گردسری وغیرہ کی بہت زیادہ سپلائی ہوتی تھی اس کا اصرار ہوتا کہ اسے فوراً مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیا جائے ان سب کے علاوہ وہ فلیٹ کو صاف ستھرا رکھے۔ سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کام کے لیے عمدہ اخلاق، پر وقار، ایماندار، معتمد اور مہمانوں کو خوش کرنے والی شخصیت ہو۔

ان خدمات کے عوض وہ اسے اچھی تنخواہ، مناسب آزادی اور ضرورت کے مطابق چھٹیاں دینے کو تیار تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پلک جھپکے بغیر اس کی فرمائشیں سنتا رہا اور اسے بتایا کہ اس کے پاس ایسی خصوصیات کی حامل کئی خواتین ہیں جو یقیناً ان کے لیے مناسب ہوں گی۔ اس نے اسے امیدواروں کی ایک قطار روانہ کر دی۔ ہارینگر کو اندازہ ہو گیا کہ سپرنٹنڈنٹ نے اس کی گزارشات پر ہرگز توجہ نہیں دی۔

وہ باری باری سب سے ملا۔ بعض ان میں سے تھکی ہوئی تھیں کچھ بہت زیادہ تیز، چند بڑی عمر کی تھیں اور بعض کم عمر کچھ تو ان ضروریات کی نفی کرتی تھیں جو اسے چاہئیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسی

نہیں تھی جسے وہ آزمائش کے لیے بلاتا۔ وہ ایک مہربان اور ہمدرد شخص تھا لہٰذا اس نے خندہ پیشانی سے انہیں مسترد کردیا۔ وہ ہمت نہیں ہارا۔ اس نے انٹرویو جاری رکھنے کا تہیہ کرلیا جب تک گوہر مقصود نہ پالے۔

یہ بھی زندگی کا ایک ظریفانہ رنگ ہے آپ مطلوبہ معیار کی تلاش میں رہتے ہو جو بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ تھک ہار کر جو کچھ موجود ہے اسی پر اکتفا کرنے پر خود کو راضی کرلیتے ہو کہ اچانک سوفی صد مطلوب سامنے ہوتا ہے اور آپ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

قسمت ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کامل احمق ہے کہ کاملیت کی تلاش میں رہتا ہے اور ایک روز اچانک..... قسمت کی دیوی اپنی ادائے دلبرانہ کے ساتھ اس کی مراد اس کی گود میں ڈال جاتی ہے۔

فلیٹ کا پورٹر ایک روز جیسے آسمان سے ٹپک پڑا اور ہارنگر سے گویا ہوا۔

''جناب! میں نے سنا ہے کہ آپ کو ایک پارٹ میڈ کی ضرورت ہے مجھے ایک امید وار کی خبر ہے جو آپ کی ضرورت کے عین مطابق ہے۔''

''کیا تم خود اس کی سفارش کرتے ہو۔''

ہارنگر اس بات کو خوب جانتا تھا کہ کسی آجر کے بجائے اگر ایک ملازم دوسرے کی سفارش کرے تو وہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔

''میں ہر طرح سے اس کی ضمانت لے سکتا ہوں وہ بہت اچھی جگہ مصروف تھی لیکن اب فارغ ہے۔''

''میں سات بجے تک تیار ہو جاتا ہوں، اگر اس کے لیے مناسب ہو تو میں ملنے کو تیار ہوں۔''

''بہت اچھا جناب۔ میں اسے مطلع کیے دیتا ہوں''

پانچ منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ باہر چن نے کال بیل کے جواب میں دیکھ کر ہارنگر کو بتایا کہ پورٹر نے جس کا ذکر کیا تھا وہ آچکی ہے۔

ہارنگر نے اسے اندر لانے کو کہا۔

اس نے مزید روشنی کردی تاکہ امید وار کو اچھی طرح دیکھا جاسکے وہ آتش دان کی جانب پشت کرکے کھڑی تھی۔

ایک خاتون اندر داخل ہوئی اور..... دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

''شام بخیر'' اس نے کہا

''آپ کا نام؟''

''پری چہرہ''

''آپ کی عمر؟''

''پینتیس، جناب!''

اس نے سگریٹ کا کش لیتے خاتون کو غور سے دیکھا۔

وہ خوش قامت تھی تقریباً اس کے قد کے برابر، لیکن اس نے دیکھا کہ وہ اونچی ہیل پہنی ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ لباس نے اسے مناسب طریقے سے تھام رکھا تھا۔ وہ خود بھی وقار سے کھڑی تھی۔ اس کے نقوش بھلے اور رنگ کھلتا ہوا تھا۔

''کیا آپ اپنا ہیٹ اتار لیں گی؟'' اس نے سوال کیا۔

اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بال زردی مائل بھورے تھے جسے اس نے صفائی اور خوش نمائی سے سجا رکھا تھا۔ وہ مضبوط اور صحت مند نظر آرہی تھی۔ نہ وہ موٹی تھی نہ دبلی۔ خاص یونیفارم میں وہ خوشنما دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بہت حسین تو نہیں لیکن جاذب نظر ضرور تھی۔ زندگی کے دوسرے طبقوں میں اسے خوبصورت تسلیم کیا جاتا۔

اس نے سوالات کا آغاز کردیا اس کے

جوابات اطمینان بخش تھے۔ اس نے گزشتہ ملازمت کسی معقول وجہ کی بنا پر چھوڑی تھی۔ ایک بٹلر نے اس کی ٹریننگ کی تھی اور وہ اپنے فرائض منصبی سے کما حقہ جانکاری رکھنے والی تھی۔ گذشتہ ملازمت میں وہ تین پارلر میڈ کی چیف تھی۔ اب اسے ایک فلیٹ میں تنہا ذمے داری اٹھانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ کسی کے معرفت ایک درزی سے کپڑے استری کرنے کا فن سیکھ چکی تھی۔ وہ قدرے شرمیلی تھی۔ لیکن نہ وہ بزدل اور نہ آسانی سے ہراساں ہونے والی تھی۔ ہارنگر نے اس سے نرمی اور عام طریقے سے سوال کیے اس نے فراخدلی اور جامع انداز سے جواب دیا۔

وہ کافی حد تک مطمئن ہوا اس نے پوچھا وہ کون سا ریفرنس اپنی حمایت میں پیش کرسکے گی' تمام سوال وجواب کے بعد دونوں مطمئن نظر آئے تھے۔

''دیکھو'' اس نے بتایا'' میں تمہیں ذمے داری سونپنے پر کافی حد تک مائل ہوں لیکن میں تبدیلیوں سے نفرت کرتا ہوں۔ بارہ سال سے میری ہاورچن میرے پاس ہے۔ اگر تم مجھے راس آگئیں اور یہ جگہ تمہیں بھاگئی تو مجھے امید ہے تم یہاں ٹھہر سکو گی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم تین چار ماہ بعد میرے پاس یہ بتانے کے لیے آؤ کہ تم شادی کررہی ہو لہٰذا تمہیں جانا ہے۔''

''ایسا کوئی خوف نہیں جناب کہ میں بیوہ ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میرے حالات میں شادی کی اتنی اہمیت رہ جاتی ہے۔ جناب! میرے شوہر نامدار نے جس روز مجھ سے شادی کی اور جس روز طلاق دی، اس نے کوئی کام کرکے نہیں دیا۔ میں ہی اسے پالتی تھی۔ اب مجھے ایک اچھے ٹھکانے کی ضرورت ہے اور بس۔''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ مسکرایا

''شادی ایک اچھی چیز ہے لیکن شادی کرنے کی عادت بنالینا، ایک غلطی ہے۔''

اس نے جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کا فیصلہ سننے کی منتظر رہی۔ اس نے کسی بے چینی کا اظہار نہیں کیا۔''

اس نے محسوس کیا کہ وہ اتنی ہی ذی اعتنا رہے جتنی کہ نظر آتی ہے اسے یقین تھا کہ یہ ملازمت حاصل کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ ہارنگر نے جس تنخواہ کی پیش کش کی اس نے اطمینان کا اظہار کیا۔ اس نے خاتون کو گھر سے متعلق ضروری معلومات فراہم کیں لیکن اس نے ہارنگر کو جرأت زدہ کردیا کہ وہ یہ سب جان چکی ہے۔ اس خبر نے اسے خوش کیا نہ وہ بدگمان ہوا کہ ملازمت کے حصول سے قبل ہی معلومات کرچکی تھی۔ اس کے معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

''اگر میں تمہیں رکھنا چاہوں تو تم کب یہاں آسکتی ہو؟ میرے پاس اور کوئی نہیں۔ باورچن نے یہ ساری ذمے داری سنبھالی ہوئی ہے جتنا وہ کرسکتی ہے لیکن میں معاملات کو جلد از جلد طے کردینا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جناب۔ اگرچہ میں ایک ہفتے کی چھٹی پر جارہی تھی لیکن کسی محترم کے لیے قربانی دینا پڑے تو میں چھٹیاں منسوخ کرسکتی ہوں میں کل ہی آجاتی ہوں اگر مناسب ہو۔''

''میں چاہتا تھا آپ چھٹی کے بعد ہی شروع کریں اور یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ آپ آگے کا سوچا کرتی ہیں لیکن خیر آپ چھٹیاں گزار کر آجائیں۔ میں ایک ہفتہ اسی طرح گزاروں گا۔''

''بہت شکریہ جناب۔ میں آئندہ ہفتے آجاؤں تو مناسب رہے گا؟''

''بہت مناسب!''

جب وہ چلی گئی۔ رچرڈ ہارینگر نے محسوس کیا کہ آج اس نے ایک کارآمد دن گزارا۔ اسے لگا کہ اس نے وہ چیز حاصل کرلی جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے باورچن کو بلا کر بتایا کہ اس نے پارلر میڈ کا انتخاب کرلیا ہے۔

''میں سمجھتی ہوں کہ آپ اسے پسند فرمائیں گے۔'' اس نے بتایا ''وہ آج دوپہر آئی تھی اور مجھ سے معلومات حاصل کیں میں فوراً جان گئی کہ اسے اپنی ذمے داریوں کا پتہ ہے اور وہ آسانی سے فیصلہ بدلنے والی نہیں۔''

''مسز جیفز! ہم دیکھ لیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے میرا صحیح تعارف کرایا ہوگا۔''

''جی ہاں میں نے بتایا تھا کہ آپ خصوصاً ایک شریف النفس صحیح انسان ہیں اور معاملات کو اسی طرح طے کرتے ہیں۔''

''میں تسلیم کرتا ہوں۔''

''خاتون نے اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ اسے جان کر خوشی ہوئی کہ وہ ایک قدردان شخص کے ساتھ کام کرنے جارہی ہے۔ اگر کوئی قدر کرنے والا نہ ہو تو کام کا مزہ جاتا رہتا ہے۔ میں توقع کرتی ہوں کہ وہ لگن اور شوق سے اپنا کام کرے گی۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس طرح ہمارا ساتھ بنا کسی خرابی کے طویل اور اطمینان بخش رہے گا۔''

''جی جناب ایسا ہی ہونا چاہیے کھانے کے بعد ہی ذائقے کا پتہ چلتا ہے لیکن اگر آپ میری رائے پوچھیں تو وہ آپ کے لیے انمول خزانہ ثابت ہوگی۔''

جو کچھ پری چرڈ نے کرکے دکھایا وہ ایسا ہی تھا کسی شخص کی ایسی خدمت نہ کی گئی ہوگی۔ وہ جس طرح ہارینگر کے جوتوں کو چمکاتی تھی کیا خوب اسے وہ دفتر کی جانب قدم بڑھاتا تو اس کے جوتے اس کے وقار اور اعتماد میں اضافہ کرتے۔ چونکہ ان جوتوں میں وہ خود کو دیکھ رہا ہوتا وہ اس کے کپڑوں کا اس طرح خیال رکھتی کہ اس کے ساتھی اسے تمام سول سروس میں سب سے زیادہ خوش لباس تسلیم کرتے۔ ایک روز واپسی پر غیر متوقع طور پر واش روم میں کئی رومال اور موزے سوکھتے دیکھے۔

اس نے پری چرڈ کو آواز دی۔

''کیا تم نے خود میرے موزے اور رومال دھوئے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں اس کے علاوہ بھی تمہارے کرنے کے بہت کام ہیں۔''

''جناب! لانڈری والے اسے برباد کردیں گے۔ لہٰذا میں انہیں گھر میں دھولیتی ہوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو؟''

اسے پوری سمجھ تھی کہ ہارینگر کو کس تقریب کے لیے کیا زیب تن کرنا ہے۔ بنا استفسار وہ جانتی تھی کہ کس شام کی تقریب کے لیے اسے سیاہ ٹائی اور ڈنر جیکٹ میں ملبوس ہونا ہے۔ جب مزین لباس کی ضرورت ہوتی تو اس کے کوٹ کے کالر میں میڈل کی چھوٹی سی قطار ٹنگی ہوتی۔ روزانہ وارڈ روب سے ٹائی کا انتخاب اس نے ختم کردیا تھا۔ روزانہ اسے وہ ٹائی دستیاب ہوتی جو اس کی پسند کی ہوتی۔

اس کا مذاق ستھرا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے خطوط پڑھ دیا کرے تاکہ اس کی مصروفیات کا علم رہے بھولنے کی صورت میں اسے اپنا نوٹ بک نہ دیکھنا پڑے بلکہ پری چرڈ یاددہانی کرادے جب وہ فون پر بات کرتی، کس کے ساتھ کیا لہجہ اختیار کرنا ہے اسے سب معلوم تھا البتہ دوکانداروں کے ساتھ دوٹوک بات کرتی۔ وہ اکثر نرم لہجہ اختیار کرتی لیکن اس کے رویے میں ایک امتیازی شان ہوتی۔ وہ جب ہارینگر کے کسی ادبی دوست یا کیبنٹ منسٹر کی

بیگم سے بات کررہی ہوگی تو اسے علم ہوتا کس سے کیا بات کرنی ہے اور...... کیا نہیں۔ اپنی بیٹھک سے وہ سن رہا ہوتا کہ وہ گھر پر نہیں ہے اور پھر آکر اسے بتاتی کہ اس نے مخاطب کو ٹال دیا ہے کہ اسے ڈسٹرب نہ کرے۔

''بالکل صحیح پری چرڈ'' وہ مسکراتا۔

''میں جانتی ہوں' وہ آئندہ ہونے والے کنسرٹ کے متعلق آپ کو پریشان کرتا ہے۔''

اس کے دوست پری چرڈ سے اس کا اپائنٹمنٹ طے کرلیتے اور شام واپسی پر بتادیتی کہ اس نے کسی سے کیا طے کیا ہے۔''

''بیگم سومس نے فون کیا تھا' آئندہ منگل کو وہ آپ کے ساتھ لنچ کرنا چاہتی تھیں میں نے معذرت کرلی کیوں کہ لیڈی درسنڈر کے ساتھ آپ کا لنچ طے ہے۔ مسز اوکلے نے آئندہ منگل کو کاک ٹیل میں آپ کو شرکت کی دعوت دی۔ میں نے بتادیا وہ ضرور شریک ہوتے لیکن ان کا ڈنمنٹ سے ملنا طے ہے۔''

''بالکل صحیح۔''

''میں نے سوچا وقت آنے پر آپ خود دیکھ لیں گے۔''

وہ پورے فلیٹ کو ایک پن کی طرح چمکا کر رکھتی۔ جب سے ہارینگر نے ملازمت اختیار کی چھٹی گزار کر واپس آنے کے بعد صرف ایک مرتبہ اس نے ایک کتاب اٹھائی اسے احساس ہوا کہ اس کی گرد صاف کی گئی ہے۔ اس نے گھنٹی بجائی۔

''میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا کہ میری کتابوں کو ہرگز ہاتھ نہیں لگانا چونکہ جب کتابوں کو صفائی کی غرض سے نکالا جاتا ہے، انہیں صحیح مقام پر لوٹایا نہیں جاتا میری کتابیں گندی رہیں لیکن جگہ پر نہ ہونا میرے لیے باعث اذیت ہے۔''

''مجھے افسوس ہے جناب'' پری چرڈ نے جواب دیا ''میں جانتی ہوں شرفاء کی کتابوں کی جگہ کوئی تبدیل کرے، وہ ناپسند کرتے ہیں لہٰذا میں تمام تر احتیاط کے ساتھ صفائی کے بعد انہیں ان کے مقام پر لوٹا دیتی ہوں۔''

ہارینگر نے ایک نظر ڈالی اور کتابوں کو اپنی جگہ دیکھ کے مسکرایا۔

''میں معافی چاہتا ہوں' پری چرڈ۔''

''ان پر گرد پڑی تھی' آپ ہاتھ کالا کیے بغیر ایک بھی کتاب نکال نہیں سکتے تھے۔''

علاوہ اس کے وہ ان کے چاندی کے برتنوں کو اتنا چمکا کر رکھتی کہ اس سے پہلے کبھی ایسے نہیں چمکائے گئے۔ وہ اکثر سوچتا، خاص الفاظ میں اس کی پذیرائی کی جائے۔

''ان میں سے اکثر کوئین این اور جارج اول کے زمانے کی ہیں۔'' وہ بتاتا

''جی ہاں میں جانتی ہوں۔ اگر آپ کے پاس اس قسم کی خاص چیزیں ہیں تو ان کو سنوار کر رکھنے میں گوناں خوشی حاصل ہوتی ہے۔''

''تمہیں اس میں یقیناً مہارت ہے۔ میں کسی ایسے بٹلر کو نہیں جانتا جو چاندی کے ظروف کی اس طرح حفاظت کرتا ہو جیسا کہ تم کرتی ہو۔''

''مردوں کے پاس عورتوں کی طرح کا صبر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھداری سے جواب دیتی جس سے اندازہ ہو کہ پری چرڈ نے تمام کام بحسن و خوبی سنبھال لیا ہے اور اس نے ہفتہ میں ایک مرتبہ چھوٹی ضیافت کا آغاز کردیا۔ وہ جان گئی تھی کہ میز کے گرد مہمانوں کے درمیان کیسے انتظار کیا جاتا ہے وہ پرجوش حد تک مطمئن تھا کہ وہ پارٹی کا انتظام بھی اچھی طرح کرسکتی ہے وہ تیز، چاق و چوبند لیکن کم گو تھی۔ مہمان ابھی مشکل سے محسوس کرتا کہ اسے کیا چاہیے

کہ پری چرڈ وہ چیز لے کر اس کے قریب حاضر ہوجاتی۔

وہ اس کے قریب ترین دوستوں کے ذوق سے آگاہ ہوچکی تھی۔ وہ یاد رکھتی کہ کون سوڈے کے بجائے پانی، وسکی کے ساتھ پسند کرتا ہے اور دوسرا مخصوص دوست بکرے کی ٹانگ کے جوڑوں والے حصے کو پسند کرتا ہے۔ جرمنی کی سفید شراب Hock کو کتنا ٹھنڈا کیا جائے کہ اس کا ذائقہ برباد نہ ہو اور سرخ شراب Banquet کو پیش کرنے سے کتنی دیر قبل کمرے میں لایا جائے۔ فرانسیسی شراب Burgendy وہ ایک خاص اسٹائل سے اس طرح پیش کرتی کہ اس کی تہہ میں ارتعاش پیدا نہ ہو۔

ایک مرتبہ اس نے وہ شراب پیش نہیں کیا۔ ہارینگر نے جس کا حکم دیا تھا۔ اس نے تنبیہ کرتے وجہ پوچھی۔

میں نے بوتل کھولا تھا جناب لیکن اس میں کارک کے ذرات اتر گئے تھے لہذا میں Chamberlin پیش کر دیا جو محفوظ تھا۔

''بالکل صحیح پری چرڈ۔''

اب اس نے تمام معاملات اس کے حوالے کر دیے چونکہ اس نے جان لیا تھا کہ وہ مہمانوں کے مذاق کو مکمل طریقے سے سمجھ چکی ہے۔

اس کے طلب کیے بغیر وہ اپنے اسٹور سے بہترین شراب مہمانوں کو پیش کرتی تھی خصوصاً پرانی Brandy وہ اس وقت نکالتی جب پینے والے ادراک رکھتے ہوں کہ وہ کیا پی رہے ہیں۔

وہ عورتوں کے مذاق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ وہ جب پارٹی میں شریک ہوتیں۔ Champagne پینا پسند کرتی جسے میز سے ہٹائے جانے سے قبل ختم کرنا رسم آداب کے مطابق ہوتا۔ وہ طبقاتی فرق کو ملحوظ رکھنے والی انگریز ملازموں کی سوجھ بوجھ سے واقف تھی۔ دولت اور منصب سے اسے دھوکا نہیں دیا جاسکتا تھا اسے خاندانی شخص کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ اس کے دوستوں کے درمیان اس کے پسندیدہ اشخاص بھی تھے خصوصاً جب ان میں سے کوئی کبھار آیا ہوتا تو وہ...... مسکراتے ہوئے چپکے سے فوراً خاص شراب پیش کر دیتی جو ہارینگر نے خاص موقعوں کے لیے اٹھا رکھی تھی' یہ بات اسے خوش کرتی۔

وہ کہتا ''بڑے میاں تم پری چرڈ کے حمایت یافتہ ہو چونکہ ایسے لوگ زیادہ نہیں جنہیں پری چرڈ یہ شراب پیش کرتی ہے۔''

پری چرڈ ایک ادارہ تھی۔ وہ جلد ہی مکمل پارلر میڈ کے طور پر جانی جانے لگی۔ لوگ ہارینگر کی کسی چیز سے حسد نہیں کرتے لیکن پری چرڈ جیسی پارلر میڈ رکھنے پر وہ اس سے حسد کرتے۔ وہ سونے میں تولے جانے کے قابل تھی۔ اس کی قیمت روبی سے بڑھ کر تھی بلکہ وہ انمول تھی۔ رچرڈ ہارینگر خود اعتمادی سے بھر جاتا جب لوگ اس کی تعریف کرتے۔ وہ خوش ہو کر کہتا۔

''اچھے مالک اچھے ملازم رکھتے ہیں۔''

ایک شام وہ لوگ Port پینے بیٹھے اور وہ کمرے سے جا چکی تھی سب اس کی باتیں کرنے لگے۔

''تمہارے لیے بڑا دھچکا ہوگا جب یہ تمہیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔''

''وہ مجھے کیوں چھوڑ کر جائے گی۔ چند لوگوں نے اسے مجھ سے جدا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے ٹھکرا دیا۔ وہ اپنا بھلا خوب جانتی ہے۔''

'تھوڑے عرصے میں وہ یقیناً شادی کرلے گی۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس قسم کی عورت ہے۔''

''وہ جاذب نظر بھی ہے۔''

''ہاں وہ دیکھنے میں بھلی لگتی ہے۔''

''تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔ وہ ایک خوبصورت اور حسین مخلوق ہے دوسرے طبقے میں اسے معاشرے کا حسن سمجھا جاتا اور اس کی تصویر اخباروں میں ہوتی۔''

اسی لمحے پری چرڈ کافی لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

رچرڈ ہارینگر نے اس کی جانب نظر خاص کی۔ روزانہ اسے دیکھتے اب چار سال ہو چکے تھے اسے احساس ہی نہیں رہا کہ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا وہ بھول چکا تھا کہ وہ دیکھنے میں کیسی ہے۔ جب اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور اب اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس وقت کے مقابلے میں وہ آج بھی بندھے جسم کی مالک تھی اس کی رنگت اب بھی ملیح تھی اس کی مجموعی ادا وہی تاثر دیتی جو پہلے تھی۔ اچانک مائل ہوتا اور ہمیشہ خالی الذہن رہتا۔ کالا یونیفارم اس پر جچتا تھا۔ وہ کمرے سے چلی گئی اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تکملیت کی علامت تھی۔

''میں جانتا ہوں'' ہارینگر نے جواب دیا۔ ''وہ ایسی ہی ہے''

وہ ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ اس کے بنا میں ضائع ہو جاؤں گا۔ ایک عجیب بات کہ میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتا۔

''کیوں بھئی؟''

''میں سمجھتا ہوں وہ مجھے قدرے بور کرتی ہے۔ آپ دیکھیں وہ کتنی کم گو ہے وہ جواب دیتی ہے جب میں اس سے بات کرتا ہوں اور بس چار سالوں میں اس نے اپنے متعلق کوئی ریمارکس نہیں دیا۔ میں اس کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں جانتا۔ میرے علم میں نہیں کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے یا مجھ سے قطعی مختلف مزاج رکھتی ہے۔ وہ مشینی انداز سے بس کام کیے جاتی ہے۔ میں اس کا احترام کرتا ہوں اور ستائش بھی۔ میں اس پر اعتبار بھی کرتا ہوں اس میں دنیا کی ساری خوبیاں ہیں، اس پر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسا کیوں ہے لہذا میں خود کو اس سے مختلف پاتا ہوں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں دلکشی محسوس کرنے کے جراثیم ہی نہیں۔''

پھر سارے مہمان چلے گئے۔

اس کے دو یا غالباً تین دن بعد یہ پری چرڈ کی چھٹی کی رات تھی اور اس کی کوئی مصروفیت نہیں تھی رچرڈ ہارینگر نے کلب میں رات کا کھانا کھایا۔ کلب کے پیغام رساں لڑکے نے اسے مطلع کیا کہ اس کے فلیٹ سے ابھی فون آیا تھا کہ وہ چابی گھر چھوڑ آئے ہیں اور وہ لوگ چابی لے کر ٹیکسی میں آرہے ہیں تاکہ اسے واپسی میں زحمت نہ ہو۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسے معلوم ہوا کہ چابی واقعتاً اس کے پاس نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سوٹ بدلتے ہوئے وہ چابی رکھنا بھول گیا تھا اور ڈنر کے لیے نکل آیا۔ وہ برج کھیلنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن یہ کلب کی غیر مصروف شام تھی اور کسی اچھے پارٹنر کا ملنا مشکل تھا لہذا اچھا موقع تھا کہ وہ فلم دیکھ لی جائے جس کا چرچا وہ سن چکا تھا۔ اس نے پیغام رساں لڑکے کی معرفت پیغام بھجوایا کہ وہ آدھے گھنٹے کے اندر چابیاں لینے خود آئے گا۔

اس نے گھنٹی بجائی' دروازہ پری چرڈ نے ہی کھولا' چابیاں اس کے ہاتھوں میں تھیں۔

''پری چرڈ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے استفسار کیا ''تمہاری چھٹی کی رات ہے' میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی جناب! لیکن میرا باہر جانے کا خیال نہیں تھا میں نے مسز جیڈی کو بتا دیا تھا کہ وہ چلی جائے۔''

''تمہیں باہر نکلنا چاہیے جبکہ تمہیں سہولت بھی حاصل ہے۔''

اس نے اپنے مخصوص متفکر لہجے میں کہا'' یہ تمہارے لیے مناسب نہیں کہ تم ہر وقت گھر میں رہو۔''

''میں چھوٹی موٹی تفریح کے لیے اکثر جاتی ہوں تاہم گزشتہ ایک ماہ سے میں نکلی نہیں۔''

''کیا اس زمین پر تمہاری تفریح کے لیے کچھ بھی نہیں۔''

''دراصل اکیلے باہر جانا کوئی زیادہ خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا۔ فی الحال کوئی واقف کار نہیں جس کے ساتھ باہر جانے کی خواہش ہوتی۔''

''تمہیں تھوڑی بہت تفریح میں ضرور حصہ لینا چاہیے یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

''کسی طور میں نے یہ مشغلہ ترک کر رکھا ہے۔''

''دیکھو! میں سنیما جا رہا ہوں کیا تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گی؟''

اس نے ہمدردی سے پر لہجے میں کہہ تو دیا لیکن مہمیز کرتے اس لمحے میں الفاظ پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''جی جناب! میں چلتی ہوں۔'' پری چہرڈ نے جواب دیا

''تو پھر جلدی کرو اور ایک ہیٹ پہن لو۔''

''مجھے ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا۔''

وہ چلی گئی۔ اس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔

اسے مسرت آمیز حیرت تھی کہ اس نے کیا کہہ دیا۔ خود تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر اگر کسی کو خوشی فراہم کر دی جائے تو یہ ایک اچھی بات ہے۔ یہ پری چہرڈ کی خاصیت تھی کہ نہ اس نے حیرت کا اظہار کیا اور نہ کسی جھجک کا۔ اس نے ہارینگر کو پانچ منٹ انتظار کروایا جب وہ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ لباس تبدیل ہو چکا تھا اس نے نیلا فراک زیب تن کیا ہوا تھا جو غالباً مصنوعی سلک کا تھا۔ ایک چھوٹا سا سیاہ ہیٹ جس پر ایک نیلا بروچ چسپاں تھا۔ اس کی گردن سے ایک روپالی فر بھی لپٹا ہوا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ نہ کسر نفسی تھی اور نہ دکھاوا۔ ایسا کبھی نہ ہوا ہوگا کہ ہوم آفس کا کوئی افسر اپنی گھریلو ملازمہ کو فلم دکھانے لے گیا ہو۔

'' جناب مجھے افسوس کہ میں نے آپ کو انتظار کروایا۔''

اس نے خندہ پیشانی سے جواب دیا'' کوئی مضائقہ نہیں۔''

اس نے باہر کا دروازہ خاتون کے لیے کھولا اور وہ اس سے پہلے باہر نکل آئی۔ ہارینگر کو لوئس چہاردہم کے زمانے کی رسومات اور درباری یاد تھے اسے خوشی تھی کہ پری چہرڈ نکلنے میں پہل کرتی قطعی نہیں جھجکی جس سنیما کا اس نے انتخاب کیا تھا۔ ہارینگر کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا لہذا وہ سواری کے بغیر ہی چل پڑے۔ ہارینگر نے موسم کا ذکر کیا، سڑکوں کے حالات اور ایڈولف ہٹلر کی بھی بات کی وہ مناسب جوابات دیتی رہی۔ وہ جب پہنچے ''مکی دا ماؤس'' کی شرارتیں پردے پر جاری تھیں اور وہ بھی مزاح میں شریک ہوگئے اگرچہ پری چہرڈ، ہارینگر کی خدمت میں چار سال سے موجود تھی لیکن اس نے بڑی مشکل سے اسے مسکراتے دیکھا ہوگا لیکن اب جو اس کی توجہ مبذول ہوئی تو اس نے قہقہوں کے دوران گھنٹی جیسی آواز سنی وہ اس کی شادمانی سے لطف

اٹھا رہا تھا اس کے بعد اصل فلم پردے پر پھیلتی چلی گئی۔ فلم اچھی تھی دونوں نے ولولے کے ساتھ فلم دیکھی اس نے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور میکانیکی طریقے سے پری چہرڈ کو سگریٹ پیش کر دیا۔

خاتون نے سگریٹ لیتے اس کا شکریہ ادا کیا۔

ہارینگر نے اس کے سگریٹ کو شعلہ دکھایا اس کی نگاہیں فلم پر مرکوز تھیں اور وہ اس کی جانب سے بے خبر تھا۔

فلم ختم ہونے کے بعد وہ بھیڑ کے ساتھ تھیٹر سے نکل کر سڑک پر آگئے اور واپس گھر کی جانب چل پڑے۔ رات ستاروں بھری تھی۔

''کیا تم نے یہ سب پسند کیا؟'' اس نے پوچھا

''جناب! یہ ہر طرح سے ایک شاندار میزبانی تھی۔''

اس کے ذہن میں ایک خیال در آیا۔

''کیا تم نے کچھ کھایا ہے؟''

''نہیں جناب مجھے وقت ہی نہیں ملا۔''

''کیا تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟''

''میں نے چند سلائس اور پنیر لے لیے تھا جب میں اندر گئی تھی اور اب کوکو کا ایک کپ تیار کرلوں گی۔''

یہ مناسب نہیں اس نے سوچا۔ فضا میں خوشی اور انبساط پایا جاتا تھا۔ اس کے اطراف آتے جاتے لوگ بھی خوش و خرم نظر آرہے تھے کسی چیز کا آغاز ہو جائے تو اختتام بھی ڈھنگ سے ہونا چاہیے۔

''دیکھو، کیا ہم کہیں چل کر سیر نہ کرلیں؟''

''اگر آپ چاہیں تو جناب۔''

''تو چلو۔''

اس نے ایک ٹیکسی کو آواز دی اس کے اندر سخاوت کا جذبہ ابھر رہا تھا اور اسے یہ سب ہرگز ناپسند نہیں تھا۔

اس نے ڈرائیور کو آکسفورڈ اسٹریٹ پر ایک ریستوران کا پتہ بتایا جو زندگی سے بھرپور اور روشن روشن ہوتا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہاں کسی شناسا سے ملاقات کا بھی امکان نہیں تھا وہاں ایک آرکسٹرا بھی ہوتا..... اور ڈانسنگ فلور بھی۔ پری چہرڈ یقیناً خوش ہوگی۔

وہ لوگ بیٹھ گئے تو ایک ویٹر ان کی میز پر آیا۔

''یہاں سپر کا ایک سیٹ ہوتا ہے میری رائے ہے کہ وہی منگوایا جائے تم پسند کرو گی۔ البتہ ڈرنک میں کیا لوگی تھوڑی سی سفید شراب یا؟''

''جنجر بیئر کا ایک گلاس مجھے مرغوب ہوگا۔''

ہارینگر نے اپنے لیے وسکی اور سوڈے کا آرڈر دیا۔

پری چہرڈ نے زبردست بھوک کے ساتھ سپر میٹ کا استقبال کیا جبکہ ہارینگر زیادہ بھوکا نہیں تھا۔ وہ اس کا ساتھ دیتا رہا تاکہ وہ اچھی طرح کھا سکے۔ تازہ دیکھی ہوئی فلم ان کی گفتگو کا موضوع بن گیا ایک رات تین مہمانوں نے پری چہرڈ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس میں صداقت تھی۔ وہ ایک جاذب نظر خاتون تھی لہذا اگر اسے کوئی دیکھ لیتا تو زیادہ فکر کی بات نہیں تھی اس کے برعکس دوستوں کے ہاتھ ایک کہانی آجاتی کہ نسبتاً کم درجے کی پری چہرڈ کو سنیما کیوں کرلے گیا اس کے بعد ریستوران کے سپر میں بھی ساتھ؟''

پری چہرڈ ایک اداس مسکراہٹ لبوں پر سجائے فلور پر رقص کرتے جوڑوں کو دیکھتی رہی۔

''کیا تم ڈانس کرنا پسند کرتی ہو؟'' اس نے دریافت کیا

''جب میں لڑکی تھی کبھی کبھار ڈانس کرلیا

کرتی تھی لیکن شادی کے بعد زیادہ ڈانس نہیں کیا میرا شوہر مجھ سے قد میں چھوٹا تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھلا نہیں لگتا جب ایک پارٹنر قد آور نہ ہو آپ سمجھ رہے ہیں میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں اب معمر ہو چکی ہوں، جلد اس قابل نہیں رہوں گی۔''

رچرڈ ہارینگر اپنی پارلر میڈ سے یقیناً اونچا تھا۔ ان کا جوڑ مناسب رہے گا اسے ڈانس کا شوق تھا اور وہ اچھی طرح ڈانس کر لیا کرتا تھا لیکن وہ جھجک رہا تھا۔ وہ ڈانس کی درخواست کر کے پری چرڈ کو گلے لگانا نہیں چاہتا تھا۔ غالباً اسے بہت آگے نہیں جانا چاہیے۔

لیکن وہ اس کے متعلق سوچ بھی رہا تھا۔ وہ ایک اداس زندگی گزار رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ اتنی سمجھ دار بھی تھی کہ اگر اسے ڈانس کرنا غلط محسوس ہوا تو وہ یقیناً کوئی مناسب بہانہ کر دے گی۔

گیند پری چرڈ کے کورٹ میں ڈالتے اس نے پوچھ ہی لیا چونکہ بینڈ نے دوبارہ بجانا شروع کر دیا تھا ''کیا تم ڈانس کا ایک دور لینا چاہو گی؟''

''میں خوفناک حد تک ڈانس پریکٹس سے دور ہو چکی ہوں جناب۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''اگر آپ کچھ خیال نہ کریں جناب'' اس نے غیر جذباتی انداز سے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ بالکل نہیں شرما رہی تھی۔ وہ صرف اس بنا پر خوفزدہ تھی کہ غالباً وہ صحیح اسٹیپ نہیں لے سکے گی۔ وہ لوگ فلور پر آ گئے۔ ہارینگر نے جان لیا کہ وہ بڑی مہارت سے ڈانس کر رہی تھی۔

''کیوں تم تو بہت اچھی طرح ڈانس کر رہی ہو؟'' اس نے پوچھا

''پرانی مشق کام آ رہی ہے سر۔''

اگرچہ وہ ایک بھرپور خاتون تھی لیکن اپنے پیروں پر بہت ہلکی اور ردھم کا اسے پورا ادراک تھا وہ ڈانس کرتے بہت خوش تھی۔ دیوار دوز آئینے پر اس نے ایک نظر ڈالی اور خود کو یہ باور کرانے سے روک نہیں سکا کہ پری چرڈ کے ساتھ اس کی جوڑی خوبصورت تھی۔ ان کی نگاہیں آئینے میں اکٹھا ہوئیں اسے حیرت ہوئی کہ کیا وہ بھی یہی سوچ رہی تھی؟ وہ ڈانس کے دو دور میں مزید شریک رہے۔

پھر ہارینگر نے مشورہ دیا کہ انہیں گھر جانا چاہیے۔ اس نے بل کی ادائیگی کی اور وہ باہر نکل آئے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے...... نکلی جا رہی تھی۔ وہ ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے۔ دس منٹ کے اندر وہ گھر پر تھے۔

''میں پچھلے دروازے سے چلی جاتی ہوں جناب۔'' پری چرڈ نے کہا

''اس کی کوئی ضرورت نہیں، تم میرے ساتھ لفٹ میں آ جاؤ۔''

اس نے اس کو ساتھ لیا اور رات والے پورٹر پر ایک تیز نگاہ ڈالی تا کہ وہ کچھ اور نہ سوچے کہ وہ اپنی پارلر میڈ کے ساتھ اتنی دیر سے لوٹ رہا ہے۔

ہارینگر نے خود اپنی چابی سے دروازہ کھول کر اسے اندر جانے دیا۔

''شب بخیر جناب، آپ کا بے حد شکریہ یہ واقعتاً میرے لیے ایک ٹریٹ تھی۔''

''پری چرڈ تمہارا شکریہ۔ میرے لیے ایک تھکی ہوئی شام تھی۔ تم نے باہر وقت گزارنے کو انجوائے کیا ہو گا اور تمہاری وجہ سے میں نے بھی۔''

''جی ہاں میں نے انجوائے کیا۔ اس سے زیادہ جتنا میں کہہ رہی ہوں۔''

رچرڈ ہارینگر خود سے مطمئن تھا۔ یہ ایک کامیابی تھی کہ اس نے کسی کے ساتھ اخلاص سے ہمدردی کی تھی۔ کسی دوسرے شخص کو سچی خوشی دے کر انسان اپنے اندر ولولہ اور جوش محسوس کرتا ہے۔ اس کے جذبہ ہمدردی میں اضافہ ہوا اور اسے گرم جوش کر دیا اور ایک لمحے کے لیے اس نے دل میں تمام انسانوں کے لیے بڑی محبت محسوس کی۔

''شب بخیر، پری چرڈ۔'' اس نے کہا چونکہ وہ بے انتہا خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنا بازو اس کے کمر کے گرد حمائل کر دیا اور اس کے لبوں کو چوم لیا۔

اس کے لب نہایت نرم تھے۔ اس نے ہارینگر کے بوسے کا جواب طویل بوسے سے دیا۔ یہ ایک حدت سے پُر، سپردگی لیے ہوئے ایک صحت مند خاتون کا اپنی زندگی کے عروج پر کسی کے سینے سے لگنا تھا اسے یہ بہت خوشگوار لگا اور اس نے پری چرڈ کو قوت سے بھینچ لیا۔ خاتون نے اپنی بانہیں اس کی گردن کے گرد لپیٹ لیں۔

عام طور سے وہ اس وقت تک سوتا رہتا جب تک پری چرڈ اس کی ڈاک لیے حاضر نہ ہوتی لیکن دوسری صبح وہ ساڑھے سات بجے جاگ گیا۔ اسے ایک عجیب سے جوش اور ولولے کا احساس ہوا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اسے عادت تھی کہ وہ سر کے نیچے دو تکیے رکھ کر سویا کرتا۔ وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے نیچے فقط ایک ہی تکیہ تھا۔ اس نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ دوسرا تکیہ اس کے تکیے کے ساتھ ہی تھا۔ اس پر کوئی سویا ہی نہیں تھا۔ وہ مسطح تھا جیسا عام طور سے بستر پر ہوتا ہے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

میرے خدا میں کیسا بے وقوف بنا ہوں۔ اس نے بلند آواز سے پکارا۔ وہ ایسی احمقانہ حرکت کیوں کر کر سکتا ہے۔ کیا دنیا میں کہیں ایسا ہوا ہو گا جو اس نے کیا۔ ملازم لڑکیوں سے کھیلنے والا آخری آدمی ہونا چاہیے تھا اس کی عمر اور اس کی پوزیشن میں بدنام کرنے والا کام کیا اس نے پری چرڈ کو جاتے نہیں سنا وہ یقیناً سو چکا تھا یہ اس لیے بھی نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ اسے چاہتا اور اسے پسند کرتا تھا۔ وہ اس کے مطلب کی نہیں تھی جیسا کہ ایک رات قبل وہ اپنے دوستوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ اسے بور کرتی ہے۔

وہ اب بھی اسے صرف پری چرڈ کی حیثیت سے جانتا تھا۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اس کا پہلا نام کیا ہے کیا پاگل پن ہے اور اب کیا ہونے والا ہے اب صورت حال بگڑ گئی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ اب اسے نہیں رکھ سکتا اسے دور کرنا، جبکہ دونوں برابر کے قصوروار تھے، دکھ دینے کی حد تک انصاف سے بعید تھا۔ ایک ایسی پارلر میڈ کو کھو دینا، صرف ایک گھنٹے کی تفریح کے عوض کیا احمقانہ حرکت نہیں؟

''یہ میری نرم دلی کا قصور ہے۔'' وہ دکھ سے چلایا۔

اب اسے ایسی کوئی نہیں ملے گی جو اس کے کپڑوں کی اس طرح دیکھ بھال کر سکے۔ جس پر اس کے دوست رشک کرتے تھے کیا کوئی اور چاندی کے ظروف کو اس طرح چمکا سکے گی۔ اس کے تمام دوستوں کے نمبر اس کے پاس ہیں۔ اسے شراب کی سمجھ تھی لیکن اب اسے لازماً جانا پڑے گا۔ اسے خود احساس ہو گا کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد چیزیں پہلے کی طرح نہیں رہ سکتیں۔

وہ اسے ایک خوبصورت تحفہ دے گا اور اسے ایک عمدہ ریفرنس دے کر جدا کرے گا۔ اب وقت ہو رہا تھا۔ وہ کسی لمحے کمرے میں داخل ہو سکتی تھی۔ کیا اب وہ مغرور ہو جائے گی اور ادائیں دکھائے گی، بے تکلف ہونے کی کوشش کرے گی۔ ممکن ہے اب وہ اس کے خطوط لے کر اوپر آنا پسند نہ کرے۔

''یہ کتنا عجیب ہوگا کہ میں گھنٹی بجاؤں اور مسز جیڈی آئیں اور بتائیں کہ پری چہرہ ابھی تک جاگی نہیں..... گزشتہ رات کے بعد وہ دیر تک بستر پر ہے۔''

''میں کیسا احمق ثابت ہوا، ناسمجھ دوسروں کے جذبات سے کھیلنے والا۔''

دروازے پر دستک۔ وہ پریشان کن خیالات کی بنا پر بیمار جیسا ہو چکا تھا۔

''اندر آ جاؤ۔''

اسے اپنی بازگشت سنائی دی۔ رچرڈ ہارینگٹن ایک نہایت دکھی انسان ہے۔

پری چہرہ داخل ہوئی اور گھڑی نے گھنٹی بجائی۔ اس نے پرنٹ والا لباس زیب تن کیا ہوا تھا جو وہ صبح کے اوقات میں پہنا کرتی تھی۔

''صبح بخیر، جناب۔'' اس نے پکارا

''صبح بخیر۔''

اس نے پردے کھینچے اور خطوط اور اخبار اسے پکڑا دیے۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ ویسی ہی نظر آ رہی تھی جیسی ہمیشہ نظر آتی۔ اس کی حرکات میں وہی وقار تھا جو ہمیشہ ہوا کرتا۔ نہ وہ رچرڈ ہارینگٹن سے نظریں چرا رہی تھی اور نہ ہی اس پر نظریں گاڑ رہی تھی۔

''کیا آپ اپنا گرے سوٹ زیب تن کریں گے جو کل درزی کے پاس سے آیا ہے۔''

''ہاں!''

اس نے لیٹر پڑھنے کا ڈھونگ کیا' جبکہ وہ اسے اپنی پلکوں کے نیچے سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پشت اس کی جانب تھی۔ وہ اس کا ویسٹ کوٹ اور زیر جامہ تہہ کر کے کرسی پر رکھ رہی تھی اس نے گزشتہ کل کے پہنے ہوئے شرٹ سے بٹن وغیرہ نکال کر نئے شرٹ میں لگا دیے۔ دھلے ہوئے موزے نکال کر سسپینڈرس سمیت کرسی پر رکھ دیے تاکہ میچ کیا جا سکے۔ اس نے پھر گرے سوٹ نکالا اور پتلون کی پشت کے بٹن سے بریسز لگا دیے۔ وارڈ روب کھول کر' سوٹ کے ساتھ میچ کرتی ٹائی نکال رکھی۔ اس نے آج کے دن کا سوٹ ایک ہاتھ پر لے کر جوتا اٹھایا۔

''آپ ناشتہ پہلے کریں گے یا غسل؟''

''میں ناشتہ پہلے کرلوں گا۔''

''بہت بہتر جناب۔''

وہ بے آواز اور نرم قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سیریس، دوسروں کو عزت دینے کشادگی کا احساس دلانے والے جذبات کا عکس لیے ہوئے تھا جو کچھ گزرا وہ خواب تھا۔ پری چہرہ کے رویے میں گزری رات کا کوئی پرتو نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا ہے اسے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہرگز نہیں۔ پری چہرہ ایک مکمل پارلر میڈ تھی نہ الفاظ میں برتاؤ میں کبھی ظاہر کیا کہ ان کے تعلقات مالک اور ملازمہ کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔ پری چہرہ اس کے لیے انمول تھی اور رچرڈ ہارینگٹن ایک پرمسرت زندگی کا مالک تھا۔

☆☆.....☆☆

ترکی میں عباسی

سچی کہانیوں کا پسندیدہ ترین سلسلہ
ایک بار پھر قارئین کے پُرزور اصرار پر.....

قمر علی عباسی

صبح کے نو بجے تھے۔ استنبول میں اتوار تھا۔ اس دن بینک میں کسی کا ہونا بڑی بات تھی۔ ایک صاحب اطمینان اور سکون سے مشین پر کچھ ٹائپ کر رہے تھے۔ جب

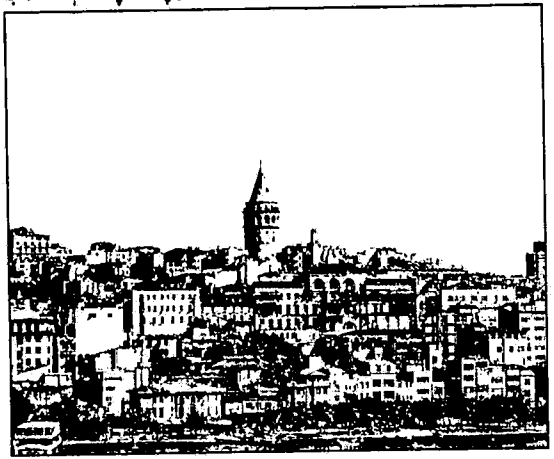

ان کی نظریں کاؤنٹر کی طرف اٹھیں تو ہم نے 50 امریکی ڈالر پیش کیے۔ انہوں نے نوٹ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک نظر ہم پر ڈالی۔ جیسے پوچھ رہے ہوں یہ نوٹ کہاں سے لائے؟ لیکن شاید انہیں اس سوال کی انگریزی نہیں آتی تھی۔ پھر سوچا ایک کاغذ پر ہمارے دستخط لیے مشین کے بٹن دبائے اور دراز سے کچھ نوٹ نکالے۔ نیویارک کی ٹریول ایجنسی سے احباب تک نے اطلاع دی تھی کہ ترکی میں امریکی ڈالر کی وہ قدر و منزلت ہوتی ہے جو مشرق میں شاعر اپنے محبوب کی کرتا ہے۔

لیکن نوٹ ہاتھ میں آئے تو احساس ہوا شاعر پاگل ہو گیا ہے یا محبوب عنقا' اب بات کروڑوں تک پہنچ چکی تھی بھی نوٹ پر اتنے زیرو نہیں دیکھے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ بینک کے کلرک نے چھٹی کی نیند میں غلطی کر دی ہے لیکن ترکی لیرا کے ساتھ جو کاغذ ملا اس میں وہی رقم لکھی تھی۔ زندگی بھر ریاست امارت کے خواب دیکھتے رہے۔

افسوس کبھی ارمان پورے نہ ہوئے' بہت ہوا تو ہزار کمائے لکھ پتی تک نہ بن سکے آج استنبول کے ہوائی اڈے پر اچانک کروڑ پتی ہو گئے۔ بینک والوں سے کوئی سوال جواب کرتے کہ پیچھے دو مسافر آ کھڑے ہوئے۔ کروڑوں لیرا جیب میں رکھ کر قدم آگے بڑھایا تو اِدھر اُدھر اچٹتا سا دیکھ لیا۔

کوئی ہے تو نہیں' دو چار دن بعد معلوم ہوا استنبول کا غریب آدمی بھی جیب میں چار چھ کروڑ لیرا رکھے پریشان پھرتا ہے۔ ترکی والوں کو زیرو اور نکلنے کا شوق ہے۔

رقم میں بے شمار زیرو اور حروف تہجی میں نکتے لگا دیتے ہیں بعض کے نیچے تو باقاعدہ دُم بھی دیکھی ہے..... ہمارے ملک میں اکثر نعرے لگتے ہیں۔ ساڈا لیڈر شیر ہے۔"

اور مخالفین کہتے ہیں۔

"دم لگانے کی دیر ہے۔" یہاں دم لگانے کے باوجود کوئی حرف شیر نہیں بنتا۔ ہندسوں اور حروف پر نکتوں کی وجہ سے عوام حکومت کے کاموں میں نکتہ چینی نہیں کرتی اور انتظامیہ ورلڈ بینک سے بانسری ادھار لے کر بجاتی رہتی ہے۔

ہم کروڑوں اور لاکھوں لیرے لے کر بینک کے کاؤنٹر سے آئے تو استقبال کو آنے والے نے ہمارا بیگ لیا اور سامنے کوچ کی طرف لے چلا۔ یہ سدھارتھ تھا۔

ترکی میں 99 فیصد مسلمان ہیں۔ اس لیے یہ مسلمان تھا۔ کوچ میں ایک اور صاحب بھی آ گئے چشمہ لگائے چھوٹے قد کے' ہم سمجھے پیچن سے آئے ہیں۔ وہ سان فرانسسکو سے آ رہے تھے اور چینی امریکن تھے۔

کوچ ایئرپورٹ کے علاقے سے باہر نکلی تو دیکھا ایک جانب ترکی کے بہت سے جھنڈے لہرا رہے ہیں غالباً سیاحوں کو یہ بات بتانے کے لیے وہ واقعی ترکی آ گئے ہیں اس کے بعد جگہ جگہ ترکی کے اتنے جھنڈے دیکھے کہ پچھلے چند دن تو خواب میں بھی جھنڈے نظر آتے۔

ہم نے پوچھ لیا۔

"استنبول میں موسم خوشگوار ہے۔"

"جی....." سدھارتھ بولا۔

"سنا ہے استنبول کی آبادی بہت زیادہ ہے۔"

"جی ہاں۔" سدھارتھ نے جواب دیا۔

ایک صاف ستھری سڑک اس کے دونوں

طرف عمارتیں' ایک طویل پرانی شکستہ دیوار نظر آئی۔

"یہ استنبول شہر کی پرانی دیوار ہو گی۔"

"جی ہاں۔" سدھارتھ بولا۔

پھر مسجدوں کے مینار نظر آئے۔ سر اٹھائے..... خوبصورت.....

"اس شہر میں مسجدوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔"

"جی ہاں۔" سدھارتھ نے جواب دیا۔

"پرانے مکان' فٹ پاتھ' بازار کا علاقہ' ایک چوراہا' اس پر گھاس اور کوڑا کرکٹ' شہر صاف نہیں تھا۔

شاید ان لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع نہیں ہوئی۔ پھر خیال آیا آج اتوار ہے چھٹی کا دن ہے اس لیے خاکروب بھی آرام کر رہے ہوں گے۔

کوچ اوپر جانے لگی اور ایک عمارت کے سامنے رک گئی یہ ہوٹل تھا۔ سدھارتھ نے بیگ اٹھایا۔ کاؤنٹر تک لایا جہاں ایک صاحبزادی سراپا تبسم بنی کھڑی تھیں۔

اس نے ترکی میں کچھ کہا اور ہمیں الوداع کہہ کر چلا گیا۔

خاتون نے ایک چابی نکالی اور بیرے کو اشارہ کیا وہ ہمارا اور سان فرانسسکو والے چینی کا بیگ اٹھا کر لفٹ کی طرف چلا۔ اندر داخل ہو کر چوتھی منزل کا بٹن دبایا۔ زرا دیر میں لفٹ رکی تو ایک کمرہ کھول کر سامان رکھا اور چلا گیا۔

ہمارے مقدر میں سان فرانسسکو کا چینی لکھا گیا۔ اس نے تعارف کرایا۔

"آپ مجھے ای ڈی کہہ سکتے ہیں۔"

"اور آپ....."

"عباسی....."

آسان نام تھے دونوں کو یاد ہو گئے۔

"کیا پروگرام ہے....." ای ڈی نے پوچھا۔

"امریکہ فون کرنا ہے..... اپنی خیریت بتانے کو۔" ہم نے کہا۔

ٹیلی فون کی تلاش میں کمرہ بند کر کے کاؤنٹر پر آئے۔ فون کے لیے ہم کارڈ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

کاؤنٹر پر صاحبزادی سے پوچھا۔

"فون کہاں سے ہو سکتا ہے.....؟"

کاجل سے سجی آنکھوں سے ہمیں دیکھتی رہیں پھر کچھ بولیں افسوس وہ ہم نہ سمجھے مسکراتی رہیں ہم جان گئے بی بی کو انگریزی اتنی ہی آتی ہے۔ جتنی ہمیں ترکی سے واقفیت ہے۔ ہمارے ہاتھ کے فون اور کارڈ کے اشارے سے ایک بیرے نے کچھ سمجھایا اور اشارہ کیا جو ہوٹل کے دوسری طرف تھا۔ ہم نے سڑک پار کی وہاں سپر مارکیٹ تھی۔ کاؤنٹر پر رش تھا۔ ہم یوں ہی الماری میں رکھی چیزوں کی قیمت دیکھنے لگے اور فوراً احساس ہوا کہ ایئرپورٹ پر جو کروڑوں لیرا دیے گئے ہیں وہ چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی لاکھوں لیرا کی خرید کر واپس لے لیں گے۔ اگلے دن رمضان تھا۔

لوگ اس طرح شاپنگ کر رہے تھے جیسے سارے ملک میں ہوتا ہے۔ ہم انتظار کرنے لگے کاؤنٹر پر کیشیئر خالی ہو تو فون کارڈ کے بارے میں دریافت کریں لیکن لائن ختم نہیں ہو رہی تھی اس لیے خریداروں میں کھڑے ہو گئے جب کاؤنٹر پر پہنچے ہاتھ کے اشاروں سے سمجھایا۔ اس نے ایک کارڈ نکال کر دیا۔ ہم نے جیب سے نکال کر نوٹ اس کے سامنے رکھ دیے اور کہا۔

''جو چاہے اٹھالو.....'' ہاتھ کی انگلیاں اُٹھا کر بتایا وہ کارڈ جائیں۔ اس نے اپنی پسند کے نوٹ لیے اور رسید بھی دی۔ ہماری جو شامت آئی تو پوچھ لیا۔

''فون کہاں ہوگا؟''

پشت پر ایک خاتون کھڑی تھیں انہیں

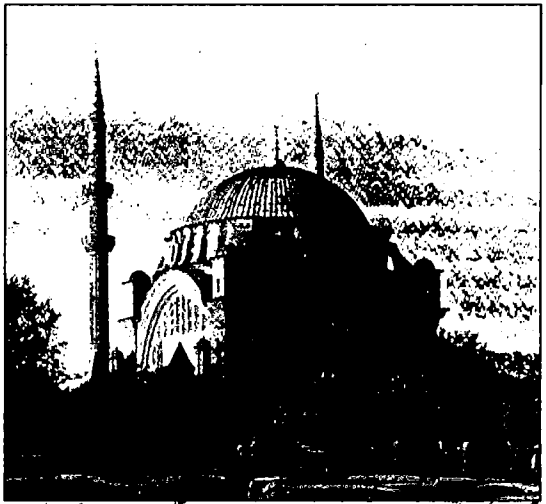

انگریزی کی سمجھ تھی۔ دکاندار سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ اس نے دونوں کارڈ ہاتھ سے لیے اور کسی کو فون کیا' ہم ڈر گئے۔ نہ جانے پردیس میں کیا ہو۔

ایک صاحبزادی تیزی سے آئیں انہوں نے چابی سے کیس بک کھولا اور کچھ رقم نکالی اور کارڈ کے عوض ہمیں پیش کی۔ جو صاحبزادی اس سطر کی

ذمے دار تھیں۔ انہوں نے سمجھایا۔

پوسٹ آفس بند تھا موسم اچھا تھا..... اس لیے یوں ہی فون کارڈ کے بہانے ذرا آگے بڑھے' ایک بیئر ہاؤس کھلا تھا ہم نے سوچا یہ شاید انگریزی سمجھ سکتے ہوں گے۔ کاؤنٹر سے پوچھا جواب ملا۔

''سامنے گلی میں سیدھے جا کر اُلٹے ہاتھ چلے جاؤ..... وہاں ملے گا۔'' یہ راستہ نیچے کی طرف جاتا تھا۔ ہم اور ای ڈی اتر گئے۔ وہاں بیسمنٹ میں دکان تھی۔ ایک اسمارٹ بڑی پی سے ملاقات ہوئی وہ ہماری بات نہیں سمجھیں۔ ہم ان کی بات کیوں سمجھتے۔ اس لیے واپس ہوٹل آ گئے لفٹ کے پاس نوٹس لگا تھا۔

''لوُر ڈائریکٹر صاحب 6 بجے ملاقات کریں گے۔'' کاؤنٹر پر وہی کاجل سے سجی آنکھوں والی صاحبزادی تھیں ان کی مسکراہٹ تو دیکھی جاسکتی تھی لیکن ترکی نہیں سمجھی جاسکتی تھی۔

ہم اور ای ڈی کمرے میں واپس آ گئے تاکہ ذرا دیر آرام کرلیں۔ شام کو تر و تازہ ہو کر لوُر ڈائریکٹر سے فون کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

شام چھ بجے نیچے آئے تو لوُر ڈائریکٹر کی میٹنگ کا وقت سات بجے ہو گیا تھا اور صاحبزادی کی جگہ ایک اسمارٹ نوجوان کھڑا نظر آیا۔

''فون کرسکتے ہیں۔'' ہم نے پوچھا۔

وہ کچی پکی انگریزی بولتا تھا۔

''ضرور.....'' اس نے جواب دیا۔

''نیویارک کے کیا چارجز ہیں۔''

''معلوم نہیں۔''

''تو معلوم کرو۔'' ہم نے کہا۔

''آج اتوار ہے پوسٹ آفس بند ہے..... کل پوچھیں گے.....'' وہ بولا۔

''اگر آج فون کرنا ہو تو.....''

''سامنے کاؤنٹر سے کرلیں۔''

''کس حساب سے چارج کریں گے۔'' ہم نے پوچھا۔

''کمپیوٹر بتائے گا۔'' اس نے کہا۔

''کچھ اندازہ۔''

''جی نہیں۔''

''آپ فون کرلیں جو کمپیوٹر کہے گا ادا کردیجیے گا۔''

ہم نے جی کڑا کر کے نیویارک کا نمبر ملایا اور گھڑی میں وقت دیکھتے رہے۔ اپنی خیریت بتا کر ڈیڑھ منٹ میں فون بند کیا۔ اور پوچھا۔

''کتنی رقم.....''

نوجوان نے کمپیوٹر سے ایک کاغذ نکالا اور ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم نے زیرو گن کر دیکھے۔

''پورے 30 لاکھ لیرا۔''

زندگی میں ہم نے اس سے زیادہ قیمتی فون کبھی نہیں کیا۔ ہمارے ملک میں ایک جملہ اکثر بولا جاتا ہے۔ آپ کے لفظ سونے میں تولنے کے قابل ہیں' اور کسی نے تولے ہوں یا نہ تولے ہوں۔ ہم نے اس شام اپنے اہل خانہ کے لفظ قیمتی ہیروں میں تولے ہیں۔ وہ اس بات کا خیال رکھیں۔ کاؤنٹر کے سامنے صوفے رکھے تھے۔ یہاں ترکی کے لوُر میں حصہ لینے والے جمع ہونے لگے۔ تعارف ہونے لگا یہ لوگ آنے والے دن رات دکھ سکھ کے ساتھی ہوں گے۔

استنبول میں ہم لس لک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ترکی میں ہوٹل 'اوٹل' کہلاتا ہے۔ خالم او سے پہلے لفظ ہٹا دیتے ہیں۔ لس لک والوں کا دعویٰ ہے کہ یہ شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ دفاتر' شاپنگ سینٹرز اور لطف اندوز ہونے کے مقامات نزدیک ہیں۔

ہم سفر کے دوران ہوٹل کی انتظامیہ کے ہمیشہ ممنون رہے ہیں۔ وہ طعام و قیام کو باعث آرام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ اُن کی استقبالی خواتین مسکراتی' ہیرے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اہل خانہ کو فون کرنا چاہو فوراً ملا دیتے ہیں۔ چائے کافی کا آرڈر دو فوراً مہیا کردیتے ہیں۔ اطمینان دلانے کے لیے سوجتن کرتے ہیں۔ لس لک ہوٹل اور ترکی میں اوٹل' والے خوش اخلاق ملنسار اور خدمت گزار تھے۔ اب اگر کاؤنٹر کی کاجل سے بھری آنکھوں والی خاتون اپنی زبان کا رس ہمارے کانوں میں

گھولنے سے قاصر تھیں تو اُس میں بھی ہماری غلطی تھی۔ ترکی سے ناواقفیت......

اوٹل میں 75 کمرے تھے۔ ہمارے علاوہ بھی دیگر معززین قیام و طعام کرتے تھے۔ 6 سوئٹ تھے...... ایک دو رات قیام اور زندگی ایک سفر ہے کی وجہ سے اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اوٹل میں بار' ریسٹورنٹ' ہر کمرے میں فون' ٹیلی ویژن' ریڈیو' ٹیپ ریکارڈر اور ریفریجریٹر کا بندوبست تھا۔ افسوس یہ رہا کہ ٹس لک میں قیام ایک رات تھا۔ کس سہولت سے لطف اندوز ہوتے فائدہ اٹھاتے' افسوس ان سب کو مایوس کیا۔

اوٹل میں ڈرائی کلینگ کا اعلیٰ انتظام تھا۔ لانڈری' بیگ الماری میں رکھا تھا اپنے استعمال شدہ کپڑے اس میں ڈالیں اور صاف ستھرے خوشبو میں بسے استری شدہ حاصل کریں۔ ایک بار تو جی چاہا اس سہولت سے فائدہ اٹھالیں لیکن جب اجرت کی فہرست پر نظر پڑی تو سوچا اپنے استعمال شدہ لباس کسی نازک اندام کے ہاتھوں سے استری کرائیں مناسب نہیں لگتیں یوں تھیں۔

قمیض کی دھلائی 24 لاکھ لیرا

قمیض پر استری 12 لاکھ لیرا یعنی استری شدہ قمیض 36 لاکھ

پتلون کی دھلائی 43 لاکھ لیرا

رومال کی دھلائی 4 لاکھ لیرا

لانڈری بیگ خالی رہا...... اور امید ہے ہمارے بعد اس کمرے میں آنے والوں نے ہماری روایات کو برقرار رکھا ہوگا۔

سات بجے ایک اسمارٹ نوجوان تشریف لائے۔

میٹنگ شروع ہوئی پہلے لال رنگ کا شربت پلایا گیا۔ ہم شراب سمجھ کر دور رہے۔ بعد میں معلوم ہوا استنبول میں شراب پی جاتی ہے لیکن ہم جیسے عارضی مہمانوں کو پیش نہیں کی جاتی۔ شراب کے شبہے میں شربت سے محروم رہے۔ ٹور گائیڈ کا نام مراد تھا۔ جب یہ انگریزی میں لکھا جاتا تو آخر میں ڈی کے بجائے ٹی ہوتا یعنی مرات...... خیر یہ اُن کا اپنا معاملہ تھا۔ وہ پورے سفر کے دوران مراد ہی پکارے گئے۔ ان کی تقریر میں ترکی کی تعریف' ترک قوم کی ذہانت اور ہمارے لیے اہم بات یہ تھی کہ خبردار جو کسی نے نل سے پانی پیا۔ منہ میں کلی بھری' ہمیشہ منرل واٹر استعمال کریں۔ ترکی میں ماشاء اللہ 15 دریا ہیں جن میں دجلہ اور فرات بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں تاریخی دریا عراق جاتے ہیں اور ہم نے ان کا پانی عرصے تک پیا' کچھ نہ ہوا۔ ترکی میں میٹھے پانی کی جھیلیں بھی کم نہیں' پھر چار سمندر ہیں اوپر سے برف اور بارش خود مقامی لوگ غٹاغٹ نلوں سے پانی پیتے ہیں۔ مراد کا خیال ہوگا ہم لوگ بہت زیادہ پانی پی گئے تو کہیں کم نہ ہوجائے' بہرحال کروڑوں لیرا حاصل کیے تھے وہ خرچ کرنے تھے۔ ایک پانی کی بوتل ڈھائی لاکھ لیرا کی آتی ہے۔ ایک سیاح نے دو بوتلیں خرچ کیں تو پانچ لاکھ تو خرچ ہوئے۔

اس میٹنگ میں برطانیہ' امریکہ' آسٹریلیا اور کینیڈا سے 26 سیاح شامل تھے۔ عورتیں' مرد' بوڑھے' جوان سب نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ ہمیں کئی سیاح پسند آئے۔ ان سے گفتگو رہی۔

ٹس لک کے نچلے حصے میں ایک ریسٹورنٹ تھا۔ باہر بارش اندھیرا' انجان علاقہ' اونچی نیچی سڑک' ہم نے فیصلہ کیا رات کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ ریسٹورنٹ صاف ستھرا' بیرے مؤدب اور اہم بات یہ کہ انگریزی سمجھتے تھے۔ ہمارے کئی ساتھی اسی جگہ آگئے۔ ہم نے ایک میز کے گرد کرسی پر بیٹھ کر بیرے سے پوچھا۔

''کھانے میں مچھلی ہے۔''

''نہیں سر......''

''پھر کیا ہے......''

''شیش کباب مل جائیں گے۔''

'' ہم خوش ہوگئے۔'' ایک بار اُردن میں کھائے تھے۔

''ایک پلیٹ میں کتنے کباب ہوں گے۔'' ہم نے پوچھا۔

''چھ عدد۔'' اس نے بتایا۔

ہم نے کہا' لے آؤ' بیرا فوراً منرل واٹر کی بوتل لے آیا۔ میز پر ڈبل روٹی کے ٹکڑے رکھے تھے ہم خوش ہو رہے تھے وطن سے اتنی دور کباب کھانے کو ملیں گے۔ بیرے نے اتنی دیر کی کہ ہم میز پر رکھی ساری ڈبل روٹی کھا گئے۔ بیرا پلیٹ میں ایک سیخ رکھ کر لایا۔ اس میں ٹماٹر ہری مرچیں اور گوشت کی پانچ چھ بوٹیاں تھیں۔ ہم نے بیرے کی مستعدی کی داد دی یہ اب باقی گرم گرم لائے گا۔ دو بوٹیاں کھا کر ہم نے پوچھا۔

''باقی کباب کب لاؤ گے۔''

وہ مودب ہو کر بولا۔

''یہیں ہیں۔''

''مطلب......'' ہم حیران ہوئے۔

''اس میں چھ شیش کباب ہیں۔''

''ہم جو بوٹیاں دیکھ رہے تھے۔ وہ چار باقی تھیں دو کھا چکے تھے۔ یہ کل کباب تھے۔'' ایک جھٹکا لگا۔

''یہ تو ناکافی ہیں۔'' اب کیا ہوگا ہم نے کہا۔

''کچھ لادو۔''

وہ آیا تو ہم نے زندگی میں پہلی بار سیخ میں پروئے اور جلے بھنے ٹماٹر اور ہری مرچ کھائیں۔ ڈبل روٹی پر زور رہا۔

شیش کباب 33 لاکھ' پانی 4 لاکھ 50 ہزار' چائے 8 ہزار 50 ہزار' میں ان قیمتوں پر اس لیے تعجب نہیں ہوا کہ ہوائی اڈے پر کروڑوں لیرا اس مقصد کے لیے ملے تھے اور آنے والے دنوں میں جب بھی کھانا نوش کریں گے لاکھوں سے کم کیا ہوگا۔ اور زبان شاید اشاروں کی' اس لیے بہت پہلے ہمارے بزرگوں نے کہا تھا زبان یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم۔

☆.....☆.....☆

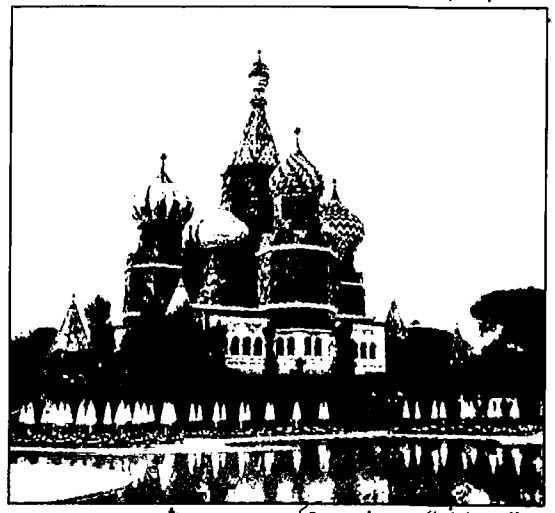

''چائے کافی۔'' بیرے نے پوچھا۔ ترکی میں چائے کو چائے کہتے ہیں۔

''اچھی سی چائے پلاؤ۔''

چائے آگئی اچھی تھی اس کے بعد بل آیا۔

خاتون آگئیں۔

''کیا میں آپ کے برابر بیٹھ سکتی ہوں۔'' وہ بولیں۔

''جی ضرور..... خوشی سے.....''

انہوں نے اپنا بیگ اوپر ریک میں رکھا اور بیٹھ گئیں' پھر مسکرائیں۔

''میرا نام کلے ہے میں آسٹریلیا کی رہنے والی ہوں۔'' انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''ہم عباسی ہیں..... پاکستان سے آئے ہیں۔''

''آپ کے نام کے آگے امریکہ لکھا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''عارضی گھر نیویارک میں ہے۔''

انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک پیکٹ نکالا۔ اُسے کھولا ایک چاکلیٹ ہماری طرف بڑھایا۔

''لیجیے۔'' انہوں نے دوستی آگے بڑھائی۔

''شکریہ.....'' ہم نے دوستی قبول کرلی۔

''یہ آسٹریلیا کی ہے وہاں بہت پسند کی جاتی ہے۔''

''معاف کیجیے گا ہم پاکستان سے کوئی چیز نہیں لائے ورنہ.....''

''کوئی بات نہیں اگلی بار لیتے آیئے گا۔''

''آپ نیویارک میں کیا کرتے ہیں؟''

''لکھنا لکھانا..... سیر و سیاحت۔'' ہم نے بتایا۔

''میں پڑھتی ہوں اور بلک ملک جانے کا شوق ہے۔ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتی ہوں۔'' مراد کوچ میں داخل ہوا اور ایک نعرہ لگایا۔

''گونائیڈن'' ترکی میں صبح بخیر کے لیے یہی لفظ کہا جاتا ہے۔ ویسے بعض لوگ مرحبا بھی کہتے ہیں۔ شاید وہ جو ابھی موڈرن ترکی کے عادی نہیں ہوئے۔

مراد نے سیاحوں کی گنتی اور ہدایات جاری کرنے لگا۔

''آنے والے دونوں کے لیے یہ آپ کا گھر ہے۔ اسے صاف ستھرا رکھیے۔ میرے ساتھ ڈرائیور کا نام باکی ہے۔ ترکی میں آج سے رمضان شروع ہوگیا ہے۔ اور باکی روزے سے ہے آپ پسند نہیں کریں گے کہ یہ بغیر کھائے پیے کوچ صاف کرے۔''

ساڑھے سات بجے کوچ روانہ ہوگئی۔

مراد کہہ رہا تھا۔

''ایک خاص بات یہ کہ کوچ میں ناخن کاٹنا بدشگونی ہے۔ ہمارے ملک میں یہ نحوست کی نشانی ہے۔ ہم لوگ گھر میں بھی ناخن کمروں یا چھت کے نیچے نہیں کاٹتے۔ کھلے آسمان کے نیچے کاٹنا چاہیے ہم مسلمان ہیں لیکن بعض چیزوں میں وہم کرتے ہیں' کوچ میں ناخن کاٹے اور حادثہ ہوگیا تو۔''

ہم نے دیکھا تو خواتین زیادہ سہم گئی تھیں۔ یہاں تک کہ ہمارے ساتھ بیٹھی کلے بھی خوفزدہ لگتی تھی۔ مراد نے ابتدا ہی ڈرانے سے کی تھی۔ حالانکہ اس کو صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ ناخن اگر کوچ میں کاٹے گئے تو اس کے فرش پر چپک جائیں گے اور صاف کرنے میں پریشانی ہوگی۔

کوچ استنبول کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ یہ شہر پہاڑی علاقے پر آباد ہے راستے اونچے نیچے ہیں۔ زندگی رواں دواں تھی۔ دکانیں کھلی تھیں۔ لوگ روزمرہ کے کاموں کے لیے گھروں سے نکل آئے تھے۔

استنبول ایک پرانا شہر ہے 3500 قبل مسیح میں آباد ہوا۔ یہاں یونانی آئے۔ رومن کا قبضہ رہا' پھر یہ دولت عثمانیہ کے جھنڈے تلے رہا۔ اس کا نام قسطنطنیہ تھا۔ رسالت مآب ﷺ کی حدیث ہے۔ ''تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کرلو گے اور فوج بھی خوب ہے۔ اس کا امیر بھی خوب ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا۔

''میری امت کی پہلی فوج قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اُس کو بخش دیا ہے۔''

حضرت عثمان غنیؓ حضرت علیؓ کے زمانے میں فوج نے قسطنطنیہ کا محاصرہ 34ھ میں کیا حضرت عمر بن عبدالعزیز اور خلیفہ ہشام نے 121ھ میں فوجیں بھیجیں۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں حملہ کیا۔ اسی زمانے میں دوبارہ 168ھ میں قسطنطنیہ کے لیے فوج نے محاصرہ کیا۔ عثمانی خلیفہ بایزید نے دوبارہ حملہ کیا۔ سلطان مراد ثانی نے حملہ کیا اور قسطنطنیہ کے شہنشاہ کی اطاعت اور اظہار ندامت سے واپس آ گیا اور آخرکار دولت عثمانیہ کے ساتویں خلیفہ سلطان محمد ثانی نے 1453 میں قسطنطنیہ فتح کرلیا۔ 29 مئی کو یہ کارنامہ انجام پایا اور اسی دن سے اس شہر نے استنبول کا نام پایا اور دولت عثمانیہ کا دارالحکومت کا تاج اس وقت تک پہنے رہا جب تک ترکوں کے باپ انورکمال پاشا نے اس کے سر سے تاج اتار کر انقرہ میں جمہوریت کا جھنڈا لہرادیا۔

استنبول کے دو حصے ہیں ایک یورپ اور دوسرا ایشیا میں' ان دونوں کو ایک طویل پل ملاتا ہے۔ درمیان میں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ ترکی کا باقی حصہ ایشیا میں ہے۔ استنبول کی آبادی ایک کروڑ 30 لاکھ ہے...... اور یہ بڑھتی جاتی ہے۔ دیہاتوں کے لوگ روزگار اور کاروبار کے لیے یہاں منتقل ہورہے ہیں نئی سڑکیں...... بستیاں بسائی جارہی ہیں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھ پر لوگوں کا میلہ دکھائی دیتا ہے۔

جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں گھاس سوکھی ہے...... کوچ کے دائیں بائیں قبرستان آجاتے ہیں۔ ہر طرف مسجد کے مینار سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ مسجدوں کا شہر ہے۔ یہاں مسلمان رہتے ہیں۔ ان مسجدوں سے پانچوں وقت باآواز بلند اللہ کی بڑائی اور کبریائی کا اعلان ہوتا ہے۔ جو سچ ہے حق ہے 99 فیصد لوگ مسلمان ہیں۔ لیکن حکومت لامذہب ہے۔

آسمان پر بادل تھے ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ استنبول بھیگنے لگا۔ مراد ترکی کی تاریخ کے صفحے الٹنے لگا۔ ترکوں کی عظمت کی داستان سنانے لگا۔ اپنا رشتہ منگولوں سے جوڑنے لگا۔

ہماری منزل چناکلی تھی۔ جنگ عظیم اول کا وہ میدان جہاں 50 ہزار صحت مند کڑیل جوان مار دیے گئے تھے اس لیے کہ ترکی پر اتحادی ناجائز قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ روس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھری تھی۔

کوچ شہر سے باہر نکل آئی۔

ہم نیشنل ہائی وے پر جارہے تھے۔ دونوں طرف بے شمار اپارٹمنٹ نظر آنے لگے یہ تعمیر ہورہے تھے یا تکمیل کے آخری مراحل میں تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو بالکل تیار تھے۔

مراد نے بتایا ''ترکی میں سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار اپارٹمنٹ میں سرمایہ کاری کا ہے۔ بینک اور دوسرے ادارے اس میں رقم لگاتے ہیں جب تک اپارٹمنٹ میں بجلی اور پانی کا کنکشن نہیں لیا جائے۔ حکومت کا ٹیکس واجب نہیں ہوتا۔ اس

خوشخبری

سچی کہانیاں بہت جلد اپنے صفحات پر ان لکھاریوں کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کررہا ہے جو طویل عرصے سے سچی کہانیاں سے جڑے ہوئے ہیں۔ قارئین ان لکھاریوں کی پسند ناپسند' ان کے زندگی کے بارے میں تجربے اور تجزیے اور انہوں نے لکھنا کب اور کیسے شروع کیا جاننا چاہتے ہیں۔

لہٰذا سوچیے مت اور اپنی ایک شاندار سی تصویر کے ساتھ فوراً ہمیں بھیج دیجیے اپنا تازہ ترین انٹرویو......

نوٹ: یہ انٹرویوز نمبروار شائع کیے جائیں گے۔

یعنی پہلے آئیے پہلے پائیے کی

بنیاد پر تاکہ کسی کو بھی شکوہ نہ ہو

لیے فروخت کے بعد ضروریات زندگی مہیا کی جاتی ہیں۔ یہ اپارٹمنٹ بہت مہنگے ہیں اور زیادہ تر امریکی ڈالر میں فروخت ہوتے ہیں ترکی میں افراط زر کی شرح 75 فیصد تھی۔ مراد کا کہنا تھا اس میں ہر روز اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارے جانے سے اس میں تیزی آئی ہوگی۔ امریکی ڈالر جو مارکیٹ میں خرچ کیا۔ ترکی کا بیشتر سرمایہ اس قسم کے اول فول کاموں میں لگا ہوا ہے۔

ہم گیلی پولیس کے علاقے میں پہنچے۔ سمندر کے کنارے یہ ایک خوبصورت شہر ہے۔ بڑا چوراہا' سامنے ٹھاٹھیں مارتا سمندر' دوپہر کے کھانے کے لیے کیفے ٹیریا بلیدیہ ریسٹورنٹ' مراد نے بتایا سامنے پوسٹ آفس ہے۔ جہاں سے فون کارڈ لیا جاسکتا ہے۔ ہم نے یہ سنا تو اس طرف لپک لئے۔

میدان پار کر کے پہنچے تو وہاں ایک گول کمرہ تھا۔ اس میں خاتون بیٹھی تھیں۔ ہم نے انگریزی اور کچھ اشاروں سے بات سمجھائی۔ موصوفہ نے مسکرا کر فون کی طرف اشارہ کیا ہم نے جیب سے ایک کاغذ نکلا اور فون میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اب وہ سمجھیں اور کارڈ تھمایا۔ ہم نے لاکھ پوچھا۔

''اس سے امریکہ بات کر سکتے ہیں۔'' یہ وہ نہیں سمجھیں۔ ہم نے کئی نوٹ ان کے سامنے کیے۔ خاتون نے پسند کے اٹھالے۔ برابر میں فون لگے تھے۔ ایک سے نیویارک ملایا وہ فوراً مل گیا۔ امریکہ کے حالات معلوم کیے۔ اطمینان ہوا اور ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں مچھلی تھی ہم نے سمندر کی آواز سنی جو ہوٹل کی پشت سے ٹکرا رہا تھا اور مچھلی کھانے کی خواہش کی جب وہ پک کر آئی دکھ ہوا خواہ مخواہ اسے آگ میں پکنے کی زحمت دی۔ وہ تو ہفتوں سے خود ہی اندر اندر پک گئی تھی۔ لیکن ہم نے سنا تھا۔

''زری خرم'' انسان اپنا زر کھاتا تھا۔ وہی کیا اس کا بل 20 لاکھ 50 ہزار لیرا تھا۔ اس کے بعد جس کسی ساتھی نے پوچھا۔ کیسی تھی؟ تو نظر میں رقم رہی اور صرف ایک ہی جملہ کہا۔

''اچھی...... بہت اچھی۔''

ہوٹل سے باہر نکلے تو اخروٹ کے برابر نارنگیاں بک رہی تھی۔ وہ بھی ایک گدھا گاڑی پر۔ اچھا لگا دو عدد خرید لیں۔ پھر ایک ٹھیلے پر چنے بک رہے تھے وہ بھی کئی لاکھ لیرا کے عوض مٹھی بھر لے لیے خیال آیا پوسٹ آفس سے ایک فون کارڈ اور خرید لیں۔ یہ سوچ کر میدان پار کیا تو دیکھا وہ گول کمرہ بند ہے اور خاتون کہیں نہیں ہیں۔ شاید اس دن کے کارڈ فروخت کرنے کا کوٹہ پورا ہوا۔ اب کوچ کی روانگی کا وقت ہوگیا۔ بارش اور خنک ہوا سے بچ کر کوچ میں آئے تو اچھا لگا۔

ہم اس علاقے کی طرف روانہ ہوئے جہاں 1915ء میں پہلی جنگ عظیم لڑی گئی تھی یہاں 9 ماہ میں 50 ہزار جوان سپاہی مار دیے گئے تھے۔ یہ بڑا طویل علاقہ ہے۔

یہ نیشنل پارک ہے۔ اس جگہ کوئی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ یہ پابندی نہ ہوتی تو بھی قبرستان میں کون مکانات بناتا۔ کوچ کے بائیں طرف ساتھ ساتھ سمندر تھا۔ ایک جگہ کوچ روک دی گئی۔ سامنے ایک بہت بڑا پتھر لگا تھا برابر میں گھاس کا میدان اس میں قبروں کے پتھر نظر آرہے تھے۔ جو ڈھلان کی طرف جارہے تھے۔ نیچے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہلکی بارش ہورہی تھی۔ سردی بھی تھی۔ مراد نے کہا۔

''آپ لوگ نیچے جاکر تصویر بنا سکتے ہیں۔''

سیاح تو اسی انتظار میں ہوتے ہیں۔ دروازہ

کھلا اور سب نیچے اتر گئے۔ ہم اکیلے کوچ میں کیا کرتے۔ مجبوراً بارش میں باہر نکلے۔ پھر ہمسائی بھی کیمرہ سنبھال کر چلی گئی تھی۔

''یہاں ہندوستانیوں کی قبریں بھی ہیں۔'' مراد نے بتایا

سامنے جو بہت بڑا پتھر دیوار میں لگا تھا اس پر اتاترک کی تحریر تھی۔

''جن بہادروں نے یہاں خون بہایا۔ اپنی زندگیاں کھودیں۔ تم اب ایک دوست ملک کی مٹی میں سوتے ہو۔ اس لیے سکون سے آرام کرو۔ ہمارے نزدیک جونیز اور محمڈن میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں شانہ بہ شانہ لڑ کر مرے ہیں اور دنیا بھر کی ماؤں جنہوں نے اپنے بیٹے دور دراز سے ہمارے ملک بھیجے وہ اپنے آنسو سکھالیں۔ تمہارے بیٹے پھولوں کی طرح ہماری سرزمین میں سکون سے ہیں اور ہماری سرزمین پر جانے دینے کے بعد وہ ہمارے بیٹے بھی بن گئے ہیں۔''

اتاترک 1934۔

ہر سیاح نے اس جذباتی پتھر کی تصویر بنائی۔ جنگ عظیم میں مسلمان سیاحوں کو محمڈن اور دوسروں کو جونیز کہا جاتا تھا۔ قبرستان بڑا تھا اور تلاش کے باوجود بھی ہمیں کسی ہندوستانی کی قبر نظر نہیں آئی۔ ہر ایک پر صلیب کا نشان بنا تھا۔ اس کا مطلب ہم تو یہ سمجھے کہ ترکوں کے ہمدرد ہر ایک نے جنگ لڑی یا اس لامذہب حکومت نے سب کو عیسائی بنادیا۔ مراد نے بتایا یہ خیر سگالی جذبات کے اظہار کے لیے صلیب کا نشان بنایا ہے۔ ماشاء اللہ کیا خیر سگالی ہے۔

جب مراد نے محسوس کیا کہ سیاح اتاترک کے الفاظ اور قبروں سے متاثر ہوچکے ہیں اور سردی کا مناسب مقابلہ کر چکے ہیں تو کوچ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسری طرف روانہ ہوئے۔ یہ بھی قبرستان تھا اور مختلف ملکوں کے سپاہیوں کو اپنی خندق سے نکال کر بچایا تھا۔ اس موقع پر دشمن نے گولہ باری بند کردی تھی برٹش سپاہی زندہ رہا یا مرگیا یہ تو نہیں بتایا گیا لیکن اس کی یاد میں ایک مجسمہ بنایا اور اُس جگہ لگادیا۔ جہاں ترک سپاہی برطانوی سپاہی کی مدد کر رہا ہے چند لمحوں کے لیے کوچ رکی اور لوگ اُسے دیکھنے اتر گئے۔ جس پگڈنڈی پر کوچ رواں تھی وہ کچی تھی اور بارش کی وجہ سے کیچڑ ہورہی تھی اس لیے ہم نے کوچ کی کھڑکی سے دیکھنا مناسب سمجھا۔ ڈرائیور ہاکی کوچ موڑنے کے لیے آگے لے گیا اور دور نکل گیا۔ پھر ایک مناسب جگہ سے دوڑا کر لایا جب تک یادگار دیکھنے والے شوقین خاصہ بھیگ چکے تھے۔ لیکن لوگ گھر سے یہی کچھ دیکھنے اور لطف اٹھانے آتے ہیں۔ کوچ روانہ ہوئی تو برطانوی سپاہیوں کی یادگاریں آئیں۔ مراد نے کوچ روک دی۔ وہ برطانوی سیاح تڑپ کر کوچ سے اترے اور تصویریں بنانے لگے۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے سیاح بھی اپنی یادگاریں دیکھنے گئے۔ اس جگہ سب سے زیادہ آسٹریلیا کے سپاہی مارے گئے۔ ہر سال آسٹریلیا کا وزیراعظم سپاہیوں کی یادگاروں پر پھول چڑھانے آتا ہے۔ ہم وہ سیاح تھے جیسے کسی یادگار پر نہیں جانا تھا پہلی جنگ عظیم کے وقت پاکستان موجود میں نہیں آیا تھا اور اگر وہاں ہندوستان کا کوئی سپاہی سوتا ہے تو آرام کرنے دیں۔ اللہ ان پر اپنی رحمت نازل کرے۔

پہلی جنگ عظیم میں مرنے والے سپاہیوں کی قبریں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں اور بارش آہستہ آہستہ گر رہی تھی جیسے ان جوان بہادروں کے لیے

آنسو بہا رہی ہو جو اپنے گھروں سے پیاروں سے دور اس لیے مر گئے کہ دوسرے زندہ رہیں۔

ہماری ہمسائی کلے کا تعلق آسٹریلیا سے تھا وہ اپنے ملک کے مرنے والے ہزاروں سپاہیوں میں سے کچھ کی قبریں دیکھ کر آئی تھی۔ جنگ عظیم کے سپاہیوں سے تو نہیں لیکن ہمسائی سے ضرور تعلق تھا۔ اس لیے ہم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آئی ایم سوری۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکرادی۔

اور باہر بارش زور زور سے برسنے لگی۔

☆.....☆.....☆

ارس کی رات

استنبول کا ایک حصہ یورپ میں ہے اور باقی ترکی کے شہر ایشیاء میں درمیان میں سمندر ہے۔ انسان قبرستان سے زندہ بستیوں میں آتا ہے۔ تو زندگی کی گرمی اسے سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ ہماری منزل چناکلی تھی۔ یہاں ایشیاء میں ہے اور وہاں جانے کے لیے سمندر مرمرہ پار کرنا تھا۔ ایک بڑی فیری میں کوچ کھڑی ہوگئی۔ آس پاس کاریں اور گاڑیاں تھیں۔ فیری کی دو منزلیں اور تھیں کچھ سیاح اوپر گئے پھر بارش اور ہوا سے گھبرا کر کوچ میں واپس آگئے۔ ذرا دیر میں ساحل پیچھے ہٹنے لگا۔ فیری آگے بڑھنے لگی۔ 25 منٹ کے سفر کے بعد فیری رک گئی اور کوچ سڑک پر آگئی۔ یہ چناکلی ہے۔ سامنے ایک توپ لگی ہے۔ جس نے دشمن کو جنگ عظیم اول میں 18 مارچ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ ایک میدان میں کمال اتاترک کا مجسمہ لگا ہے..... اس شہر میں ایک یونیورسٹی ہے جس کا نام 18 مارچ ہے جو ترکی کے لوگوں کو اس دن کی یاد دلاتی رہے گی جب انہوں نے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اس شہر کی سڑک سرخ پتلی اور ٹائیل کی بنی تھی۔ بارش کے باوجود فٹ پاتھ صاف ستھرے تھے۔

ایک طرف سے اذان سنائی دی اور پھر مسجدوں کے نہ ختم ہونے والے مینار نظر آئے۔ جگہ جگہ ہوٹل تھے۔ بازار کھلے تھے لوگ کاموں میں مصروف تھے۔ مراد نے بتایا اس علاقے میں انگور پیدا کیا جاتا ہے۔ شہر سے نکلے تو چھوٹی چھوٹی بستیاں شروع ہوگئیں پھر رہائشی علاقہ شروع ہوا اور ایک عمارت ہوٹل ارس' مراد نے سب کو چابیاں تقسیم کیں۔ ہمیں کمرہ نچلی منزل پر ملا اس میں ایک گیلری تھی۔ جس کا رنگ اور کرسیاں سفید تھیں۔ سامنے کھاس کا میدان اور پودے لگے تھے۔ ہلکی بارش اور سردی تھی۔ یہ گیلری گرمیوں میں لطف دیتی ہوگی۔ سامان رکھ کر ہم دوبارہ استقبالیہ پر آگئے۔ یہاں بے حد موٹی اور خونخوار بلیاں دکھائی دیں۔ جن سے ہماری ساتھی سیاح بھی ڈر رہی تھیں۔ کاؤنٹر کے سامنے لاؤنج میں صوفے پڑے تھے۔ دیوار پر نقش ونگار ابھرے ہوئے تھے۔ ہر سیاح اسے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ ایک طرف ٹیلی ویژن پر پروگرام نظر آرہے تھے جسے صرف مراد سمجھ رہا تھا۔ ایک طرف میزیں اور کرسیاں رکھی تھیں بعض لوگ یہاں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ ہم کاؤنٹر پر گئے۔

''یہاں کارڈ والا فون ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

استقبالیہ پر سیاہ آنکھوں اور بھورے بالوں والی لڑکی مسکرانے لگی۔ ہم نے اشاروں سے پوچھا۔ اس نے مراد کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے سمجھنے سے انکار کردیا۔ وہ حیران آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگیں۔ پھر کچھ بولی اور ہاتھ سے بھی کچھ بتانے کی کوشش کی۔ ان کی بے چارگی

ہمارے سوال کا جواب نہ دینے کی کوفت اور ہمارے نہ سمجھنے کی پریشانی میں وہ اچھی لگنے لگیں۔ ہم شاید ہمیشہ وہیں کھڑے رہتے کہ ظالم سماج مراد کی شکل میں آگیا اور بولا۔

''ہوٹل سے نکل کر سیدھے ہاتھ کی طرف ایک مسجد ہے اس میں فون ہے..... وہاں سے بات ہوسکتی ہے۔''

ترک پاک تعلقات بنتے بنتے رہ گئے اور ہم موٹی موٹی بلیوں سے بچتے اپنے کمرے کی طرف آئے اور فون کارڈ لے کر مسجد کی تلاش میں نکل چلے ہوٹل سے باہر آکر احساس ہوا۔ سردی زیادہ ہے۔ ایک بار باہر نکل آئے تو ارادہ کرلیا علاقہ دیکھ ہی لیں۔ چند عمارتوں بعد سیدھے ہاتھ کو مڑے تو مسجد کے مینار صاف نظر آنے لگے۔ اسی کی راہ نمائی میں بڑھتے رہے۔ دو گلیوں کے بعد سڑک آگئی اور پھر دائیں طرف مسجد' ایک صاحب فٹ پاتھ دھو رہے تھے۔ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ نمازی مسجد میں آرہے تھے خوشی کی یہ ہے کہ ترکی میں ہزاروں مسجدیں ہیں اور وہ سب کی سب آباد' نمازیوں سے بھری ہیں۔

مسجد کے دروازے کے پاس دو فون لگے تھے۔ ایک خراب تھا۔ دوسرے سے مراد برآئی واپسی میں ایک سڑک غلط مڑ گئے۔ اس لیے ذرا سا بھٹکے' لیکن ہوٹل مل ہی گیا۔ استقبالیہ پر آئے تو احساس ہوا باہر سردی تھی۔ اور اکثر لوگ اس موسم میں اتنی دیر پیدل سفر نہیں کرتے۔

ڈنر کا وقت ساڑھے سات بجے تھا۔ ہم نے مراد سے کہہ دیا تھا کہ ہم سویا اس کی چربی میں پکا کوئی کھانا نوش نہیں کرتے۔ نہ شراب سے شوق کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے کھانے کا بندوبست الگ کیا جائے۔ مراد نے اطلاع دی کہ ترکی میں سور نہ کاٹا جاتا ہے نہ کھایا جاتا ہے۔ ہاں شراب خوب پی جاتی ہے۔ اس کے لیے احتیاط کریں گے۔ لیکن آپ کو مفت میں نہیں دیں گے۔ ادائیگی کرنی ہوگی۔ اس لیے پہلے پوچھ لیں گے۔

مراد کا دعویٰ تھا کہ ترکی زراعت میں خود کفیل ہے۔ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ ترکی میں کھیرا' زیتون' دہی اور ڈبل روٹی کثرت سے ہوتی ہے۔ اپنے قیام کے دوران زیادہ طعام اس کا رہا۔

رات کا کھانا سلاد سے شروع ہوا۔ بڑی سی پلیٹ میں ہر قسم کی کھاس اور پات زیتون کا تیل چھڑک کر سامنے لا رکھا۔ اس کے بعد مسور کی دال گھٹی ہوئی شوربے کی صورت میں..... اس میں نمک اور کالی مرچ ڈال کر پیا تو اچھا لگا۔ دو بڑے پیالے اور ڈبل روٹی اسی کے سہارے معدے میں اتاری۔ اس کے بعد ایک بڑی ڈش میں کسی چیز کا ملغوبہ آیا اس میں پنیر سے ٹٹول کر دس بارہ بوٹیاں مل گئیں وہ کھائیں۔ پھیکے کھانا ختم ہوا اور اب سوئٹ ڈش کی باری آئی دو پیرے ایک ٹرالی گھسیٹتے آئے اور ہر ایک سے اس کی پسند پوچھنے لگے۔ اس میں تازہ پھل کسٹرڈ اور ایک جاتی سی کوئی چیز تھی۔ ہم نے پھل کی فرمائش کی۔ ہمارے پاس مصر کا صالح شیخ بیٹھا تھا۔ یہ کینیڈا کی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ ترکی کی سیاحت کے لیے آیا تھا۔ یہاں سے مصر جائے گا۔ پھر واپسی ہوگی۔ اس نے سوئٹ ڈش میں جاتی والی چیز پسند کی اور ہمیں بتایا آج پہلی رمضان ہے۔ وہ اس قسم کی چیز لے رہا ہے صالح شیخ کے خیال میں روزہ نہ سہی کم از کم رات کے کھانے کے بعد ایسی چیز ضرور کھائی جائے جس سے جسم و جاں کو معلوم ہو رمضان ہے۔ اس کے برابر آسٹریلیا کی نے میٹھی

تھیں۔ صالح شیخ اسے رمضان کا احترام سمجھانے لگا اور وہ سوئٹ ڈش کھاتے وقت سر ہلاتی رہی۔

آسٹریلیا سے دو خواتین ڈرامہ میں زیادہ اور دنیا دیکھ بھال کر آئی تھیں۔ یہ ڈی اور لی تھیں۔ ایک خاتون اپنی صاحبزادی کو لائی تھیں یہ بھی آسٹریلیا سے تھیں۔ لڑکی کا نام الی شا تھا۔ یہ شتر بے مہار تھی۔ پہلے ہی دن سب سے ہائے ہیلو کر لی۔ ہمیں ایک نظر نہ بھائی۔ اس کی ماں کہتا تھا یہ 18 سال کی ہے۔ لیکن حرکتوں سے 13 سال سے زیادہ دکھائی نہ دیتی تھی۔

ارس ہوٹل کا عظیم الشان ڈنر ختم ہوا تو کلے نے کہا۔

''آیئے آپ کو کافی پلاتے ہیں۔'' ہمیں کیا اعتراض ہوتا۔ ہال سے نکلتے ہوئے صالح شیخ بھی ساتھ ہولیا۔ لاؤنج میں ہم تینوں آ بیٹھے۔ شیشے کی کھڑکیوں سے درختوں کے بتوں پر پھوار پڑتی نظر آ رہی تھی۔

ایک صاحبزادی نے میز پر کافی رکھی تو کلے نے کہا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ پورا سفر عباسی کے ساتھ بیٹھ کر کروں گی۔''

''وہ کیوں.....'' صالح شیخ نے پوچھا۔

''ایک تو سفر کے دوران یہ گفتگو نہیں کرتے..... اور دوسرے اونگھ کر اپنا سر میرے کاندھے پر نہیں رکھتے۔''

تینوں ہنسنے لگے۔

''اگر ایسا ہے تو میں بھی یہ سب کرنے کو تیار ہوں۔'' صالح شیخ نے ہنس کر کہا۔

''ہم سے بھی تو پوچھیں' اس کا سبب کیا ہے..... باتیں نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم باہر کے منظر زیادہ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''اور سر کاندھے پر نہ رکھنے کی وجہ.....'' شیخ نے پوچھا۔

''اتنے اچھے کاندھے پر اونگتا ہوا سر رکھنا' کاندھے والے کی توہین ہے۔''

''اگر دل میں ایسا خیال ہے تو ابھی میرے پاس شیخ کا آفر موجود ہے۔'' کلے نے ہنس کر کہا کافی لذیذ تھی۔ اور گفتگو میں دیر ہوگئی۔ اچانک کلے نے گھڑی دیکھی۔

''اوہ مائی گاڈ ساڑھے گیارہ بج گئے' صبح جلدی اٹھنا' ناشتہ اور پھر روانگی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی محفل ختم ہوئی۔

☆.....☆.....☆

ہیلن کے بغیر ٹرائے

ترکی میں کسوداسی ایک تاریخی مقام ہے۔ یہاں دنیا کا ایک قدیم اور مشہور شہر ہے جو ہیلن کی وجہ سے مشہور ہوا۔ آج اسی کے دیدار کو جانا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی۔ سرد ہوا بھی تھی۔ صبح ساڑھے سات بجے ارس ہوٹل کو خدا حافظ کہا اور چل نکلے سڑک کے دونوں طرف درخت' کھیت اور پہاڑ ان پر زیتون کے درخت.....

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ٹرائے آ گیا۔ یہ بھی شہر تھا اب کچھ نہیں' سامنے ایک بڑا لکڑی کا گھوڑا بنا ہے۔ لوگ اس کے سامنے اور اوپر چڑھ کر تصویریں بناتے ہیں۔ ایک طرف دو دکانیں ہیں۔ دوسری طرف باتھ روم ہیں۔ بظاہر تو کوئی دیکھنے کی چیز نہیں تھی۔ ہم اطمینان سے بیٹھے تھے۔ کوچ رکی تو سمجھ گئے کہ تصویریں اتارنے کی رسم ہوگی اور آگے چل نکلیں گے۔ لوگ اپنی کوٹ پہنے' کیمرے سنبھالنے لگے اور ایک ایک کر کے نیچے اتر گئے۔

(جاری ہے)

سرد خانہ

مردہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک کریہہ الگا پکڑ لیا
رگوں میں خون جما دینے والی ایک تحریر.....

محمد شاہد

نعیم صاحب ہمارے گھر کے برابر میں رہتے تھے پہلے وہ ایک سرکاری اسپتال میں جاب کیا کرتے تھے ان کے ساتھ ایک ایسا بھیانک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے انہیں یہ جاب چھوڑنی

پڑی وہ وجہ کیا تھی کہ انہیں یہ اچھی بھلی جاب چھوڑنی پڑی انہی کی زبانی سنیے۔

میں گھوکی کا رہنے والا ہوں میری فیملی میں' میں میری بیوی اور دو بچے شامل ہیں۔

والدہ میرے بچپن میں فوت ہوگئی تھیں جبکہ والد صاحب ابھی کچھ عرصے پہلے ہی مجھے تنہا چھوڑ گئے کلثوم میری خالہ زاد (کزن) تھی ہماری منگنی بچپن میں کردی گئی تھی والد کے انتقال کے بعد میں بالکل اکیلا ہوگیا تھا میری تنہائی کا احساس کرتے ہوئے میری خالہ نے سادگی سے میرا نکاح کلثوم سے کروادیا۔

کلثوم کے گھر آجانے سے میری زندگی میں جیسے بہار آگئی تھی۔ کلثوم نے میرے شب و روز گلزار بنا دیے تھے۔ میں بے حد خوش تھا میری ساری عنایتیں کلثوم کے لیے تھیں خود وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتی تھی کچھ عرصے بعد میرے گھر میں ننھے فرشتوں کی آمد نے میرے گھر کو جنت کا نمونہ بنادیا تھا غرض کہ میری زندگی بڑی خوشگوار گزر رہی تھی۔ ہمارے علاقے میں موجود وہ سرکاری اسپتال جس میں' میں جاب کیا کرتا تھا میرے گھر سے اس کا دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔

یہ فاصلہ میں پیدل ہی طے کیا کرتا تھا میں اسپتال میں بطور وارڈ بوائے کام کرتا تھا اکثر اوقات میری ڈیوٹی بدل جایا کرتی تھی اور مجھے سرد خانے کے باہر پہرہ بھی دینا پڑتا تھا جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارے علاقے میں یہ واحد سرکاری اسپتال تھا جہاں اسپتال کا عملہ ناکافی تھا۔

سرد خانے کے باہر پہرہ دینے والی بات کا ذکر میں نے اپنی بیوی سے نہیں کیا تھا کہ اسے میری اس جاب پر اعتراض نہ ہو جاتا اسی لیے دن اچھے اور پرامن گزر رہے تھے۔

میرے دوست نے بھی مجھے ایک گھڑی گفٹ کی تھی جو انتہائی قیمتی اور خوبصورت تھی اور مجھے بے حد عزیز بھی تھی میں اسے ہر وقت اپنے ہاتھ پر باندھے رکھتا تھا مجھے اس میں ٹائم دیکھنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔

ایک روز میری ڈیوٹی سرد خانے کے باہر پہرہ دینے کی لگی تھی۔ گھر میں نائٹ ڈیوٹی کا کہہ کر آتا تھا مگر رات دو بجے میری ڈیوٹی آف ہوجایا کرتی تھی۔

اس رات میں ڈیوٹی پر پہنچا ایک دو ضروری امور انجام دینے کے بعد میں سرد خانے میں آگیا ایک چکر تمام اسٹریچر کے گرد لگایا اور باہر آنے لگا تو مجھے اپنی گھڑی کا اسٹریپ کچھ ڈھیلا لگا میں نے گھڑی اتاری اور اپنی آستین کے کف اوپر کیے گھڑی اتار کر پاس پڑے ایک اسٹریچر پر رکھ دی اس اسٹریچر پر ایک غیر ملکی شخص کی لاش تھی جو ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا لاش تین دن پرانی تھی اب تک اس کے لواحقین نے رابطہ نہ کیا تھا اس لیے اس لاش کو سرد خانے میں رکھا گیا تھا۔

انسان کی زندگی میں کیسے کیسے حادثات رونما ہوتے ہیں اس غیر ملکی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کہیں وہ گمنام لاش کی صورت میں کسی انجان جگہ پر لاوارث لاش کی طرح پڑا ہوگا میں اس کے بارے میں سوچ جارہا تھا مجھے اس پر ترس آرہا تھا کہ نا جانے کس مقصد کے تحت وہ یہاں آیا ہوگا اور اس مقصد کو انجام دیے بنا اس دنیا سے رخصت ہوگیا اس اجنبی غیر ملکی کے بارے میں سوچتے سوچتے میں سرد خانے سے باہر آگیا انچارج کے پاس جاکر اسے اپنے گھر جانے کا بتا کر میں گھر آگیا۔

گھر آکر میں نے ہاتھ منہ دھویا اور کھانا کھانے کے لیے دسترخوان پر آگیا۔ کھانے کے دوران اچانک میری بیوی کی نظر میرے ہاتھوں پر پڑی وہ کہنے لگی۔

''آپ کے ہاتھ کی گھڑی کہاں گئی۔''

اس کے کہنے پر میں نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا تو واقعی گھڑی کلائی پر موجود نہ تھی تب مجھے یاد آیا کہ گھڑی تو میں نے اتار کر سرد خانے میں رکھے ہوئے اسٹریچر پر رکھ دی تھی اور جلدی میں اسے اٹھانا بھول گیا اور گھر آگیا۔ مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر میری بیوی کلثوم بولی۔

''کیا بات ہے آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔'' اس کے ٹوکنے پر میں چونکا اور بولا۔

''ارے کچھ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' کلثوم بولی۔

''پھر آپ پریشان کیوں ہیں کیا بات ہے مجھے نہیں بتائیں گے۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے اصل میں میری گھڑی اسپتال میں رہ گئی ہے میں سوچ رہا تھا کہ صبح جلدی جاکر لے آؤں گا۔'' کلثوم بولی۔

''صبح کیوں ابھی جاکر لے آئیں صبح تک تو اسے کوئی اور ہی لے جائے گا۔''

''ارے بھئی میں تھکا ہوا ہوں اس وقت میرا کہیں آنے جانے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ رہی گھڑی کی بات تو جس کے نصیب میں ہوگی اسے مل جائے گی۔''

مگر میری بیوی نے میری بالکل نہ سنی اور اس کے بے حد مجبور کرنے پر نا چار مجھے گھڑی لینے کے لیے جانا پڑا۔ میں جب اسپتال پہنچا تو چوکیدار مجھے دیکھ کر بولا۔

''سب خیریت تو ہے نا تم اس وقت یہاں کیسے؟''

''ہاں سب خیریت ہے مجھے ایک چھوٹا سا کام تھا جس کی وجہ سے مجھے دوبارہ آنا پڑا۔'' میں نے چوکیدار کو اصل وجہ نہیں بتائی کہ وہ نا جانے کیا سوچتا اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سوال پوچھتا میں آگے بڑھ گیا۔

میں چلتا ہوا سرد خانے کے دروازے پر آیا اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا میں نے مطلوبہ اسٹریچر کی طرف دیکھا تو مجھے اپنی گھڑی اسی جگہ رکھی ہوئی ملی میں لپک کر اس طرف گیا اور جلدی سے اپنی گھڑی اٹھائی اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے مڑتے وقت میرا گھٹنا برابر میں رکھے ہوئے اسٹریچر سے ٹکرا گیا میں گرتے گرتے بچا اور جلدی سے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا۔

جیسے کوئی آہٹ سی ہوئی ہو میں نے مڑ کر دیکھا تو اسٹریچر پر پڑا ہوا مردہ اٹھ کر بیٹھ چکا تھا خوف سے میں اپنی جگہ سن سا ہو کر رہ گیا اسی لمحے اس مردے نے اسٹریچر پر سے چھلانگ لگائی اور میری طرف لپکا اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا اسی مردے نے میری گردن پکڑ لی اس کے مردہ ہاتھوں میں نا جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ میں باوجود زندہ ہونے کے اپنا بچاؤ کرنے میں ناکام رہا تھا بہت دیر تک وہ اور میں گتھم گتھا رہے اس کے بعد ایک تفصیلی نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے وہ مردہ دوبارہ اپنی جگہ یہ کہتے ہوئے چلا گیا۔

''تیری ہمت کیسے ہوئی مجھے بے آرام کرنے کی۔'' یہ وہ الفاظ تھے جو بے ہوش ہونے سے

پہلے میری سماعتوں سے ٹکرائے تھے۔ پھر اس کے بعد مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا۔

جب میں ہوش وحواس کی دنیا میں لوٹ کر آیا تو خود کو ایک بستر پر پایا مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈیوٹی پر موجود وارڈ بوائے میرے قریب آیا اور حال احوال دریافت کرنے لگا اتنے میں ایک اور ڈاکٹر جسے میں اچھی طرح سے جانتا تھا وہ آیا اور پوچھنے لگا۔

''تم سرد خانے میں اتنی رات گئے کیا کرنے گئے تھے تب میں نے انہیں اپنے سرد خانے میں جانے کی وجہ تفصیل سے بتا دی جسے سن کر وہ بہت حیران تھے میری بات سن کر کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کرنے کے بعد مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی میں اپنے ایک دوست کی مدد سے گھر پہنچا۔ وہاں میری بیوی نے الگ ایک طوفان کھڑا کر رکھا تھا جس کی تفصیل یہاں بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس واقعے کی وجہ سے میں اتنی پریشانیوں سے گزرا یا یوں کہنا چاہیے کہ اتنے خوفناک حالات سے گزر کر بھی صحیح وسالم میرے پاس موجود ہے۔ اس غیر ملکی شخص کی لاش کا کیا بنا مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا کیونکہ اس واقعے کے بعد سے میں نے وہ جاب ہی چھوڑ دی تھی۔

آج میں ایک کریانے کا اسٹور چلا رہا ہوں گزر بسر اچھی ہو رہی ہے لیکن اس رات سرد خانے میں گزرے وہ لمحات میں کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکا ہوں وہ رات جب بھی یاد آتی ہے خوف سے میرا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے کوئی یقین کرے نہ کرے یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔

☆☆......☆☆

اور حواز اری اُن سے روٹھ گئی

وہ ایک لڑکی
جس کی آنکھیں کوہِ نور سے مشابہہ تھیں
سرد لہجوں اور چٹان چہروں میں گھری
آخرِ شب! اُداسی کی بانہوں میں لپٹی
وہ پیپل کے پتوں میں چھپ چھپ کر
سسکتی ہوا کے نوحے سنتی
دن کے اجالوں میں
زمانے کی بے لباسی اور لہجوں کی برہنگی......
آنچل میں سیر کرتی......
وہ ہوا کی سکھی تھی
اور پیپل کی رازدان
اُجالے اُس سے روٹھ گئے
تو اُس نے دن کے چہرے پر تھوک دیا
اور رات کو گلے لگالیا
بستی والوں نے اُس کے پیروں میں میخیں گاڑ دیں
اور وجود پیپل کے تنے میں ٹھونک دیا
بس! کوہِ نوری آنکھیں سلامت رہیں
لیکن حواز ادی نے
پتھروں کی بستی میں بے نور رہنا منظور کیا
اور صحن میں لگے
کیکٹس اپنی آنکھوں میں سجا لیے

روشانے سبطین مہاروی۔ لاہور